ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ
سعید احمد اکبر آبادی

بُرہان

جلد ۶۶	ذی العقدہ ۱۳۹۰ھ مطابق جنوری ۱۹۷۱ء	شمارہ ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

النبار العظیم

—: ۱۵ :—

سب سے زیادہ دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس ملک میں تعلیم، تربیت اور اخلاق کا معیار روز بروز گرتا جا رہا ہے۔ اور یونیورسٹیاں جن کو تعمیرِ حیات، تہذیب اخلاق اور اعلیٰ تربیت کا کارخانہ ہونا چاہیئے تھا، وہ عملاً نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی تخریب اور ان کی تباہ کاری کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہیں۔ نئی نسل جو آزادی کے بعد کی پیداوار ہے، وہ درحقیقت اس کا اندازہ کر ہی نہیں سکتی، کہ ہم پرانی نسل کے لوگ جنہوں نے انگریز کے عہد کے نظامِ تعلیم کو دیکھا اور برتا ہے ان کے قلب و دماغ پر کیا گزرتی ہے، جب وہ آزادی کے بعد کی تعلیمی کیفیت اور حالت کا موازنہ آزادی سے پہلے کی حالت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا تو اس وقت میں سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی میں لکچرر اور دہلی یونیورسٹی میں عربی کا ریڈر تھا اور اسی حیثیت سے دہلی یونیورسٹی کی اکاڈمک کونسل کا ممبر بھی تھا۔ آزادی کے بعد جب ڈاکٹر سید اظہر علی پاکستان چلے گئے تو میں ان کی جگہ دہلی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ عربی و فارسی اور اردو ہو گیا اور کلکتہ جانے تک اسی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ملازمت کے اس تعلق سے پہلے میں سینٹ اسٹیفنس کالج اور دہلی یونیورسٹی کا طالبِ علم بھی رہا ہوں۔ چنانچہ ایم۔ اے میں نے یہیں سے کیا ہے۔ میرے زمانہ میں سر مارس گوائر جو فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے تھے، دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ کوئی وائس چانسلر ہو تو واقعی بنگال کے سر آسوتوش مکھرجی کی طرح ہو یا سر مارس گوائر کی طرح! موخر الذکر کو میں نے بہت قریب سے

دیکھا ہے اور ان کی مجھ پر بہت کچھ عنایتیں رہی ہیں۔ کلکتہ کے لیے روانہ ہوتے وقت انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ دلی یونیورسٹی میں عربی پروفیسر کی کرسی پیدا ہوگی تو مجھ کو دلی واپس آنا ہوگا۔ اور مجھے یاد ہے کہ جب میں نے ہنستے ہوئے ان کے سامنے مرزا غالب کا مصرعہ میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں "پڑھا تو وہ بہت محظوظ ہوئے تھے اور تقاضا کر کے شعر کا مصرعہ اول بھی سنا اور انگریزی میں اس کا ترجمہ کرایا تھا۔

حق یہ ہے کہ یہ شخص شرافت وانسانیت۔ محبت، خلوص اور ہمدردی کا پیکر تھا۔ ان کو یونیورسٹی کے ساتھ وہی محبت تھی جو ماں کو اولاد کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایک اعلیٰ درجہ کی یورپین زندگی کی راحتوں اور آسائشوں کو قربان کر کے وہ یونیورسٹی کی عمارت کے دو تین کمروں پر قانع ہو کر یہاں آپڑے تھے۔ بیوی بچہ کوئی تھا نہیں، مجرد رہتے تھے۔ اور ان کے وقت کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں تھا جو یونیورسٹی کے کاموں اور اس کے ذکر وفکر سے خالی ہو۔ صبح شام وہ ٹہلنے کے عادی تھے تو ان کی ٹہل یہ تھی کہ اِدھر اُدھر یونیورسٹی کی جو عظیم الشان عمارتیں بن رہی تھیں اور باغ اور لان تیار ہو رہے تھے سر مارس گوئر صبح شام ان سب کو جا کر دیکھتے اور کام کا معائنہ کرتے تھے۔ ان کی دوربینی اور دقت نظر کا یہ عالم تھا کہ یونیورسٹی لائف کا کوئی معمولی سے معمولی پہلو بھی ایسا نہیں تھا جو ان کی توجہ کی نگاہ سے محروم رہا ہو۔ حد یہ ہے انہوں نے محسوس کیا کہ اساتذہ کی حالت بڑی خراب ہے۔ ان کو تنخواہیں کم ملتی ہیں۔ ملازمت میں ان کو تحفظ (SECURITY) حاصل نہیں ہے۔ کالجوں کی گورننگ باڈیز ان کے ساتھ توہین و تذلیل کا معاملہ کرتی ہیں، اور ان کا معیارِ زندگی اونچا نہیں ہے۔ اس موقع کے لیے موصوف کا ایک خاص فقرہ تھا:

اساتذہ کو سماجی یتیم (SOCIAL ORPHANS) کہتے تھے اور اس بنا پر ان کے حالات کی اصلاح اور ترقی کے لیے جہاں انہوں نے اور بہت سے قواعد و قوانین بنائے، گریڈ بڑھائے اساتذہ کی جماعت میں خود اعتمادی اور پبلک کی نظر میں ان کی عزت و وقعت پیدا

کرنے کی غرض سے انہوں نے یہ بھی کیا کہ وائسرائے سے مل کر یہ طے کیا کہ سال میں دو مرتبہ ورنہ کم از کم ایک مرتبہ ضرور وائسرائے اور ان کی بیگم کی طرف سے یونیورسٹی اور کالجوں کے تمام اساتذہ کی دعوت ہوگی۔ اس مقصد کے لیے ٹرانسپورٹ کا انتظام بھی وائسرائے کی طرف سے ہوگا چنانچہ اس سلسلہ میں کئی مرتبہ راقم الحروف کو بھی وائسرائیکل لاج لارڈ لنلتھگو اور ان کی بیگم کے ساتھ چائے پینے اور ان سے گفتگو کرنیکا شرف حاصل ہوچکا ہے۔ بہرحال اس داستان سرائی کا مقصد یہ ہے کہ سرمارس گوئر نے دلی یونیورسٹی کو صحیح معنی میں ملک کی ایک عظیم الشان یونیورسٹی بنانے میں جو اہم رول ادا کیا ہے اس کو تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ ان کی لیاقت و قابلیت، خلوص و ایثار اور بیدار مغزی و روشن ضمیری کے باعث ہر شخص ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اکاڈمک کونسل کی جب میٹنگ ہوتی تھی تو بڑی سنجیدگی اور متانت سے ہوتی تھی۔ کارروائی اس طرح ہوتی تھی کہ کوئی معاملہ زیر بحث آیا تو اس کے متعلق جس کسی کو جو کچھ کہنا ہوا انچ پانچ منٹ کے مقررہ وقت کے اندر اندر سنجیدگی اور معقولیت کے ساتھ کہدیا۔ جب یہ بحث ختم ہوگئی تو سرمارس گوئر نے بحیثیت صدر اس کے متعلق دو تین منٹ میں اپنی رائے ظاہر کردی اور بس معاملہ ختم ہوگیا۔ میٹنگ میں نہ شور و غل ہوتا تھا اور نہ ہنگامہ۔ نہ چیخ پکار ہوتی تھی اور نہ ہڑبونگ۔

لیکن یہ ڈسپلن اور یہ صورتِ حال صرف ۱۵ راگست ۴۷ء تک قائم رہ سکی۔ آزادی کے بعد اکاڈمک کونسل کی جو پہلی میٹنگ ہوئی ہے (میں اسمیں موجود تھا) تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ اب زمین و آسمان بدل گئے ہیں، اور فضا یکایک متغیر ہوگئی ہے۔ جو لوگ پہلے خاموش رہتے یا تقریر کم کرتے تھے اب انہیں دیکھا کہ منہ پھلا کر اور بازو پھیلا پھیلا کر تقریر کر رہے ہیں۔ سرمارس گوئر ٹوکتے ہیں تو مانتے نہیں۔ قاعدہ کے خلاف بار بار اٹھ رہے ہیں اور بول رہے ہیں۔ سرمارس گوئر کوئی بات کہتے ہیں تو اس کی مخالفت یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ وہ ایک کہتے ہیں تو یہ جواب میں دو کہتے ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ رویہ جو کچھ بھی تھا ان لوگوں کا تھا

جو میری طرح اس زمانہ کی نئی نسل سے تعلق رکھتے اور جونیر اساتذہ کہلاتے تھے۔ جو حضرات پرانی نسل کے اور سینیر اساتذہ تھے وہ اب بھی سر مارس گوئیر کی حسب سابق عزت کرتے اور ان پر اعتماد رکھتے تھے۔ چنانچہ ان حضرات نے جب یہ بدلی ہوئی صورتِ حال دیکھی تو ان کا ماتھا ٹھنکا اور انہیں سخت افسوس اور رنج ہوا۔ میٹنگ کے بعد ان لوگوں نے آپس میں کہا، معلوم ہوتا ہے کہ ملک کو آزاد کرا کے ہم نے انگریز کو کیا نکالا۔ اس کے ساتھ ہی ڈسپلن، نظم و ضبط فرض شناسی، کام کی لگن اور امانت و دیانت یعنی وہ تمام صفات جو ہم نے انگریز سے سیکھی تھیں ان سب کو بھی خیر باد کہہ دیا ہے۔ دلی یونیورسٹی کی یہ صورتِ حال دراصل ایک علامت تھی جس سے قیاس کیا جا سکتا تھا کہ اب اور دوسری یونیورسٹیوں میں بھی کیا ہوگا۔

سر مارس گوئیر نہایت مخلص، بے لوث و بے غرض انسان تھے۔ ہم لوگوں کو اسی وقت یہ خیال ہوا تھا کہ موصوف اب غالباً مزید قیام نہیں کر سکینگے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے چند ماہ کے بعد رخصت لی اور وطن چلے گئے اور وہاں سے استعفیٰ بھیج دیا۔ اس زمانہ میں سر راج گوپال اچاریہ گورنر جنرل تھے۔ وہ اور پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد تینوں موصوف کے بڑے قدر شناس تھے، انہوں نے اصرار کر کے انہیں واپس بلا لیا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد وہ چند ماہ سے زیادہ نہ رہ سکے اور آخر مستعفی ہو کر پھر واپس چلے گئے۔

اب غور کیجئے! آج ملک میں تعلیم کا کیا حال ہے؟ تقسیم کے وقت یونیورسٹیوں کی تعداد انیس بیس سے زیادہ نہیں تھی، آج ان کی تعداد اسّی سے اوپر پہونچ چکی ہے خاص خاص علوم و فنون پر تحقیقات اور ان کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جو انسٹی ٹیوٹ قائم کیے گئے ہیں وہ بھی پچیس چھبیس سے کم نہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں کا فی صد تناسب بہت بڑھ گیا ہے۔ تعلیم کے لیے حوصلہ افزائی کے جو ذرائع اور وسائل ہوتے ہیں یعنی اسکالرشپ، فیلوشپ، وظائف، انعامات، میڈل وغیرہ ان کی بھرمار ہے۔ اساتذہ کی تنخواہیں، ریسرچ کے لیے سہولتیں، عمارتیں، لائبریریاں، لیبوریٹریز، ہوسٹل، کھیل کے میدان

غیر تعلیمی سرگرمیاں، سیمینار، سمپوزیم وغیرہ جیسی چیزوں میں جو وسعت ہوئی ہے اس کا حد وحساب ہی نہیں۔ علاوہ ازیں نصاب تعلیم، طریق تعلیم اور طریق امتحان وغیرہ میں جو اصلاحات ہوئیں اور برابر ہو رہی ہیں وہ ہر شخص کے سامنے ہیں۔ ہر چند برس کے بعد ایک تعلیمی کمیشن مقرر ہوتا ہے اور لاکھوں روپے کے خرچ کے بعد وہ اپنی ضخیم رپورٹ مرتب کر کے پیش کر دیتا ہے۔ آئے دن خاص تعلیم پر سیمینار منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان سب چیزوں کے باوجود کسی بھی صاحب نظر سے پوچھئے کہ اس ظاہری ٹیپ ٹاپ اور طمطراق کے باوجود معنوی اعتبار سے ہم آگے بڑھ رہے ہیں یا پیچھے لوٹ رہے ہیں؟ ہمارے قدم ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہیں یا ہم بڑی سرعت سے نیچے کی طرف جا رہے ہیں؟ ہر سال یونیورسٹیوں میں کنووکیشن ایڈریس پڑھے جاتے ہیں۔ آئے دن ملکی اور غیر ملکی لیڈروں اور ماہرین تعلیم کے بیانات اخباروں میں نکلتے رہتے ہیں۔ ان میں کیا ہوتا ہے؟ موجودہ نظام تعلیم کی از کار رفتگی اور اس کی عدم افادیت کا ماتم ہی یا کچھ اور؟ اور لطف یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس وقت ہے جب امتحانات میں کامیاب ہونے والوں کا تناسب ہر یونیورسٹی میں ستر پچھتر فی صد سے کم نہیں ہوتا۔ اور پھر فرسٹ اور سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہونے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہوتی۔ اب دونوں چیزوں پر ایک ساتھ غور کیجئے تو صاف نظر آتا ہے کہ تعلیم کے بارہ میں ہم سب ایک نہایت عظیم خود فریبی میں مبتلا ہیں گویا:

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

۵۔ یہ تھی تعلیمی حالت! اب اخلاقی حالت پر ایک نگاہ ڈالئے تو حالت اور بھی بدتر نظر آتی ہے۔ آئے دن اسٹرائک۔ عجیب وغریب قسم کے مطالبات اور ان کے لیے ہنگامہ آرائی۔ زد و کوب۔ توڑ پھوڑ۔ وائس چانسلر اور عمائد یونیورسٹی کا گھیراؤ۔ اور خدا جانے اور کیا کیا۔ یہ روزمرہ کے واقعات ہو گئے ہیں۔ جن کے باعث یونیورسٹی ایڈمنسٹریشن روز بروز ناکارہ اور غیر مؤثر ہوتا

جارہا ہے۔ قواعد وضوابط ہیں، مگر ان پر عمل نہیں ہوسکتا۔ اور طلبا جس طرح چاہیں اس کے مطابق ان قواعد وضوابط میں ترمیم وتنسیخ ضروری ہے۔ ورنہ نہ جانوں کی خیر ہے اور نہ مال کی!

اسٹیٹسمین دہلی مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۷۰ء میں دہلی یونیورسٹی سے متعلق اسٹاف رپورٹر کے قلم سے ایک مضمون شائع ہوا تھا اس کا عنوان تھا "اباحتی کیمپس" (PERMISSIVE CAMPEAS) یہ عنوان خود بتا رہا ہے کہ مضمون میں کیا ہوگا۔ جستہ جستہ اقتباسات آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اس رپورٹ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:۔

"دلی یونیورسٹی کے ہمارے پرانے طلبا اکثر کہتے ہیں کہ طلبا کی نئی نسل وحشی ہوگئی اور سچ مچ تباہ اور خراب وخستہ ہوگئی ہے۔ یونیورسٹی کی زندگی میں اب ایک نئی اباحیت پیدا ہوگئی ہے، اور یونیورسٹی کے ہوسٹل گناہگاری کے اڈے بن گئے ہیں۔ وقت یقیناً بدل گیا ہے۔ وہ زمانہ گیا جب کہ یونیورسٹی میں رومان اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے ہوتا تھا یا لڑکیوں کے ہاسٹل کے آہنی گیٹ کے پاس۔ آج تو عالم یہ ہے کہ سینٹ اسٹیفنس کالج کے ہاسٹل اور ہندو کالج کے ہاسٹل میں لڑکیاں بے تکلف لڑکوں کے پاس آتی جاتی ہیں اور ان کی مجلس میں بے جھجک سگریٹ اور شراب کا دور چلتا ہے۔ اور کوئی اس کا نوٹس بھی نہیں لیتا۔

رپورٹر آگے چل کر لکھتا ہے:

خود ایک لڑکی نے مجھ سے کہا تھا کہ لڑکیوں کے ہوسٹل کا معاملہ بھی یہی ہے۔ وہاں رات گئے تک پارٹیاں ہوتی ہیں اور شراب کا دور چلتا ہے۔ برنڈا ہاؤس کی ایک لڑکی نے بتایا کہ اب ایک لڑکی کو رونقِ محفل بننے کے لیے اچھے اور شائستہ لباس میں ملبوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے وہ عام طور پر ایک سوئیٹر یا قمیص اور پتلون پہنے ہوئے لڑکوں میں گھومتی ہیں۔"

اس قسم کے واقعات کے بعد رپورٹر لکھتا ہے: عجیب بات یہ ہے کہ ہوسٹل کے

طلبا اور طالبات کیلئے جو قواعد وضوابط اب سے پندرہ برس پہلے تھے وہ اب بھی ہیں اور ان میں بہت معمولی رد وبدل ہوا ہے۔ اور ان قواعد کی رو سے لڑکیوں کے لیے سگریٹ پینا، مغرب کے بعد ہاسٹل سے نکلنا لڑکوں کے ہاسٹل میں جانا۔ مہینہ میں چند مخصوص راتوں کے علاوہ اور وہ بھی وارڈن کی اجازت سے۔ رات بھر غائب رہنا۔ ناشائستہ اور نامناسب لباس پہننا یہ سب چیزیں اب بھی ممنوع ہیں لیکن کوئی ان کی پروا نہیں کرتا۔ اور ہاسٹل کے اربابِ نظم وضبط کی مجال نہیں ہے کہ ان قواعد کو نافذ یا ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دے سکیں۔

رپورٹر نے اس مضمون میں سینٹ اسٹیفنس کالج کا بار بار نام لیا ہے۔ چونکہ طالب علم اور استاد کی حیثیت سے برسوں تک میرا اس کالج سے تعلق رہا ہے اور اس کی شاندار روایات سے میں واقف ہوں اور مجھ کو اس کالج کے ساتھ اب تک تعلق خاطر بھی ہے۔ اس بنا پر رپورٹ میں بار بار اس کالج کا نام دیکھ کر مجھ کو طبعی طور پر بڑا صدمہ اور دکھ ہوا۔ یہ کالج تعلیم اور ڈسپلن دونوں اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا۔ جس زمانہ میں میں یہاں طالب علم تھا اور کالج کشمیری گیٹ کی اپنی پرانی عمارت میں تھا اس کے پرنسپل مسٹر این۔ کے سین تھے۔ موصوف آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ اور بڑی آن بان اور رعب داب کے پرنسپل تھے۔ کالج میں لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں، مگر بہت کم۔ پرنسپل سین نے ایک لڑکے اور ایک لڑکی کو دیکھا کہ دونوں ہمیشہ ایک ساتھ رہتے ہیں، کلاس روم میں دونوں ساتھ بیٹھتے ہیں۔ کیفے میں ساتھ۔ لان پر ساتھ ایک ساتھ کالج آتے جاتے ہیں۔ چند روز وہ اسی طرح دیکھتے رہے۔ آخر ایک دن لڑکے کو بلا کر کہا کہ تمہارا یہ رویہ سخت نامناسب اور کالج کی روایات کے خلاف ہے۔ میں آئندہ اس طرح نہ دیکھوں! لیکن ان کے رویہ میں تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ اور آخر دونوں کا اخراج کر دیا گیا۔ اور سنیے ایک مرتبہ کالج یونین کے جلسہ میں ایک منکرِ خدا و مذہب لڑکے

نے تقریر کرتے ہوئے خدا کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہہ دیئے۔ پرنسپل سین کو اطلاع ہوئی تو فوراً لڑکے کو بلا کر کہا: صاحبزادے تم کو معلوم ہے کہ یہ کرسچین کالج ہے اور اس کے قیام کا مقصد ہی خدا کی نام کی عظمت کو قائم کرنا ہے۔ اس لیے کوئی طالب علم یا استاد خواہ کسی عقیدے یا مذہب کا ہو۔ اس کو کالج کے حدود میں خدا کی شان میں گستاخی کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن تم نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے، اس لیے میں حکم دیتا ہوں کہ تم چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تحریری معافی نامہ داخل کرو اور عہد کرو کہ آئندہ ایسا نہیں کرو گے۔ ورنہ میں تم کو خارج کر دوں گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکے نے معافی نامہ داخل نہیں کیا اور اس کا اخراج کر دیا گیا۔

میں جب کلکتہ گیا ہوں تو اس سے کئی برس پہلے پرنسپل سین کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی جگہ مسٹر راجا رام کالج کے پرنسپل مقرر ہو گئے تھے۔ ان کے عہد میں کالج کی گورننگ باڈی نے یہ فیصلہ کیا کہ کالج میں اب تک لڑکیوں کو بھی داخلہ کی اجازت تھی، لیکن اس کے نتائج اچھے نہیں نکلے ہیں۔ اس لیے اب آئندہ سے کالج میں لڑکیوں کا داخلہ بند کیا جاتا ہے۔ ہم لوگ کالج میں تھے تو اساتذہ اور طلبا سب ایک خاندان کے افراد کی طرح ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو کر رہتے تھے۔ اساتذہ کا کام صرف کلاس میں لکچر دینا نہیں تھا۔ بلکہ وہ ان کی تربیت بھی کرتے تھے۔ کالج میں صبح کے وقت آتے اور شام کو ہی گھر جاتے تھے۔ کلاس روم کے علاوہ سارا وقت لڑکوں سے بات چیت میں، ان کی تعلیم اور کالج کی دوسری سرگرمیوں سے متعلق ان کی رہنمائی میں صرف کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبا کو اسٹاف پر پورا بھروسہ اور اعتماد تھا۔ اساتذہ طلبا کے گھریلو معاملات میں بھی مفید مشورے دیتے رہتے تھے۔ مجھے کبھی یاد نہیں پڑتا کہ لڑکوں نے کبھی کسی بات پر احتجاج کیا ہو۔ اسٹرائیک کی ہو اور کبھی کسی حکم کی خلاف ورزی کا ارتکاب کیا ہو کس درجہ افسوس اور رنج والم کی بات ہے کہ اب یہی کالج ہے جس کے ہوسٹل میں رہنے والے طلبا انسٹیٹیوشن

ے کے رپورٹر کے بقول اب اس بات کا مطالبہ اور اس کیلئے احتجاج کر رہی ہیں کہ ان کے ہوسٹل میں لڑکیوں کے آنے جانے پر جو قدغن ہے اسی کو دور کیا جائے۔ اور عملاً غیر قانونی طور پر ایسا ہو بھی رہا ہے جن حسّاس لوگوں کے دل میں ملک اور قوم اور ان سے بھی بڑھ کر انسانیت کا درد وغم ہے وہ نئی نسل کی اس عام بے راہ روی پر انگشت بدنداں ہیں اور خونِ جگر کے گھونٹ پی پی کر رہ جاتے ہیں لیکن پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اصلاح کی کوئی صورت کہیں نظر نہیں آتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس صورتِ حال کے لیے اپنے نوجوانوں کو ہی ملزم اور ذمہ دار قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ چھوٹے بڑوں سے سبق لیتے ہیں اور غیر شعوری طور پر انہیں کے رنگ میں اپنے کو رنگنا چاہتے ہیں۔ جب ہمارا پورا معاشرہ ہی فاسد ہے اور اوپر سے لیکر نیچے تک، ارکانِ حکومت۔ افسران اپنے اور غیر۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور انتظامیہ۔ والدین اور اعزا و اقارب سب مفاد پرستی اور لذّت کوشی کے جنون میں مبتلا ہیں اور علم جیسی مقدس شے جس کا اصل مقصد خدمتِ خلق اور انسانیت کا ارتفاع تھا اس کو بھی حصول و جمع زر اور عشرت اندوزی کا ذریعہ بنا لیا جائے تو پھر اس ماحول اور اس فضا میں نوجوان نسل سے کسی خیر کی توقع کیا ہو سکتی ہے؟

بہر حال یہ ہیں وہ عام حالات جن سے تعلیم کے میدان میں ملک اور قوم دوچار ہے۔ اب اگر مسلمانوں کو اس ملک میں صرف ایک تماشائی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک فعّال اور موثر گروہ کی حیثیت سے رہنا اور جینا ہے تو ان حالات کو سامنے رکھ کر انہیں لامحالہ غور کرنا چاہیئے کہ ان کا کیا فرض ہے اور انہیں کیا کرنا چاہیئے جس سے وہ خود اپنی اولاد کے لیے بہترین تعلیم اور اعلیٰ تربیت کا انتظام اور ساتھ ہی ملک اور قوم کی اس معاملہ میں مدد کر سکیں۔

دورِ علوی میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت

جناب خورشید احمد فارق صاحب۔ پروفیسر شعبۂ عربی۔ دہلی یونیورسٹی دہلی

(۱) عام عرب

علی حیدر کی حکومت عام عربوں کے اقتصادی سدھار کے لئے کچھ مفید کام نہیں کر سکی بلکہ ان کے عہد میں بہت سے عرب گھرانوں کی مالی حالت خراب ہوگئی۔ عربوں کے دو طبقے تھے: ایک طبقہ فوج میں بھرتی تھا، اسے مع متعلقین حکومت کی طرف سے تنخواہ اور راشن ملتا تھا۔ راشن کی مقدار ہر فرد کی ضرورت سے زائد تھی۔ لیکن تنخواہ اتنی کم کہ بہت سی ضرورتیں پوری نہیں ہوتی تھیں۔ نقد کی کمی کو عرب سپاہی بڑی حد تک غنیمت کے ان حصوں سے پورا کر لیتا تھا جو اسے غیر مسلم علاقوں میں ترکتاز اور فوج کشی کے دوران حاصل ہوتے رہتے تھے۔ علی حیدر کے عہد میں فتوحات کے دروازے بند رہے اس لئے عرب سپاہی کو غنیمت کے سہام سے اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس نقصان کے علاوہ ایک دوسرا خسارہ یہ ہوا کہ آرزومندانِ خلافت، کی باہمی جنگوں میں عرب سپاہی بڑی تعداد میں مارے گئے۔ جنگ جمل (۳۶ھ) اور صفین (۳۷ھ) میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی۔ ان کے بعد ان کے اہل و عیال بڑے پیمانے پر مالی دشواریوں میں مبتلا ہوگئے۔ عرب فوج میں علی حیدر سے بددلی اور ان کی امیر معاویہ کے ساتھ دوسری بڑی مجوزہ جنگ میں شرکت سے پہلو تہی کرنے کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ بہت سے خاندان، جمل، صفین اور نہروان کے معرکوں میں اپنے کمانے والوں کو کھو کر اقتصادی بدحالی کا شکار ہو گئے تھے اور علی حیدر کی امیر معاویہ سے دوسری مجوزہ جنگ میں شرکت کرنے والے باقی ماندہ سپاہیوں کو اپنی ہلاکت اور اپنے متعلقین کے لئے اس سے پیدا ہونے والی اقتصادی مشکلات کا سخت اندیشہ تھا۔ دوسرا طبقہ جزیرۂ عرب کے صحراؤں اور دیہاتوں میں گردو پیش

کی نامہربان قدرت سے لڑتا جھگڑتا عسرت کی زندگی گذار رہا تھا۔ صدیقی، فاروقی اور عثمانی دور میں اس طبقہ کے ہزاروں جوانوں نے اسلامی فوجوں میں بھرتی ہو کر اپنی مالی حالت سدھار لی تھی۔ حیدری خلافت میں تسخیری سرگرمیوں کے بند رہنے سے بھرتی بھی بند رہی اور جزیرہ عرب کے جوان اسلامی حکومت کی سرپرستی سے محروم رہ کر اپنی اقتصادی خستہ حالی دور کرنے پر قادر نہیں ہو سکے۔ بصرہ اور کوفہ کی چھاونیوں میں جو ایک لاکھ سے زائد فوج تھی وہی علی حیدر کی جنگوں میں کام آئی۔

(۲) غیر ہاشمی قریش (بنو امیہ)

ان کے دو طبقے تھے: ایک وہ جو حکومت اور اس کے مناصب سے وابستہ رہا تھا اور جس کے باصلاحیت افراد عثمانی دور میں خلافت کے روشن ستارے تھے۔ یہ ستارے علوی خلافت میں ایک ایک کر کے غروب ہو گئے اس طبقہ کے جن اشخاص کو عثمان غنی نے نقد عطیات، زمینیں یا نخلستان دیئے تھے وہ علی حیدر نے خلافت کا عہدہ سنبھال کر ضبط کر لئے تھے[۱] بنا بریں اس طبقہ کے متعدد باثر اور ممتاز خاندان علوی دور میں مالی دشواریوں سے دوچار رہے اور بعض خاندانوں کی اقتصادی ترقی رکی رہی لیکن چند ہی سال بعد سفیانی عہد میں یہ طبقہ پھر ابھرا اور خلافت کے سیاسی و اقتصادی افق پر چھا گیا۔ دوسرا طبقہ جو حکومت سے براہ راست متعلق نہ تھا اور جس کی مادی خوش حالی کا انحصار زیادہ تر تجارت اور باغبانی پر تھا۔ حیدری حکمرانوں کی ناہمدرد نظروں کے سامنے دبا دبا سہما سہما رہا اور اقتصادی ترقی کے میدان میں دور سابق کی طرح سرگرمی نہیں دکھا سکا۔

(۳) انصار

علی حیدر کے مختصر دور خلافت میں انصار خلافت کے ناخداؤں میں سے تھے۔ ان کو اعلیٰ فوجی اور سول عہدے ملے جن سے شیخین اور عثمان غنی کے عہد میں وہ محروم رہے تھے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں ابوبکر صدیق کے انتخاب سے جن دو فریقوں کو سخت مایوسی ہوئی تھی وہ علی حیدر اور ان کا ہاشمی خاندان اور انصاری شاخ خزرج کے سربرآوردہ لیڈر سعد بن عبادہ اور ان کے اہل خاندان تھے۔ حالیہ ناکامی نے دونوں فریقوں کو ایک

---

[۱] ابن ابی الحدید ۱/۹۰

دوسرے سے قریب اور کامیاب فریق کے مقابلہ میں متحد کر دیا تھا۔ علی حیدرؓ بیوی فاطمہ اور دونوں بچوں حسن اور حسین کے ساتھ رات میں ذی اثر انصاریوں کے گھر جاتے اور شکایت کرتے کہ مجھ سے خلافت چھین لی گئی ہے۔ اور اس زیادتی کی تلافی کے لئے میری مدد کیجئے۔ ناسازگار حالات کے باعث انصار دست و بازو سے علی حیدرؓ کی مدد نہیں کر سکے لیکن ان کی ہمدردیاں علی حیدرؓ سے وابستہ ہو گئیں۔ صدیقی دور میں سرکاری عہدوں سے محرومی فاروقی خلافت میں اعلیٰ سول اور فوجی مناصب سے علیحدگی نیز دیوان العطاء میں مہاجرین قریش سے چھوٹا گریڈ پا کر انصار کا غبار خاطر بڑھ گیا اور وہ ہاشمی امیدوار خلافت علی حیدرؓ کے حامی ہو گئے۔ عثمانی دور میں حکومت کی بڑھتی ہوئی بےالتفاتی سے ان کی کشیدگی اشتعال میں بدل گئی اور وہ اس مہم میں شریک ہو گئے جو غیر ہاشمی خلافت کا خاتمہ کر کے ہاشمی خلافت قائم کرنا چاہتی تھی۔ خلیفہ ہو کر علی حیدرؓ نے انصار کو ان کی حمایت اور خلافت کی مہم میں ان کے سرگرم تعاون کا صلہ دیا۔ انھوں نے پانچ میں سے تین اہم صوبوں پر انصاری گورنر مقرر کئے۔ مصر بھیجے ایک انصاری امیدوار خلافت سعد بن عبادہ کے فرزند قیس تھے۔ سقیفہ بن ساعدہ میں جب سعد بن عبادہؓ اور ان کے قبیلہ کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے خلافت نکل گئی تو وہ سخت برہم ہوئے تھے۔ انھوں نے ابوبکر صدیقؓ کی بیعت نہیں کی تھی۔ اور احتجاجاً مدینہ چھوڑ کر شام کے ایک الگ تھلگ شہر میں جا بسے تھے۔ ان کے لڑکے قیس علی حیدرؓ کے سرگرم کارکنوں میں سے تھے۔ اعلیٰ سول عہدوں کے علاوہ انصاری صحابہ علوی فوج کے اہم عہدوں پر بھی فائز ہوئے۔ علوی خلافت کی سب سے بڑی جنگ صفین جس میں علی حیدرؓ کے نوے ہزار سپاہی شریک ہوئے اور جس میں طرفین کے ستر ہزار آدمی مارے گئے۔ قیس بن سعد بن عبادہ بصرہ کی پیادہ ڈویژن اور سہل بن حنیف انصاری بصرہ کی رسالہ فوج کے کمانڈر تھے[۱]

آسمان خلافت پر پونے پانچ سال چمکنے کے بعد انصاری ستارے ماند پڑ گئے۔ علی حیدرؓ کی وفات کے سات آٹھ ماہ بعد سارے مسلمانوں نے بالاتفاق امیر معاویہ کو خلیفہ تسلیم کر لیا۔ امیر معاویہ اموی تھے اور عثمان غنیؓ کے رشتہ دار۔ اموی دور میں انصار کو بنو ہاشم سے اپنی دوستی کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ بنو امیہ کی نظر میں ان کا پایہ اور اعتبار گر گیا۔ امیر معاویہ نے انصار کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جیسا شیخین اور

---

[۱] طبری (لائڈن) ۱/۳۲۸۳

عثمان غنی ان کے ساتھ گھتے تھے۔ ان کے بیس سالہ دور حکومت میں صرف دو انصاری خلافت کے بڑے عہدوں پر نظر آتے ہیں۔ ایک نُعمان بن بشیر اور دوسرے مسلمہ بن مخلد۔ نعمان کے والد بشیر بن سعد، سعد بن عُبادہ کی طرح انصاری شاخ خزرج کے لیڈر تھے لیکن سعد بن عُبادہ اثر اور رسوخ میں ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ دوسرے اکابر قبیلہ کے دباؤ میں آکر بشیر بن سعد نے خلافت کے لئے سعد بن عبادہ کی نامزدگی قبول کرلی تھی لیکن دل سے انہیں سعد بن عبادہ کا خلیفہ ہونا گوارا نہ تھا[1]۔ سقیفہ بن ساعدہ میں جب قریش نے سعد بن عبادہ کا مطالبۂ خلافت مسترد کردیا اور فریقین میں قیل و قال بڑھی تو بشیر بن سعد نے موقع سے فائدہ اٹھا کر قریش کی خلافت کے حق میں ایک تقریر کردی۔ اس سے انصار کے کیمپ میں پھوٹ پڑگئی انکا محاذ کمزور ہوگیا اور ابوبکر صدیق خلیفہ منتخب ہوگئے۔ اس خدمت کی ابوبکر صدیق نے قدر کی اور بشیر بن سعد کو قریشی سپہ سالار خالد بن ولید کے زیر کمان ایک دستہ کا کپتان بنادیا[2]۔ یہ نعمان جنہیں امیر معاویہ نے کوفہ کا گورنر بنایا انہی بشیر بن سعد کے لڑکے تھے اور ان کا تعلق عثمانی کیمپ سے تھا۔ اُن نو دس بڑے انصاریوں میں یہ بھی شامل تھے جنہوں نے علی حیدر کی بیعت نہیں کی تھی۔ انہی نعمان کے ہاتھ مقتول خلیفہ کی عیسائی بیوی نائلہ نے اپنے شوہر کی خون میں رنگی ہوئی قمیص اور ان کے قاتل کی تلوار سے کٹی انگلیاں امیر معاویہ کو بھیجی تھیں۔ نعمان بن بشیر کی طرح مسلمہ بن مخلد بھی عثمان غنی کے ہواخواہوں میں تھے انہوں نے مصر جاکر بہت سے عربوں کو عثمان غنی کا طرفدار بنالیا تھا اور امیر معاویہ کو مشورہ دیا تھا کہ ایک فوج بھیجکر مصر کو علوی تسلط سے آزاد کرالیں۔ امیر معاویہ نے مسلمہ بن مخلد کے مشورہ کی قدر کی اور ایک رسالہ فوج بھیجدی جس نے مسلمہ بن مخلد اور دوسرے عثمانی وفاداروں کے تعاون سے حیدری گورنر محمد بن ابوبکر (پروردہ علی حیدر) کو شکست دیکر مصر پر قبضہ کرلیا۔ مسلمہ بن مخلد کی وفاداری دس بارہ سال مزید آزمانے کے بعد ۵۰ھ میں امیر معاویہ نے انہیں مصر اور شمالی افریقہ کی گورنری سونپ دی۔

اقتصادی نقطۂ نظر سے علوی دور میں انصار کو اعلیٰ سول اور فوجی عہدوں سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ ناساعد حالات کے ماتحت انصاری گورنروں کو سال چھ مہینے میں اپنے منصب چھوڑنا پڑے۔ ان کے اعلیٰ فوجی افسروں نے جو معرکے لڑے ان میں خود ان کے ہم مذہب مد مقابل تھے اور ان کے گھوڑوں کی ٹاپ کے نیچے غیر مسلم علاقے نہیں

---

[1] ابن قتیبہ صـ

[2] ابن سعد ۳/۵۳۲، یاقوت (لیبزگ) ۱/۲۰۳

تھا جہاں ترکتازکر کے وہ اور ان کے متعلقین مختلف قسم کے مال غنیمت سے بہرہ اندوز ہوتے جیسا کہ سابقہ ادوار میں مسلمان مجاہد ہوتے رہے تھے۔ اس کے باوجود کہ ایک چھوٹی سی جماعت کو چھوڑ کر سارے انصاری اکابر نے علی حیدر کی بیعت کر لی تھی، علوی لشکر میں جس کی تعداد نوے ہزار اور بقول بعض ایک لاکھ تھی، سات آٹھ سو سے زیادہ انصاری نہیں تھے[1]۔ کئی سبب اس قلت تعداد کے ذمہ دار تھے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں ہمیشہ کے لئے خلافت کا میدان چھوڑ کر انصار قریش کی سیادت اور اقتصادی فروغ کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانے سے گریز کرنے لگے تھے، ان کی مالی حالت بھی اسلام کے زیر سایہ اتنی سدھر گئی تھی کہ کسب معاش کے لئے تلواروں کے سایہ میں جینا انکے لئے ضروری نہیں رہا تھا، بہت سے انصاری اپنے ہم مذہبوں پر تلوار اٹھانے سے بھی جی چراتے تھے۔ علی حیدر کی خلافت میں اقتصادی اعتبار سے انصار کے وہی چار طبقے تھے جن کا عثمان غنی کے جائزہ میں ذکر ہو چکا ہے اور ان کی مالی حالت علوی دور میں کم و بیش ویسی ہی رہی جیسی کہ سابقہ دور میں تھی۔ یہ فصل ہم ایک انصاری کے ذکر پر ختم کرتے ہیں جس کی دولت کی ہمارے مراجع نے نشان دہی کی ہے۔ یہ انصاری مشہور صحابی زید بن ثابت ہیں۔ جن کا تعلق انصار کی شاخ خزرج کے ایک معمولی گھرانے سے تھا۔ کاتب وحی، جامع قرآن اور مفتی و قاضی کی حیثیت سے ان کو خاص شہرت حاصل ہے۔ رسول اللہ کی وفات کے وقت زید بن ثابت چوبیس سالہ جوان تھے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں انھوں نے خلافت قریش کی تائید میں تقریر کر کے ابوبکر صدیق اور ان کے رفقاء کے دل میں گھر کر لیا تھا[2]۔ شیخین اور عثمان غنی تینوں کو ان کا تعاون حاصل تھا اور تینوں نے انہیں خوب نوازا بھی۔ ابوبکر صدیق نے ان سے قرآن جمع کرایا، عمر فاروق نے انہیں معاوضہ دے کر مفتی و قاضی کے فرائض سپرد کئے۔ اور وہ جب حج یا کسی دوسری مہم پر مدینہ سے باہر جاتے تو اکثر زید بن ثابت ہی کو اپنا جانشین مقرر کرتے تھے اور جب سفر سے واپس آتے تو انہیں بالعموم ایک نخلستان انعام میں دیا کرتے تھے[3]۔ عثمان غنی نے زید بن ثابت کو بیت المال کا خزانچی مقرر کر دیا تھا۔ تنخواہ کے علاوہ انہیں خلیفہ سے عطیے بھی ملتے رہتے تھے۔ کبھی زر و سیم اور

---

[1] طبری (لائڈن) ۱/۳۲۸۹

[2] ابن عساکر ۵/۴۴۶

[3] ایضاً ۵/۴۴۷ و ۴۴۸

سامان، کبھی جائداد اور نخلستان۔ ایک بار بصرہ سے مرکزی خزانہ کے لئے پانچ لاکھ روپے آئے تو خلیفہ نے پچاس ہزار[1] زید بن ثابت کو ان کی حسن خدمت سے خوش ہو کر عطا کر دیئے۔ زید ان نو دس انصاریوں میں سے تھے جو آخر وقت تک عثمان غنی کی حمایت و وکالت کرتے رہے تھے۔ عثمان غنی کے محاصرہ کے دوران ایک موقع پر زید بن ثابت نے انصار اکابر سے اپیل کی کہ خلیفہ کی مدد کریں اور محاصر باغیوں کو مدینہ سے نکال دیں، اس پر سہل بن حنیف انصاری نے جو علی حیدر کی طرف سے کچھ دن بعد بصرہ کے گورنر مقرر ہوئے، اچھل کر کہا: زید عثمان نے مدینہ کے نخلستانوں سے تمہارا پیٹ بھر دیا ہے[2] (اس لئے تم ان کی حمایت کرتے ہو) یا زید أشبعك عثمان من عضدان المدينة۔ رپورٹر بتاتے ہیں کہ ۴۵ھ میں جب زید بن ثابت کا انتقال ہوا تو ان کے گھر میں سونے چاندی کی سلوں کے ڈھیر لگے تھے جنہیں کلہاڑیوں سے کاٹا گیا، زر و سیم کے علاوہ ان کی جائداد اور نخلستانوں کی قیمت کا اندازہ پانچ لاکھ روپے کیا گیا ہے[3] خلف من الذهب والفضة ما كان يكسر بالفؤوس غير ما خلف من الأموال والضياع بقيمة مئة ألف دينار۔ حسب تصریح تاریخ خمیس قلمی ان کی صرف نقد میراث گیارہ لاکھ روپے کے مساوی تھی ترك زيد بن ثابت من الذهب والفضة ما كان يكسر بالفؤوس وما يبلغه مئة ألف وخمسون ألف دينار وسبعمئة ألف درهم۔

(۳) ہاشمی قریش۔

علی حیدر کے دور میں آسمان خلافت پر خانہ جنگیوں کے بادل چھائے رہے، جن کی سیاہ پرچھائیاں ہر عرب طبقہ کی طرح ہاشمی خاندان پر بھی پڑیں۔ علی حیدر نے خلافت کا عہدہ سنبھالا تو ایک طرف ہزاروں مسلمانوں کو طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام اور ام المومنین عائشہ اور دوسری طرف سینکڑوں شامی رسالوں کو امیر معاویہ کی قیادت میں مقتول خلیفہ کے خون کا انتقام لینے کے لئے تلوار بکف پایا۔ علی حیدر کی پونے پانچ سال خلافت میں مسلمانوں کے نزاع عصبیت اور خونریزی کا المناک ڈرامہ برابر جاری رہا اور امن و سکون سے محروم رہ گئے با حوصلہ ہاشمی اعزاز میں جو اسلامی صوبوں کی گورنری اور غیر اسلامی ممالک میں فتوحات کرکے اپنی اقتصادی عمارت بلند کرنا چاہتے تھے، چند سے زیادہ کی آرزوئیں پوری نہیں ہوئیں۔ علی حیدر نے اپنے پانچ اقارب کو

---

[1] انساب الاشراف ۵/۳۸ [2] ایضاً ۵/۷۸ [3] مسعودی (حاشیہ تاریخ کامل) ۵/۱۵۱

صوبائی گورنر مقرر کیا تھا۔ ان میں سے چار ان کے چچا عباس بن عبدالمطلب کے لڑکے تھے اور ایک محمد بن ابی بکر تھے جن کی پرورش اور تربیت ان کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ تمام بن عباس کو مدینہ، قثم بن عباس کو مکہ اور طائف کی گورنری ملی، عبیداللہ بن عباس کو یمن کی عبداللہ بن عباس کو بصرہ کی اور محمد بن ابی بکر کو مصر کی۔ یہ اقارب دو تین سال سے زیادہ اپنے عہدوں کے ثمرات سے بہرہ اندوز نہ ہو سکے۔ بس عبداللہ بن عباس علی حیدر کی خلافت کے آخر تک بصرہ کے گورنر رہے اور اپنے عہدے کے مادی فوائد سے بھی اچھی طرح متمتع ہوئے۔ ان کا نظریہ تھا کہ ہاشمی حاکم ذوی القربیٰ کا حصہ ذاتی خرچ میں لا سکتا ہے خواہ مال غنیمت کے خمس کا ہو یا زکات کے علاوہ دوسرے سرکاری محاصل کا۔ اس نظریہ کے مطابق بصرہ کے خزانہ سے ذوی القربیٰ کے حصے کے بقدر روپیہ وہ اور ان کے متعلقین اپنے صرف میں لاتے تھے[1] فلما صار الامر الی علی استعملہ (عبداللہ بن العباس) علی البصرۃ فاستحل الفئ علی تاویل قول اللہ: واعلموا انما غنمتم من شئ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربی والیتامی والمساکین وابن السبیل، و استحلہ لقرابتہ من رسول اللہ۔ بصرہ کے قاضی نے ایک بار عبداللہ بن عباس کی سرزنش پر مشتعل ہو کر بصرہ کے خزانہ میں ان کے ذاتی تصرفات کی شکایت علی حیدر کو لکھ بھیجی تو انھوں نے شاکی کا نام مخفی رکھ کر عبداللہ بن عباس کو شکایت سے مطلع کیا اور ان سے سرکاری روپیہ کا حساب مانگا۔ ابن عباس نے حساب نہیں دیا اور اپنے مختصر جواب میں شکایت کو بے بنیاد قرار دے کر خلیفہ کو اپنی دیانت داری کا اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ علی حیدر مطمئن نہیں ہوئے بلکہ ان کا شبہ اور زیادہ پختہ ہو گیا۔ انھوں نے ایک ملامت آمیز خط میں سختی سے خزانہ کی بازیافت اور خرچ کے حساب کا تقاضہ کیا، عبداللہ بن عباس چڑ گئے اور علی حیدر کو لکھا: مجھے معلوم ہوا کہ آپ اس خبر کو بڑی اہمیت دے رہے ہیں کہ میں اہل بصرہ کے محاصل کا کچھ حصہ خورد برد کر رہا ہوں قسم ہے خدا کی میری نظر میں یہ کہیں بہتر ہے کہ زمین کے اندر جو سونا اور جواہرات ہیں وہ مجھے مل جائیں اور اس کی سطح پر جو ٹیلے ہیں وہ سونے کے ہو جائیں اور میں ان سب سے متمتع ہوں بہ نسبت اس کے کہ حکومت وامارت کی خاطر عرب قوم کا خون بہا کر خدا کو منہ دکھاؤں۔ اپنے اس عہدہ پر جسے چاہیں بھیج دیں۔ میں جا رہا

---

[1] ابن عبد ربہ ۳/۱۳۰

ہوں[1]۔ انہ بلغنی تخطیک مرزأۃ مال بلغک أنی رزأتہ أھل ھذہ البلاد، وأیم اللہ لأن ألقی اللہ بما فی بطن ھذہ الأرض من عقیانھا ولجینھا وبما علی ظہرھا من طلاعھا ذہبا، أحب الی من أن ألقی اللہ وقد سفکت دماء ھذہ الأمۃ لأنال بذلک الملک والامرۃ۔ ابعث إلی عملک من أحببت فإنی ظاعن۔ یہ وہ وقت تھا جب علی حیدر پر ہر طرف سے حوادث وافکار کا ہجوم تھا۔ مصر انکے قبضہ سے نکل چکا تھا، فوج کا ایک حصہ باغی ہوکر خوارجہ کے نام سے ان کی مشرقی قلمرو میں لوٹ مار کر رہا تھا، ایک دوسرا حصہ ان کی جنگ کوشی اور امیر معاویہ کے ساتھ جنگ پر اصرار سے برگشتہ خاطر ہوکر ملیستان میں قسمت آزمائی کرنے چلا گیا تھا[2]۔ باقی فوج نافرمان ہوگئی تھی اور امیر معاویہ کے ساتھ جنگ کے لئے ان کی ساری اپیلیں سنی ان سنی کر رہی تھی۔ دوسری طرف ان کی گرتی ہوئی خلافت پر ہر طرف سے شامی رسالے ضربیں لگا رہے تھے۔ ان حالات میں ایک وفادار اور خیر اندیش بھائی کا کھونا جس کے زیر فرمان خلافت کا سب سے بڑا فوجی مرکز تھا، علی حیدر کے گھر والوں کو سخت خلاف مصلحت نظر آیا اور انھوں نے خلیفہ سے عبداللہ بن عباس کے نام ایک مصالحت آمیز خط لکھوا کر انہیں منالیا۔ اوائل ۴۱ھ میں امام حسن سے سمجھوتہ کرکے امیر معاویہ نے اپنی خلافت کا اعلان کیا تو ابن عباس بصرہ کے خزانہ سے ایک بڑی رقم لے کر جس کی مقدار تیس لاکھ روپے[3] (ستۃ آلاف ألف درھم) بتائی گئی ہے مکہ چلے گئے۔

علی حیدر کے زمانہ میں مرکزی خزانہ کی آمدنی بہت کم ہوگئی تھی۔ ماتحت صوبوں سے جن کے عظیم محاصل سے عثمانی خزانہ بھرپور رہتا تھا، شام، مصر اور شمالی افریقہ سے علوی خلافت کا تسلط اٹھ گیا تھا۔ آرمینیہ، آذربیجان، خراسان، سجستان اور مکران پر خلافت کی گرفت اتنی ڈھیلی ہوگئی تھی کہ وہاں سے یافت یا تو بند ہوگئی تھی یا برائے نام رہ گئی تھی۔ کوفہ کے مرکزی خزانہ کا دارومدار چار صوبوں پر تھا۔ فارس، عراق، جبال اور خوزستان۔ یہاں سے جو روپیہ (جزیہ) اور غلہ (زلگان) آتا وہ علی حیدر کے سول اور وسیع فوجی اخراجات

---

[1] ابن عبدربہ ۱۲۱/۳، طبری (لائڈن) ۳۴۵۴-۳۴۵۳/۱ [2] بلاذری ص۳۳۔

[3] ابن عبدربہ ۱۲۱/۳۔

کے لیے بمشکل کافی ہوتا تھا۔ شاید وہ اپنا گھریلو خرچ یا اس کا بیشتر حصہ بھی ذاتی آمدنی سے پورا کرتے تھے۔ خزانہ کی آمدنی اس حد تک کم ہو گئی تھی کہ انھوں نے خمس کی مد سے ذوی القربیٰ کا حصہ دینا بند کر دیا تھا۔ ان کے گھر والوں نے اس پر احتجاج کیا تو انھوں نے یہ عذر پیش کیا کہ معاویہ سے جنگ کی تیاری کے مصارف اس کی اجازت نہیں دیتے۔[1]

عثمانی دور میں علی حیدر، عباس بن عبدالمطلب اور جعفر بن ابی طالب کے ہاشمی خاندان اقتصادی ترقی کے میدان میں پیش پیش تھے۔ جائداد، باغبانی اور تجارت پر ان گھرانوں کی اقتصادی عمارت اٹھی تھی۔ فاروقی اور عثمانی دور میں یہ عمارت بڑھی اور پھیلی اور حیدری خلافت میں اس کی شان میں مزید اضافہ ہوا۔ متعدد ہاشمی اشخاص کو سرکاری خدمت کی راہ سے بھی اپنی مالی حیثیت بڑھانے کا موقع ملا۔ ان میں عباس بن عبدالمطلب کے چار لڑکوں کا (جو علی حیدر کے صوبائی گورنر تھے) اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ ان میں عبداللہ بن عباس جو سرکاری خمس سے ذوی القربیٰ کا حصہ ذاتی خرچ میں لاتے تھے۔ اقتصادی ترقی کے زینہ پر سب سے اوپر تھے۔ آثار و اخبار سے معلوم ہوتا ہے[2] کہ وہ پانچ سو روپے لاگت کی پوشاک پہنتے تھے[3] اور انہیں نیز علی حیدر کے بھتیجے اور داماد عبداللہ بن جعفر کو ہر سال امیر معاویہ کی طرف سے پانچ پانچ لاکھ روپے کا عطیہ ملتا تھا۔[4]

غلام اور موالی

مسلمان عربوں کی مادی خوش حالی کی بنیاد تین فریقوں کے ہاتھوں بلند ہوئی تھی (۱) مفتوحہ اقوام (۲) غلام اور (۳) موالی۔ مفتوحہ اقوام نے اس عمارت کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیا اس کا ذکر پچھلے اوراق میں ہو چکا ہے۔ اس فصل میں ہم بتائیں گے کہ غلام اور موالی نے اس کے بنانے میں کیا خدمت انجام دی۔ عربوں میں غلام رکھنے کا رواج بہت پرانا تھا۔ ان کے ہاٹوں اور موسمی بازاروں میں جزیرۂ عرب اور حبشہ وغیرہ سے غلام بکنے کے لئے آتے تھے۔ غلاموں کی قیمت کا دار و مدار ان کی شکل و صورت، رنگ، صحت اور صلاحیت پر ہوتا تھا۔ مہذب، سفید فام، خوبرو، ہنرمند

---

[1] شافعی ۴/۷۲، بیہقی ۶/۳۴۳ [2] تاریخ منتخام رازی قلمی۔

[3] رسائل جاحظ ص۸۔

اور پڑھے لکھے غلاموں کی قیمت زیادہ اٹھتی تھی۔ عرب بالعموم حبشی غلام خریدتے جو سستے ہوتے تھے۔ ایک حبشی غلام کی قیمت سو روپے (دو سو درہم) کے اندر اندر رہتی تھی۔ ابوبکر صدیقؓ نے اسلام سے پہلے اپنے حبشی غلام بلال کو پانچ اوقیہ یا لگ بھگ سو روپے میں خریدا تھا[1]۔ رسول اللہؐ کے منظور نظر پروردہ زید بن حارثہ جو ایک خوبرو جوان تھے بیوی خدیجہ کے لئے عکاظ کے بازار سے دو سو روپے (چار سو درہم) میں خریدے گئے تھے[2]۔ صحابی نعیم بن عبداللہ نے رسول اللہ کے حکم سے ایک پڑھے لکھے مہذب قبطی غلام کی قیمت چار سو روپے (آٹھ سو درہم) ادا کی تھی[3]۔

غلاموں سے مختلف قسم کے کام لئے جاتے تھے۔ گھریلو خدمت کے علاوہ نخلستانوں کی دیکھ بھال، کھیتوں کی کھدائی، بوائی، سینچائی اور نگرانی ان کے ذمہ تھی۔ تاجر پیشہ اور کاروباری عرب اپنے اپنے پیشوں میں غلاموں کی خدمت لیتے تھے۔ بہت سے لوگ مقررہ یومیہ ٹیکس کے بالمقابل غلاموں کو مزدوری اور کسب کے لئے بھی چھوڑ دیتے تھے۔ اگر غلام باہنر ہوتا جیسے بڑھئی یا لوہار تو اس سے یومیہ ٹیکس زیادہ وصول کیا جاتا تھا۔ زر مخلصی لے کر بھی غلام آزاد کرنے کا رواج تھا۔ غلام اور اس کے مالک کے درمیان ایک معاہدہ ہو جاتا جس کی رو سے ایک مقررہ رقم ادا کرنے پر جو زیادہ تر قسطوں میں لی جاتی، غلام آزاد ہو جاتا تھا۔ ایسے معاہدہ کا اصطلاحی نام مکاتبت تھا۔ مشہور صحابی سلمان فارسی نے اپنے یہودی آقا سے ایسا ہی معاہدہ کیا تھا جس کے تحت انہیں ایک سو ساٹھ اور بقول بعض چھ سو کھجور کی پود تیار کرنے اور آٹھ سو روپے (چالیس اوقیہ) ادا کرنے کے بعد آزادی مل گئی تھی[4]۔ کاروباری مالدار عرب کبھی غلام کی ایمانداری اور کارگذاری سے خوش ہو کر اور کبھی کسی باہنر، باشعور اور مخلص غلام کی صلاحیتوں سے اپنی تجارت یا کاروبار میں فائدہ اٹھانے کے لئے بلامعاوضہ آزاد کر دیتے تھے۔ بوڑھے اور دور از کار غلاموں کو بھی جو آقا پر بار ہوتے عام طور پر آزاد کر دیا جاتا تھا۔ آزاد کردہ غلام کو مولیٰ (تابع) کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا لیکن اس کی آزادی کے ساتھ بہت سی پابندیاں لگی ہوئی تھیں۔ عرب معاشرہ

---

[1] ابن سعد ۷/ ۱۱۳-۱۱۴ [2] ابن سعد ۳/ ۴۱، اصابہ ۱/ ۵۶۶ [3] کنز العمال ۱۰/ ۳۰۸

[4] بیہقی ۱۰/ ۳۲۲-

بمی مولیٰ آزاد عرب کا ہمسر نہیں ماتحت اور دوسرے درجہ کا شہری تھا۔ انہیں آزاد کنندہ کا تا حیات وفادار و مددگار رہنا اس کا سماجی فرض تھا۔ اس کی میراث میں اس کا آزاد کنندہ شریک ہوتا تھا لیکن آزاد کنندہ کی میراث سے مولیٰ کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔

غلاموں کی محنت سے فائدہ اٹھانے اور افزائش دولت کے کاموں میں ان سے خدمت لینے اور بامعاوضہ یا بلامعاوضہ آزاد کرنے کے سارے طریقے جس کا اوپر ذکر ہوا مع سماجی واجبات موالی کے اسلام میں برقرار رہے۔ سنہ ۲ھ کے بعد جوں جوں مسلمان عربوں کی مالی حالت بہتر ہوتی گئی غلاموں کو افزائش دولت کے کاموں میں استعمال اور معاوضہ لے کر آزاد کرنے (مکاتبت) کا کاروبار بڑھتا گیا۔ غلام خریدے بھی جاتے تھے اور غنیمت کی مد سے مفت بھی ملتے تھے۔ رسول اللہؐ نے انصار کی فالتو اراضی اور مدینہ سے نکالے ہوئے یہودیوں کے جو فارم، جائداد اور نخلستان مسلمانوں میں بانٹے ان کی اصلاح اور دیکھ بھال کرنے نیز پیداوار بڑھانے کی جدوجہد کرنے والے غلام اور موالی ہی تھے۔ فاروقی دور میں غلاموں کا استعمال بہت بڑھ گیا اور بعد کے ادوار میں مزید بڑھا۔ وجہ یہ تھی کہ فاروقی خلافت میں بڑے بڑے کئی ملک فتح ہوئے جہاں مسلمانوں نے منہزم دشمن کے ہزاروں مرد اور بال بچے غلام بنالئے تھے۔ فاروقی عہد میں دیوان العطاء کا ادارہ قائم ہوا جس نے غلاموں کے لئے مفت راشن مقرر کر کے آقاؤں کو غلاموں کی خوراک کے بار سے آزاد کر دیا۔ دیوان العطاء کی اس عظیم رعایت سے ان لوگوں کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی جو غلاموں کی تعداد بڑھا کر اپنی تجارت اور کاروبار کو فروغ دینے یا نخلستانوں اور کھیتوں کی پیداوار بڑھانے کا داعیہ رکھتے تھے۔ سنہ ۲۰ھ میں عمر فاروق نے حجاز کے یہودیوں کو فدک خیبر اور وادی القریٰ سے جلاوطن کر دیا۔ یہ لوگ اپنے ان علاقوں کی نصف پیداوار حکومت مدینہ کو دیا کرتے تھے اور باقی حق محنت کے طور پر اپنے خرچ میں لاتے تھے۔ یہودیوں کو نکالنے کے بعد عمر فاروق نے تینوں علاقوں کے نخلستانوں اور فارموں کی داخت پرداخت کے لئے غلام اور موالی مامور کر دیئے جو پڑوسی ملکوں کی فتوحات کے دوران بکثرت ہاتھ آگئے تھے۔ اس اقدام سے ان علاقوں کی نصف کی جگہ کل پیداوار مرکزی خزانہ یا ان لگ بھگ دو ہزار صحابیوں میں تقسیم ہونے لگی جنھوں نے نصف خیبر اور وادی القریٰ کو رسول اللہ کی قیادت میں بزور شمشیر فتح کیا تھا۔

تجارت، کاروبار، زراعت اور باغبانی کے میدانوں میں خدمت لے کر اقتصادی ترقی حاصل کرنے کے علاوہ بہت سے لوگ آمدنی بڑھانے کے لئے غلاموں سے ایک مقررہ ٹیکس کے بالمقابل محنت مزدوری کرایا کرتے تھے۔ ممتاز صحابہ میں جو لوگ غلاموں سے یومیہ ٹیکس وصول کرتے تھے۔ ان میں ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی اور زبیر بن عوام کے نام بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ سنن کبری میں ہے "کان لابی بکر غلام یخرج لہ الخراج وکان ابوبکر یأکل منہ" ابوبکر صدیق کا ایک غلام تھا جو (محنت مزدوری کر کے) یومیہ ٹیکس ادا کرتا تھا اور ابوبکر صدیق یہ ٹیکس اپنے خرچ میں لاتے تھے۔ زبیر بن عوام کے ایسے ایک ہزار غلام تھے جو یومیہ ٹیکس ادا کرتے تھے "کان للزبیر ألف مملوک یؤدون الیہ الخراج"۔ عمر فاروق کے گورنر کوفہ مغیرہ بن شعبہ نے اپنا ایک دستکار فارسی غلام جس کا نام فیروز ابو لؤلؤ تھا محنت مزدوری کے لئے مدینہ بھیج دیا تھا اور اس سے ڈیڑھ روپیہ اور بقول بعض دو روپے یومیہ ٹیکس وصول کرتے تھے۔ یہ وہی ابو لولو ہے جس نے اس ٹیکس سے اپنی گرانباری کی عمر فاروق سے شکایت کر کے مغیرہ بن شعبہ سے اس میں تخفیف کرانے کی درخواست کی تھی اور جب وہ سفارش کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے تو طیش میں آ کر ان پر قاتلانہ حملہ کر دیا تھا جس کے زیر اثر تین چار دن بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

غلاموں کے ذریعہ افزائش دولت کے اس کاروبار کو جس کا نام مکاتبت (آزادی بمقابل معاوضہ) تھا خلافت راشدہ میں خوب فروغ ہوا۔ زر خلاصی دے کر بالعموم وہ غلام آزادی لیتے جن کا تعلق اچھے مالدار اور تاجر گھرانوں سے ہوتا تھا۔ یہ لوگ غلامی کی خشونت، ذلت اور خواری سے نجات پانے کے لئے اپنے آقاؤں سے مالی معاہدے کر کے مکاتب بن جاتے اور آزادی کے بعد موالی کے طبقہ میں داخل ہو جاتے۔ جاہلی عرب معاشرہ کا ایک ضابطہ یہ تھا کہ آزادی خریدنے کے بعد موالی اپنے سابق آقا سے پوری طرح غیر متعلق نہیں ہو سکتا تھا۔ اور وقت ضرورت آقا کی مدد کرنا اس کے واجبات میں سے تھا، چاہے مدد تجارت اور کاروبار میں ہاتھ بٹانے یا کسی دشمن سے مقابلہ کرنے کی شکل میں ہوتی یا گھریلو کاموں سے اس کا تعلق ہوتا۔ دوسرا ضابطہ یہ تھا کہ اگر مکاتب زر کتابت کی آخری پائی ادا کرنے سے پہلے مر جاتا یا ہر قسط پوری پوری یا مقررہ میعاد پر ادا کرنے سے قاصر رہتا تو معاہدہ کالعدم ہو جاتا۔ یعنی مکاتب کو قسطوں کے حساب سے آزادی نہیں ملتی تھی اور وہ اور

اس کے بال بچے بدستور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے۔ رسول اللہ: جو شخص اپنے غلام سے دو ہزار روپے (سو اوقیہ) پر کتابت کا معاہدہ کرے اور غلام دو سو روپے (دس اوقیہ) دینے سے قاصر رہے تو وہ بدستور غلام رہے گا[1] ایما رجل کاتب غلامہ علی مئۃ اوقیۃ فعجز عن عشر اواق فھو رقیق۔ عمر فاروق، عثمان غنی، ام المؤمنین عائشہ اور زید بن ثابت: مکاتب غلام بنا رہیگا اگر آٹھ آنے (ایک درہم) بھی اس کے ذمہ باقی رہیں[2]۔ المکاتب عبد ما بقی علیہ درہم۔ عبداللہ بن عمر: مکاتب غلام رہے گا خواہ وہ جیتا رہے خواہ مرجائے خواہ پاگل ہوجائے اگر اس کے ذمہ کچھ بھی باقی ہے[3]۔ المکاتب عبد إن عاش وان مات وإن جن ما بقی علیہ شئ۔ مجاہد (بن جبیر)، امہات مومنین (رسول اللہ کی بیویاں) مکاتب سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ اگر اس پر ایک مثقال یا ایک دینار زرِ کتابت باقی رہ جاتا تھا[4] کانت امھات المومنین لا یحتجبن عن المکاتب ما بقی علیہ مثقال أو دینار۔ قتادہ (بن دعامہ) نے عمر فاروق کی سند پر: اگر مکاتب مرجائے اور مال و متاع چھوڑے تو اس کا مالک آقا یا اس کے وارث ہوں گے اور مکاتب کے وارثوں کو کچھ نہیں ملے گا[5]۔ اذا مات المکاتب وترک مالا فھو لمولاہ ولیس لورثتہ شئ۔ علی حیدر: اگر مکاتب پر دو قسطیں چڑھ جائیں اور وہ ان کی ادائیگی سے قاصر رہے تو (معاہدہ منسوخ) اور وہ جوں کا توں غلام بنا رہے گا[6]۔ إذا تتابع علی المکاتب نجمان فلم یؤد نجومہ رُدَّ الرق۔ عطاء بن ابی رباح: عبداللہ بن عمر نے ایک غلام کو مکاتب بنایا تو اس نے ساڑھے چار ہزار روپے (نو سو دینار) ادا کردیئے۔ اور اس کے ذمہ پانچ سو روپے (سو دینار) رہ گئے جو وہ ادا نہ کرسکا تو ابن عمر نے (اس کا معاہدہ منسوخ کرکے)

---

[1] بیہقی ۱۰/۳۲۴ [2] موطا ص ۲۳۱، شافعی ۷/۳۸۲، زیلعی ۴/۱۴۴-۱۴۵، بیہقی ۱۰/۳۲۴

[3] موطا بیہقی ۱۰/۳۲۵ [4] یعنی اُن پر آزاد مرد سے پردہ کرنا واجب تھا اور چونکہ ان کی رائے میں آخری مثقال یا دینار ادا کرنے سے پہلے مکاتب غلام بنا رہتا تھا وہ اس کے سامنے آتیں اور پردہ نہیں کرتی تھیں۔

[5] بیہقی ۱۰/۳۳۲

[6] بیہقی ۱۰/۳۴۲ و زیلعی ۴/۱۴۶

اسے حسب سابق غلام بنائے رکھا۔[۱] ان ابن عمر کاتب مکاتبا فأدی تسعمئة وبقی مئة دینار فعجز فرده فی الرق۔ نافع (ابو عبداللہ مدنی): عبداللہ بن عمر کا ایک مکاتب تھا جس کا کنیز کے بطن سے ایک لڑکا تھا، اس نے کتابت کے ساڑھے سات ہزار روپے (پندرہ ہزار درہم ادا کر دیئے تھے۔ اس کے بعد وہ مر گیا تو ابن عمر نے اس کا سارا مال ومتاع لے لیا اس کے بچے کو کچھ نہیں دیا بلکہ اسے غلام بنا لیا اور اس کے روپے پیسے پر خود قابض ہو گئے۔[۲]

جاہلی عہد کے یہ غیر مکتوب ضابطے قاعدے اسلام کے بعد بھی برقرار رہے۔ ان کی خلاف ورزی شاذ ونادر ہی کی جاتی تھی۔ عام طور پر مالک زر خلصی کی رقم یکمشت لینے سے گریز کرتے تھے۔ اور سالانہ یا چھ ماہی قسطوں ہی پر اصرار کرتے تھے تاکہ مکاتب فراہمی زر کی تگ ودو اور مشقت کے دوران کل زر مکاتبت ادا کرنے سے پہلے مر جائے جیسا کہ ہوتا رہتا تھا اور قسطوں کے ساتھ اس کی میراث پر بھی آقا قابض ہو جائے۔ امام شافعی: انس بن مالک (رسول اللہ کے دس سالہ خادم) کا ایک مکاتب عمر فاروق کے پاس آیا اور بولا کہ میں نے زر کتابت انس بن مالک کو یکمشت پیش کیا تو انھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ عمر فاروق نے کہا: بات یہ ہے کہ انس تمہارے وارث بننا چاہتے ہیں۔[۲] روی عن عمر بن الخطاب ان مکاتبا لانس جاءه وقال: إنی آتیت بمکاتبتی الی انس فأبی أن یقبلها فقال عمر: ان أنسا یرید المیراث۔ نقد قسطوں کے ساتھ کبھی مالک دوسری چیزیں مثلاً غلام، کنیز، بکری، اونٹ یا خدمت بھی اپنے مکاتب پر لازم کر دیتے تھے۔ کبھی کتابت سے نقد روپیہ بالکل خارج ہوتا اور معاہدہ میں کسی قسم کا سامان، مال، متاع یا محض غلام داخل ہوتے نافع (ابو عبداللہ مدنی): ام المومنین حفصہ بنت عمر فاروق نے ایک غلام کو متعدد غلاموں کے بالمقابل مکاتب بنایا جن میں سے تین حبشی تھے۔[۳]

کتابت کے خط وخال اور اسکے اقتصادی منافع کو زیادہ واضح کرنے کیلئے ہم یہاں کی چند مثالیں عربی اخبار وآثار سے پیش کرتے ہیں:

---

[۱] بیہقی ۱۰/۳۴۱ [۲] ام ۷/۳۹۰ [۳] بیہقی ۱۰/۳۳۴ - ۳۳۵

(۱) ابوسعید: مجھے بنولیث کی ایک عورت نے ذوالمجاز کے بازار سے ساڑھے تین سو روپے (سات سو درہم) میں خریدا۔ مدینہ آکر اس نے بیس ہزار روپے (چالیس ہزار درہم) میں مجھے مکاتب بنالیا۔ اس رقم کا بیشتر حصہ میں نے ادا کردیا۔ باقی لے کر عورت کے پاس گیا تو اس نے لینے سے انکار کیا اور بولی: میں نہیں لیتی، کتابت کی رقم تمہیں ماہ بماہ اور سال بسال ادا کرنی ہوگی۔ میں نے جا کر عمر فاروق سے شکایت کی تو انھوں نے کہا: زر کتابت خزانہ میں جمع کردو۔ پھر اس عورت کو بلا کر کہا: ابوسعید آزاد ہوچکا۔ تمہارا روپیہ خزانہ میں ہے، لے لو خواہ ماہانہ قسطوں میں خواہ سالانہ قسطوں میں۔ عورت سب روپیہ یکمشت لے گئی[1]۔

(۲) فقیہہ بصرہ: انس کے والد سیرین[2]: (رسول اللہ کا دس سالہ خادم) انس بن مالک نے مجھ پر دس ہزار روپے (بیس ہزار درہم) پر کتابت کی۔ میں اس فوج میں (بطور غلام تھا) جو (خوزستان کے قلعہ بند شہر) تُستَر کا محاصرہ کئے ہوئے تھی۔ میں نے کپڑا خریدا اور اسے نفع سے بیچ کر انس بن مالک کو زر کتابت پیش کیا تو انھوں نے لینے سے انکار کردیا اور بولے: میں یکمشت نہیں لوں گا، مجھے قسطوں میں چاہئے۔ (مدینہ جا کر) میں نے عمر فاروق سے شکایت کی۔ انھوں نے کہا: اچھا تم وہ ہو۔ عمر پہلے مجھے کپڑا بیچتے دیکھ چکے تھے اور تجارت میں میرے لئے برکت کی دعا کی تھی۔ میں نے کہا: جی ہاں میں وہی ہوں۔ عمر فاروق: انس تمہارے وارث بننا چاہتے ہیں (اس لئے قسطوں کی شرط لگائی ہے کہ تم ان کی ادائیگی کے دوران مرجاؤ اور وہ تمہاری میراث پر قبضہ کرلیں) عمر فاروق نے انس کو (جو بصرہ میں بس گئے تھے) خط لکھا کہ زر کتابت یکمشت لے لو، مجبوراً ان کو لینا پڑی[3] کاتبنی انس بن مالک علی عشرین الفا فکنت فی مَن[4] فتح

---

[1] ابن سعد ۷/۱۲۰ کنز العمال ۵/۲۵۵

[2] سیرین ایک عیسائی راہب تھا جسے خالد بن ولید نے ۱۲ھ میں عین التمر (عراق) کے ایک گرجا سے دوسرے انتالیس راہبوں کے ساتھ پکڑ کر غلام بنالیا تھا (طبری لائڈن) ص ۲۰۶۴

[3] ص ۳۴۴ [4] فی الاصل: مفتح۔

لستو خاشتریت ببزۃ[1] ضربحت فیھا فالقیت انس بن مالک بکتابتہ فأبی أن یقبلھا منی الانجما فأتیت عمر فذکرت لہ فقال انت ھو وقد کان رأنی ومعی أثواب فدعا لی بالبرکۃ، قلت نعم، فقال : أراد أنس المیراث ثم کتب إلی أنس أن اقبلھا من الرجل فقبلھا ۔

(۳) محمد بن سیرین : سیرین نے انس بن مالک سے کتابت کی درخواست کی تو انھوں نے مکاتب بنانے سے انکار کر دیا۔ سیرین نے پوچھا : آپ کیوں انکار کر رہے ہیں۔ انس بولے : میں چاہتا ہوں کہ جب تم مرو تو تمہاری میراث مجھے ملے۔ سیرین نے (مدینہ جاکر) عمر فاروق سے اس بات کی شکایت کی تو انھوں نے انس بن مالک کو حکم دیا کہ سیرین کو مکاتب بنالیں، (اس حکم کے ماتحت) انس نے بیس ہزار روپے (چالیس ہزار درہم) میں سیرین کو مکاتب بنالیا۔ اراد سیرین المکاتبۃ فأبی أنس، فقال لہ : ما ینحلک؟ قال : أردت أن تموت فأرثک، فأتی سیرین عمر فقال : إنی أردت أنسا علی المکاتبۃ فأبی، فأمرہ عمر فکاتبہ علی أربعین ألفا۔

(۴) عثمان غنی کا ایک غلام : عثمان غنی نے مجھے ایک تجارتی مہم پر بھیجا اور جب میں واپس آیا تو انھوں نے میری کارگذاری کو سراہا۔ ایک دن میں ان کے سامنے آکر کھڑا ہوا اور بولا : امیر المومنین مجھے مکاتب بنا لیجیے۔ یہ سن کر ان کے تیور بدل گئے اس کے باوجود انھوں نے کہا : اچھی بات ہے۔ اگر قرآن میں مکاتب بنانے کی سفارش نہ کی گئی ہوتی[2] تو تمہاری درخواست قبول نہ کرتا۔ میں پچاس ہزار روپے (ألف مئۃ درھم) زر کتابت لونگا جو دو قسطوں میں تمہیں ادا کرنی ہوگی۔ اور اس میں سے ایک درہم (آٹھ آنے) کم نہیں کروں گا[3]۔ بعثنی عثمان رض فی تجارۃ فقدمت علیہ فأحمد ولایتی، فقمت بین یدیہ ذات یوم فقلت : یا امیر المؤمنین اسالک الکتابۃ فقطب ثم قال نعم : ولولا آیۃ فی کتاب اللہ ما فعلت، أکاتبک علی مئۃ ألف علی أن تعدھا لی فی عدتین واللہ لا أغضک منھا درھما۔

---

[1] اصل میں رثۃ (کاٹھ کباڑ) اور کنز میں رمۃ (پرانی رسی) ہے۔ ہماری رائے میں رثہ اور رمہ بزہ کی تحریف ہے۔ [2] والذین یبتغون الکتاب مما ملکت أیمانکم فکاتبوھم إن علمتم فیھم خیرا کی طرف اشارہ ہے۔ [3] بیہقی ۱۰/۳۲۰ کنز العمال ۵/۲۲۵۔

کیا حجاز مقدس میں رویت ہلال کا اہتمام ہوتا ہے

از جناب حاجی احسان الحق صاحب بجنوری ایم ایس سی علیگ. سابق لکچرر طبعیات (فزکس)
(مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ)

صدق جدید مورخہ ۹ جنوری ۷۰ء میں مندرجہ ذیل خبر نظر سے گذری:-

"مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابو الحسن علی نے ۱۳۸۹ھ کے رمضان شریف کا پہلا روزہ حجاز میں پیر کے دن رکھا اور پندرہ دن کے بعد ہندوستان لوٹ آئے اور ہندوستان میں چونکہ پہلا روزہ بدھ کو ہوا تھا اس لئے یہاں بدھ کو ۲۹ ہوئی اور اسی دن رویت بھی ہوئی۔ چنانچہ جمعرات کو پہلی شوال اور عید ہوئی۔ اس کے برخلاف حجاز میں ۲۹ رمضان پیر کے دن ہوئی اور اسی دن رویت بھی ہوئی۔ دوسرے روز یعنی منگل کو یکم شوال قرار پائی اور عید منائی گئی۔ اس حساب سے ان دونوں حضرات نے جو بدھ کا روزہ ہندوستان میں رکھا وہ حجاز مقدس کے حساب سے ۳۱واں روزہ تھا۔ اس نوٹ میں آگے چل کر اختلاف مطالع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ایک دو دن کا فرق .... اور اس سے زیادہ کا فرق ہو سکتا ہے بلکہ لازم ہے۔"

مذکورہ بالا دونوں صاحبوں نے ۳۱ روزے رکھے شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں؟

یہ بتانا علماء کرام کا کام ہے البتہ اس سلسلہ میں ایک دو دن اور اس سے زیادہ کے فرق کی جو بات کہی گئی ہے اس پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

میری گذارش یہ ہے کہ ایک دن سے زیادہ کا فرق ہو ہی نہیں سکتا اور پھر ہندوستان اور حجاز کے درمیان ایک دن کا بھی فرق بہت ہی کم ہوگا کیوں کہ یہ دونوں ملک بہت قریب ہیں۔ اصل یہ ہے کہ القمر الجدید

یعنی قمر غیر مرئی وہ لمحہ ہے جب تقویم شمس و قمر دونوں ایک ہوں۔ اس کا تعلق زمین کے مرکز سے ہے اور مختلف مقامات
میں قمر جدید کا وقت معلوم کرنے کے لئے صرف طول البلد کے فرق سے کام لیا جاتا ہے۔ قمر غیر مرئی کم سے کم بیس (۲۰) گھنٹے
کے بعد تحت الشعاع کی وجہ سے قمر مرئی ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ ۲۶ گھنٹہ اور اس دفعہ تو رمضان شریف
۱۳۹۰ھ کا چاند ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۰ء باوجود ۲۹ گھنٹہ ۲۵ منٹ گذرنے کے بعد صریحاً اس قابل نہیں ہوا کہ
وسط ہندوستان میں دکھائی دے۔ اگرچہ سہسوان میں دیکھا گیا اور وہاں پہلا روزہ اتوار کو ہوا اور
ہندوستان میں دو تین جگہ۔ اور ہوا اصل میں چاند کا معاملہ بہت مشکل ہے۔

رویت کے معاملہ میں طول البلد اور عرض البلد۔ میلان شمس۔ میلان قمر۔ وقت نصف النہار شمسی
وقت نصف النہار قمری معلوم ہونے کے بعد غروب شمس کے وقت، ارتفاع قمر اور افق کی وہ قوس جو نقطۂ
غروب شمس اور نقطۂ غروب قمر کے درمیان معلوم کی جاتی ہے اور ایک ضابطہ کے ماتحت پھر بتایا جاسکتا
ہے کہ چاند ہوگا یا نہیں۔ موٹے حساب سے کم سے کم بیس گھنٹے چاند کی عمر ہو تو دکھائی دیجاتا ہے بعض دفعہ اس
سے زیادہ عمر یعنی ۲۶ گھنٹہ تک بھی دکھائی نہیں دیتا ہے۔

بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ چاند جب چالیس (۴۰) منٹ سورج سے بعد غروب ہو تو دکھائی دے جاتا ہے
لیکن یہ بھی مقدار کم سے کم ہے۔ میں نے اس معاملہ کو اوجین کی رصدگاہ کے بڑے افسر کو لکھا تو انھوں نے
۴۸ منٹ لکھے۔ لیکن ۱۵ر جولائی ۱۹۶۹ء بھارت کے معیاری مقام پر چاند اور سورج کے غروب میں ۴۸
منٹ کا فرق تھا مگر چاند اس حد پر نہیں تھا کہ دکھائی دے سکے۔ یہ بھی بہت مشہور ہے کہ اگر دوج ہو جائے
تو رویت ہوگی لیکن ایسا بھی ہے کہ دوج ہو گئی چاند نہیں ہوا۔ اور ایسا بھی ہوا کہ دوج نہیں ہوئی لیکن چاند
ہو گیا۔ ایسا بھی ہوا کہ القمر الجدید ہو گیا لیکن سورج سے پہلے غروب ہو گیا۔ اس پر میرا مضمون مدینہ
۲۱ر اکتوبر ۱۹۷۰ء میں چھپا اور وہ تاریخیں بھی دی ہیں جن میں ایسا ہوا۔ یہی مضمون "الجمعیۃ" اور سیاست
میں بھی اسی زمانہ میں چھپا ہے۔

عام طور پر جس دن القمر الجدید ہوگا اس سے اگلے دن رویت ہوگی اور اس سے اگلے دن یکم
ہوگی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ چاند اگلے دن دکھائی نہیں دیتا بلکہ اس سے اگلے دن دکھائی

دیتا ہے۔ مثلاً قمر جدید پیر کو ہوا ہے اور رویت منگل کو ہوگی اور یکم بدھ کو ہوگی اور بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ قمر جدید پیر کو ہوا منگل کو چاند دکھائی دینے کے قابل نہ ہوا اور بدھ کے دن دکھائی دیا اور یکم جمعرات کو ہوئی۔

جدول (۱) پس منظر بلحاظ فن ہئیت

وقت مقامی اوسط مکہ مکرمہ

نمبر شمار	ہجری	عیسوی	بروز	وقت القمر الجدید	وقت زوال	وقت غروب شمس	رویت کب ہوگی	یکم کب ہوگی
۱	رمضان ۱۳۸۹ھ کا چاند	۱۰ر نومبر ۱۹۶۹ء	پیر	گھنٹہ منٹ رات کے ۱۲ بجکر ۵۴ منٹ	گھنٹہ منٹ ۱۱ بجکر ۴۴ منٹ	گھنٹہ منٹ ۵ بجکر ۲۰ منٹ شام	۱۱ر نومبر ۱۹۶۹ء کو ہوگی	۱۲ر نومبر ۱۹۶۹ء ہوگی
۲	شوال ۱۳۸۹ھ کا چاند	۹ر دسمبر ۱۹۶۹ء	منگل	۱۲ بج کر ۴۴ منٹ دوپہر	۱۱ بج کر ۵۲ منٹ	۵ بج کر ۱۸ منٹ شام	۱۰ر دسمبر ۱۹۶۹ء کو ہوگی	۱۱ر دسمبر ۱۹۶۹ء کو ہوگی
۳	ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ کا چاند	۶ر فروری ۱۹۷۰ء	جمعہ	۹ بجکر ۵۸ منٹ صبح	۱۲ بج کر ۱۴ منٹ	۵ بجکر ۵۳ منٹ شام	۷ر فروری ۱۹۷۰ء کو ہوگی	۸ر فروری ۱۹۷۰ء کو ہوگی

نوٹ:- اس لئے ۹ر ذی الحجہ ۱۶ر فروری کو ہوئی یعنی حج پیر کے دن ہوا۔

۴	ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ کا چاند	۱۲ر اپریل ۱۹۶۵ء	جمعہ	رات کے ۲ بجکر ۲ منٹ	۱۲ بج کر ۴ منٹ دوپہر	۶ بجکر ۱۶ منٹ شام	۱۳ر اپریل ۱۹۶۵ء کو ہوگی	۱۴ر اپریل ۱۹۶۵ء کو ہوگی
۵	محرم ۱۳۸۵ھ کا چاند	۱ر مئی ۱۹۶۵ء	سنیچر	دوپہر ۲ بج کر ۲۷ منٹ	۱۱ بج کر ۵۰ منٹ دوپہر	۶ بجکر ۴۶ منٹ شام	۲ر مئی ۱۹۶۵ء کو ہوگی	۳ر مئی ۱۹۶۵ء کو ہوگی
نوٹ:- لیکن یکم محرم یکم مئی کو ہوئی اور ذی الحج ۲۰ دن کا مانا گیا۔								
۶	ذی الحج ۱۳۸۵ھ کا چاند	۲۲ر مارچ ۱۹۶۶ء	منگل	۷ بج کر ۲۷ منٹ صبح	۱۲ بجکر ۷ منٹ دوپہر	۶ بجکر ۱۱ منٹ شام	۲۳ر مارچ ۱۹۶۶ء کو ہوگی	۲۴ر مارچ ۱۹۶۶ء کو ہوگی

نوٹ:- اس لئے ۹ ذی الحج یعنی حج یکم اپریل ۱۹۶۶ء بروز جمعہ کو ہونا چاہئے تھا لیکن حج بدھ کو ہوا اور ٹیونس والوں نے اور بوہرہ حضرات نے جمعرات کو کیا۔

حجاز کی جنتری اور رویت کے متعلق

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے فرمایا کہ تین مہینوں کا چاند یعنی رمضان شریف عیدالفطر اور ذی الحج کا دیکھا جاتا ہے اور باقی نو مہینوں کی یکم بذریعہ جنتری طے ہوتی ہے۔ یہی بات میرے ایک دوست ڈاکٹر محمد لٰسین پروفیسر طبعیات، ریاض یونیورسٹی نے لکھی ہے میں مولینا محمد منظور نعمانی صاحب کا شکرگذار ہوں کہ انھوں نے مجھ کو تقویم ام القری ۱۳۸۶ھ ارسال

فرمائی۔

جدول (۲) از جنتری ام القریٰ ۱۳۸۸ھ اور اسلامی محمدی بڑی تقویم بمبئی ۱۳۸۸ھ

	نقل از ام القریٰ ۱۳۸۸ھ	وقت مقامی اوسط بمکہ مکرمہ	یکم سنّی در ہندوستان	یکم مصری	از اسلامی محمدی بڑی تقویم بمبئی ۱۳۸۸ھ
		گھنٹہ - منٹ			
۱	یکم محرم ۲۹ بروز سنیچر ۳۰ مارچ سنہ ۶۸ء	۲۹ مارچ سنہ ۶۸ء ۱ - ۲۹	اتوار	جمعہ	سن مصری
۲	" صفر ۳۰ " اتوار ۲۸ اپریل "	۲۷ اپریل " ۱۸ - ۲	منگل	اتوار	اور بوہرہ حضرات
۳	" ربیع(۱) ۳۰ " منگل ۲۸ مئی "	۲۷ مئی " ۱۰ - ۱۱	بدھ	پیر	کی تاریخوں میں
۴	" ربیع(۲) ۲۹ " جمعرات ۲۷ جون "	۲۶ جون " ۳ - ۶	جمعہ	بدھ	کافی موافقت
۵	" جماد(۱) ۳۰ " جمعہ ۲۶ جولائی "	۲۵ جولائی " ۱۲ - ۳۰	سنیچر	جمعرات	ہے لیکن بعض جگہ
۶	" جماد(۲) ۲۹ " اتوار ۲۵ اگست "	۲۵ اگست " ۲ - ۳۸	پیر	سنیچر	فرق بھی ہوتا ہے
۷	" رجب ۳۰ " پیر ۲۳ ستمبر "	۲۲ ستمبر " ۱۲ - ۴۹	منگل	اتوار	اور ان میں محرم
۸	" شعبان ۲۹ " بدھ ۲۳ اکتوبر "	۲۲ اکتوبر " ۰ - ۲۵	جمعرات	منگل	۳۰ دن کا صفر
۹	" رمضان ۳۰ " جمعرات ۲۱ نومبر "	۲۰ نومبر " ۱۰ - ۴۳	جمعہ	بدھ	۲۹ دن کا ۔
۱۰	" شوال ۲۹ " سنیچر ۲۱ دسمبر "	۱۹ دسمبر " ۲۱ - ۰	اتوار	جمعہ	اسطرح سے ۳۰ ۔
۱۱	" ذیقعدہ ۳۰ " اتوار ۱۹ جنوری سنہ ۶۹ء	۱۸ جنوری سنہ ۶۹ء ۷ - ۴۰	پیر	سنیچر	۲۹ چلتا ہے اور
۱۲	" ذی الحجہ " منگل ۱۸ فروری سنہ ۶۹ء	۱۷ فروری سنہ ۶۹ء ۱۹ - ۲	بدھ	پیر	ذی الحجہ کو بعض دفعہ ۳۰ دن کا کر دیتے ہیں

مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب کا شکر گذار ہوں کہ ایک دیدہ زیب جنتری المجلس الاعلیٰ

للشئون الاسلامیہ کی عنایت فرمائی۔ ۱۳۸۵ھ مطابق ۶۶-۱۹۶۵ء

(۱) اس جنتری میں ۳۰ رمضان بروز جمعہ ۲۱ جنوری ۱۹۶۵ء دی ہوئی ہے۔

(۲) ۳۰ رمضان کے آگے والا خانہ خالی ہے اور یکم شوال بروز اتوار ۲۳ جنوری کی دی ہوئی ہے۔

(۳) ۲۹ شوال بروز اتوار ۲۰ فروری کو دی ہوئی ہے اور پھر بعد کو ۳۰ بھی دی ہوئی ہے لیکن اس کے سامنے خانہ خالی ہے اور فروری کی کوئی تاریخ نہیں دی ہے۔

(۴) یکم ذیقعدہ۔ بروز پیر ۲۱ فروری دی ہوئی ہے۔

نوٹ:۔ (۱) کیا رمضان شریف ۳۱ دن کا ہوا۔

(۲) اگر جمعہ کو عید ہوئی تو شوال ۳۲ دن کا ہوا اور اگر عید سنیچر کی ہوئی تو شوال ۳۱ دن کا ہوا بعض نے فرمایا کہ عید جمعہ کو ہوئی اور بعض نے فرمایا کہ عید سنیچر کی ہوئی۔

(۳) ذوالقعدہ کا چاند نہیں دیکھا جاتا جنتری سے حساب لگاتے ہیں جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا

(۴) چونکہ ذوالقعدہ کا چاند نہیں دیکھا جاتا اس لئے شوال ۳۱ دن کا ہوا یا ۳۲ دن کا ہوا۔

(۵) یہ ناموافقت محض اس وجہ سے ہے کہ نو مہینہ تو جنتری کے حساب سے چلتے ہیں اور تین مہینہ (رمضان۔ شوال۔ ذی الحج) کے لئے چاند دیکھا جاتا ہے۔

(۶) چاند دیکھے جانے اور شہادتوں کے متعلق میں عنقریب عرض کروں گا۔

کچھ واقعات اور امور متعلقہ

مجھ کو معلوم ہوا کہ مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور نے کچھ اصحاب کو مدینہ طیبہ میں ۲۹ رمضان شریف (۱۳۸۹ھ) بروز پیر باہر کھلی جگہ (۸ دسمبر ۶۹ء) طلوع آفتاب سے بہت پہلے بھیجا تاکہ یہ معلوم ہو کہ چاند صبح کے وقت دکھائی دیا یا نہیں۔ انھوں نے آکر جواب دیا کہ چاند دیکھا گیا تو مولانا صاحب نے جائے اعتکاف میں مجھے فرمایا کہ رمضان شریف کا ایک دن اور باقی ہے۔ مگر مغرب کے بعد حکومت کا اعلان ہوا کہ رویت ہوگئی اور کل (۹ دسمبر ۶۹ء) یعنی منگل کو عید الفطر ہے میں اس کو دریافت کرنے کے لئے سہارن پور مولانا صاحب ممدوح سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا اور ان سے اس واقعہ کو دریافت کیا۔ انھوں فرمایا کہ بالکل ایسے ہی تھا۔

یعنی پیر کی صبح کے وقت چاند دیکھا گیا اور مغرب کے بعد حکومت کی طرف سے رویت کا اعلان ہوا۔ اور عید منگل کو ہوئی۔

اب میری گذارش یہ ہے کہ (۱) پہلے تو صاحب بصیرت کے لئے یہ بات ناقابل یقین ہے کہ چاند صبح کے وقت دیکھا جائے اور شام کو رویت بھی ہو جائے۔ بعض اصحاب کہیں گے کہ صبح کے وقت مدینہ طیبہ میں چاند دیکھا گیا لیکن اعلان حکومت مکہ مکرمہ سے تعلق رکھتا ہے اس لئے دو جگہ کا مقابلہ ہے مگر مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ شمال میں ہے یعنی دونوں ایک ہی طول البلد پر تقریباً ہیں اور عرض البلد میں بھی قریب چار درجہ کا فرق ہے۔ اس لئے ایسا ہونا بہت ہی دور از قیاس ہے۔ دیکھئے جدول (۱) شوال کا القمر الجدید مکہ مکرمہ میں منگل کے دن دوپہر کے بعد ۱۲ بجکر ۲۳ منٹ پر (وقت مقامی اوسط مکہ مکرمہ) ہو رہا ہے اس لئے منگل کی شام کو دکھائی نہیں دے گا۔ بلکہ بدھ کی شام کو رویت ہوگی لیکن یہاں پیر کی شام کو رویت ہوئی یعنی القمر الجدید کے ظہور سے پہلے یہ ناممکن ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ مکرمہ عید کا چاند ریاض یا نجد یا قریب وجوار میں دیکھا جائے تو بھی پیر کی شام کو نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔

(۲) ذی الحجہ کی رویت مکہ مکرمہ کے لحاظ سے سنیچر کی شام کو ہوئی اور اتوار کی پہلی ذی الحجہ ہوئی۔ اس لئے ۵ رذی الحجہ یعنی حج پیر کے دن ہوا۔ دیکھیے جدول (۱) ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ کا القمر الجدید جمعہ کو ۹ بج کر ۴۰ منٹ صبح کے وقت ہو رہا ہے اور وہ جمعہ کی شام کو دکھائی نہیں دے گا۔ بلکہ سنیچر کی شام کو دکھائی دے گا۔ اور اتوار کی پہلی ہوئی اور حج پیر کو ہوا جو بالکل صحیح ہوا مبارک ہو وہ حجاج جنھوں نے اس سال (۷۰ء) میں حج کیا۔

اس معاملہ میں مولانا علی میاں ندوی کا مشکور رہوں کہ انھوں نے اس معاملہ کو میرے (اکتوبر ۶۶ء) لکھنے پر مکہ مکرمہ میں چھیڑا۔ پہلے تو دو دن کا فرق ہند اور حجاز میں حج کی تاریخ میں ہوا کرتا تھا جیسے اس دفعہ رمضان اور شوال کے چاند میں ہوا۔ ۶۹ء کے حج میں ایک دن کا فرق ہوا اور اس دفعہ ۷۰ء میں ہند اور حجاز دونوں کی یکم ذی الحجہ اتوار کو ہوئی۔

حدیث شریف کے خلاف | محبان حجاز تو بہت عرصہ سے کہہ رہے ہیں کہ حجاز میں تاریخیں رویت کے لحاظ سے

نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن دلدادگان حجاز اس بات پر زور دیتے ہیں کہ شہادت کے ذریعہ سے تاریخیں مقرر کی جاتی ہیں اور اب معلوم ہوا کہ تین مہینوں کے لئے (رمضان۔ عید اور حج) شہادتیں لی جاتی ہیں لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ یکم شوال منگل کی بذریعہ رویت ہوئی۔ اور یکم ذی الحجہ اتوار کی بذریعہ رویت ہوئی۔ اس درمیان میں دو چاند ہوئے ایک تیس کا اور دوسرا اکتیس کا۔ یہ اس حدیث کے خلاف ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ مہینہ ۲۹ کا یا ۳۰ کا ہوتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شہادتیں ہوتی بھی ہیں تو اعتبار کے قابل نہیں ہوتیں۔ ایسا معاملہ اعجاز کے طور پر ایک دفعہ ہو جائے لیکن بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ہند اور حجاز میں دو دن کا فرق کا ہوتا ہے۔ میں نے دس سے زیادہ چاند ایسے معلوم کئے ہیں جن میں رویت قبل از ظہور یعنی القمر الجدید سے پہلے ہو گئی ہے۔

میرے ایک پرانے دوست نے میرے برہان اپریل ۱۹۷۳ء کے مضمون کے خلاف ایک رسالہ لکھا۔ اس میں ایک خط نائب رئیس جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا پیش کیا گیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "تمام مملکت سعودیہ میں دخول و خروج ماہ میں صرف رویت محققہ کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اس میں جنتری سے ۹ مہینوں کا ذکر نہیں ہے۔ دوسری بات جو اس معاملہ میں ایک ایڈوکیٹ الہ آباد نے فرمائی وہ یہ ہے کہ "مصر کی حکومت کی مخالفت کی وجہ سے حجاز کی حکومت کے خلاف اس چاند کے قصہ کو اٹھا کر خوب پروپگنڈہ کرتی ہے" (مگر ان کے وہاں بھی ایسا ہی ہے)

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ دیکھئے جدول (۲) جس میں مصری سن کی تاریخ ہندوستان سے دو دن پہلے ہے اور اس میں مہینے ۳۰-۲۹ کے ہوتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مصر والے بھی کسی اور طریقہ پر تاریخ مقرر کرتے ہیں۔

اگرچہ اس دفعہ اتفاقاً ہندوستان کی تاریخوں میں بھی ایسا ہی ہے کہ ایک مہینہ ۳۰ دن کا اور دوسرا ۲۹ دن کا ہے۔ ہندوستان میں بعض کئی چاند ۳۰ کے ہو جاتے ہیں اور بعض کئی چاند ۲۹ کے ہو جاتے ہیں اور محرم بھی بجائے ۳۰ دن کے ۲۹ دن کا ہو جاتا ہے۔ سن مصری میں محرم ۳۰ دن کا ہوتا ہے۔ اور پھر ۳۰-۲۹ ہوتے ہیں۔ اور ذی الحجہ جو عام طور سے ۲۹ کا ہوتا ہے کبھی کبھی ۳۰ کا ہوتا ہے یہ تاریخیں بلحاظ اوسط ہوتی

ہیں۔

اسی رسالہ میں جو میری مخالفت میں ۱۳۸۵ھ کے شوال کے چاند کا ذکر آیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اس سال ۱۳۸۵ھ میں رویت شوال حضرت مفتی مملکت عربیہ سعودیہ کے روبرو شہادت عدلین سے ثابت ہو۔ لیکن دل نہیں دیا۔ میں نے جو مضمون ۱۹۶۶ء اپریل میں لکھا تھا اس میں دکھلایا تھا کہ جمعہ کے دن غروب آفتاب سے القمر الجدید ۲۴ منٹ بعد ہو رہا ہے۔ لہٰذا جمعہ کی شام کو نظر آنا ناممکن ہے لیکن سنا گیا ہے کہ عید جمعہ کو ہو گئی حالانکہ شنبہ کو بھی نہیں ہو سکتی۔

ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ کا چاند دیکھئے جدول (۱) منگل کو غروب آفتاب سے دس گھنٹہ ۴۲ منٹ پہلے القمر الجدید ہو رہا ہے۔ لہٰذا چاند..... دکھائی نہیں دے سکتا چونکہ دکھائی دینے کے لئے ۲۰ گھنٹہ کم سے کم چاہئے لیکن اس کے باوجود چاند دیکھ لیا گیا اور حج بدھ کو ہوا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ٹیونس والوں نے اور بوہرہ حضرات نے حج (بجائے بدھ جو حکومت حجاز نے کرایا) جمعرات کو کیا ٹیونس والوں نے مولانا سعید احمد اکبر آبادی سے کہا ہم بلحاظ ہئیت کرتے ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی اس حج میں موجود تھے۔ اور بوہرہ حضرات نے مجھ کو بتایا کہ ہمارے یہاں حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جنتری ہے اس سے تاریخ مقرر کرتے ہیں

مجھے معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ میں جو لوگ شہادت دیتے ہیں انہیں انعام دیا جاتا ہے میں نے کہیں پڑھا ہے کہ کسی اسلامی حکومت میں اسی طرح شہادت دی جاتی تھی جب اس بادشاہ کا بیٹا تخت پر بیٹھا تو اس نے تحقیق کے بعد ان لوگوں کو خوب سزا دی اور انعام بند کر دیئے۔ حضرت امام تقی الدین سبکی شافعی فرماتے ہیں کہ جب شہادت حساب کے خلاف ہو نہ مانی جائے۔

مولانا حسرت موہانی مرحوم کا حج

۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۹ء مولانا صاحب نے حج کیا۔ مولانا صاحب کو جب معلوم ہوا کہ اعلان ہوا ہے کہ حج اتوار کو ہے تو وہ مفتی صاحب کے پاس گئے کہ آپ نے کیسے اعلان کر دیا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ہمارے

یہاں ذی قعدہ کی ۳۰ ہے مولانا صاحب نے فرمایا کہ ذی قعدہ کے چاند کی شہادتیں جنہوں نے دی ہیں وہ کون صاحب ہیں۔ مفتی صاحب نے دوسرا اعلان کرادیا کہ حج پیر کو ہوگا۔ (خط محبوب احمد صاحب عباسی قاضی شہر امروہہ ضلع مرادآباد) میری خوش قسمتی ہے کہ جب اس کا ذکر جناب مشتاق احمد صاحب بی۔ اے، آکسفورڈ بارایٹ لا (فرزند جناب مولوی مشتاق حسین نواب وقارالملک) جنھوں نے اسی سال حج کیا تھا ان سے ملا تو انھوں نے اپنی ڈائری دیکھی اور فرمایا بے شک حج اتوار کو ہو رہا تھا۔ پھر دوسرا اعلان ہوا کہ حج پیر کے دن ہوگا۔

مفتی محمد رضا صاحب انصاری فرنگی کا حج

مفتی صاحب نے حج ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۵ء میں کیا اور انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "حج کا سفر" ہے۔ اس میں ۱۳۶ صفحہ پر دیا ہے کہ ۲۸ ذی الحجہ کے بعد یکم محرم ہوگئی یہ جلوہ گری جنتری کی ہے جو اور نو (۹) ماہ کے لئے ہے۔ تین مہینوں کے لئے بجائے گفتن رویت بذریعہ شہادت ہے۔ حج اس سال ۱۱ر اپریل ۱۹۶۵ء بروز اتوار ہوا۔ اور بلحاظ رویت پیر کو ہونا چاہئے تھا ۲ر اپریل کو القمر الجدید ۳ بج کر ۲ منٹ پر رات کو ہو رہا ہے۔ بحوالہ جدول (۱) اس لئے رویت ۳ر اپریل کو ہوگی۔ اور یکم ذی الحجہ ۴ر اپریل ۱۹۶۵ء بروز اتوار اور ۹ ذی الحجہ پیر کو ہوئی یعنی حج پیر کو ہوتا اس لئے حج ایک دن پہلے ہوا۔

جنتری ام القریٰ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے مجھ کو عنایت فرمائی ہے اس میں اسی دن کو یکم مان لی گئی ہے جس دن کہ القمر الجدید ہو رہا ہے۔ (جدول (۲)) اس دن تحت الشعاع کی وجہ سے چاند دکھائی نہیں دیگا۔ عام طور سے اس سے اگلے دن دکھائی دے گا۔

میں اس جنتری ام القریٰ کے حق میں نہیں ہوں اور نہ میں اس کو درست سمجھتا ہوں کہ نو مہینہ تو جنتری سے ہوں اور تین مہینہ رویت سے ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ عدت کے معاملہ میں کیا ہوگا۔ ہر ماہ کی رویت کے لئے شہادت کا انتظام ہونا چاہئے۔ اور اس معاملہ میں انعام واکرام سے کام نہیں لینا چاہئے۔

علم ہئیت کا سیدھا سادہ مسئلہ کہ حجاز اور ہند یا مصر میں دو دن کا فرق نہیں ہوسکتا ہے دوسری بات اگر صبح کو سورج کے نکلنے سے پہلے چاند نظر آئے تو اس شام کو رویت نہیں ہوسکتی ہے۔ تیسری بات جس دن القمر الجدید ہو اس دن چاند شام کو نظر نہیں آسکتا ہے۔ مصر والے اور بوہرہ حضرات ٹیونس والے وغیرہ وغیرہ اپنے اپنے ڈھنگ پر چلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ ہندوستان کے علماء رویت کا بے حد خیال کرتے ہیں لیکن حجاز کے معاملہ میں ذرا سوچنے لگتے ہیں کہ شہادت کیسے غلط ہوسکتی ہے۔

اہل حجاز کا ایک مسئلہ

تقویم ام القریٰ میں مغرب اور عشاء کے درمیان ہمیشہ ڈیڑھ گھنٹہ کا فرق ہوتا ہے یہ مکہ مکرمہ مدینہ طیبہ اور نجد تینوں کے لئے ہے۔

میں سمجھتا ہوں شفق احمر ہو یا شفق ابیض اسکا انحصار عرض البلد اور میلان شمس پر ہے اور مختلف موسموں میں مختلف ہوتا ہے۔ کوئی صاحب اس پر بھی روشنی ڈالیں۔

اب رہا ایک دن دو دن کا فرق تو اصل یہ ہے کہ اس معاملہ میں تفصیل سے بحث نہیں ہوسکتی بلکہ تقریبی حساب سے ہوگی جس کو موٹا حساب کہہ سکتے ہیں۔

(۱) فرض کیجئے کہ چاند کی رویت جب ہوگی جبکہ چاند کا ارتفاع سورج کے غروب ہوتے وقت دس درجہ افق سے اونچا ہو۔

(۲) چاند چونکہ ایک چکر زمین کے چاروں طرف ۳۰ دن میں کرتا ہے یعنی ۳۶۰ درجہ چلتا ہے اسلئے ایکدن میں ۱۲ درجہ چلتا ہے یعنی ایک گھنٹہ میں آدھا درجہ چلتا ہے۔

(۳) زمین چونکہ ایک چکر یعنی ۳۶۰ درجہ ۲۴ گھنٹہ میں کرتی ہے اس لئے ایک گھنٹہ میں ۱۵ درجہ چلتی ہے یعنی ایک درجہ ۴ منٹ میں چلتی ہے۔

(۴) اس چار منٹ فی درجہ کا یہ اثر ہے کہ اگر کسی دو جگہ کے طول البلد میں چاہے دونوں مختلف مگر قریب عرض البلد پر ہوں ۳۰ درجہ کا فرق ہو تو مشرق میں زوال یعنی نصف النہار بخوبی ۲ گھنٹہ پہلے ہوگا۔ اسی طرح ایک ہی عرض البلد پر طلوع شمس ۲ گھنٹہ پہلے ہوگا اور غروب شمس بھی دو گھنٹہ پہلے ہوگا یہ جو افطار کے کسی جگہ

کے وقت میں طول البلد سے حساب لگا لیتے ہیں غلط ہے۔ اگر عرض البلد میں فرق زیادہ ہے) رویت کے معاملہ میں عرض البلد سے فرق پڑتا ہے مگر زیادہ نہیں پڑتا ہے۔ (یہاں وہ بلاد مراد ہیں جن کے عرض البلد ۵۰ بلکہ ۴۵ سے کم ہوں یعنی تحت الاعتدال ہوں)

(۵) فرض کیجئے کہ مکہ مکرمہ میں چاند کی رویت ہوئی اور چاند اپنی آخری حد یعنی ۱۰ درجہ پر تھا یعنی افق سے دس درجہ اونچا تھا۔

(۶) فرض کیجئے کہ مکہ مکرمہ کے طول البلد میں اور وسط ہند کے طول البلد میں ۴۵ درجہ کا فرق ہے تو ہندوستان کے وسط میں سورج غروب ۳ گھنٹہ پہلے ہوگا۔ اور اتنے عرصے میں چاند ۱½ درجہ چلے گا جس کے معنی یہ ہوئے کہ وسط ہندوستان میں سورج کے غروب کے وقت چاند صرف ۸½ درجہ اونچا ہوگا اور دکھائی نہیں دے گا (اگر دس درجہ ہوتا تو دکھائی دیتا) اگلے دن مکہ مکرمہ میں چاند افق سے ۲۲ (۱۰ + ۱۲) درجہ اونچا ہوگا۔ اور وسط ہندوستان میں ۸½ + ۱۲ = ۲۰½ درجہ افق سے اونچا ہوگا اور دکھائی دے گا۔ فرض کیجئے کہ ایک شہر مشرق میں مکہ مکرمہ سے ۱۸۰ درجہ فرق پر ہے (اس سے زیادہ لیں گے تو مغرب میں ۱۸۰ درجہ سے کم ہو جائیگا اس وجہ سے زیادہ سے زیادہ لیا ہے) تو وہاں سورج مکہ مکرمہ سے ۱۲ گھنٹہ پہلے غروب ہوگا اور چاند اس عرصہ میں ۶ درجہ چلے گا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مکہ مکرمہ میں جب رویت ہوئی تو چاند افق سے دس درجہ اونچا تھا۔ اور وہاں یعنی ۱۸۰ درجہ مشرق میں غروب آفتاب کے وقت چاند افق سے ۱۰ نفی ۶ برابر ۴ درجہ اونچا ہوگا اور دکھائی نہیں دے گا۔ اور اگلے دن مکہ مکرمہ میں ۱۰ + ۱۲ = ۲۲ درجہ اونچا ہوگا۔ اور اس جگہ مشرق میں ۴ + ۱۲ = ۱۶ درجہ افق سے اونچا ہوگا اور دکھائی دے گا۔ جیسا کہ میں نے واضح کیا ہے اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک دن سے زیادہ کا فرق نہیں ہو سکتا ہے۔ لندن اور مکہ مکرمہ میں تین گھنٹہ کا فرق غروب آفتاب میں ہے اور اسی طرح مکہ مکرمہ میں اور وسط ہندوستان میں تین گھنٹہ کا فرق غروب آفتاب میں ہے۔ فرض کیجئے کہ لندن میں آخری حد یعنی دس درجہ افق سے اونچا چاند دیکھا گیا ہے تو اس دن مکہ مکرمہ میں غروب آفتاب کے وقت چاند کی اونچائی ۸½ درجہ اور وسط ہندوستان میں غروب آفتاب کے وقت ۷ درجہ اونچائی ہوگی۔ اور اس سے اگلے دن لندن میں غروب آفتاب کے وقت اونچائی ۲۲ درجہ اور مکہ مکرمہ میں اونچائی ۲۰½ درجہ ہوگی اور وسط ہندوستان میں ۱۹ درجہ اونچائی ہوگی۔ اور چاند سب جگہ نظر آئے گا۔ (اگرچہ یہ

تقریباً ہے)

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میری تمنا پوری ہوئی کہ شہادتوں کا زور ختم ہو گیا کیوں کہ ایسے صاف دلائل کے بعد اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ شہادت بے معنی چیز ہے۔ میرا مطلب انعام و اکرام والی شہادت سے ہے۔ جنتری اور شہادت، دونوں کے ذریعہ تاریخیں مقرر کرنا یہ بھی غلط ہے۔ کیوں کہ مہینہ ۲۹ دن کا ہوا اور کبھی ۳۱ دن کا ہوا جب تک جنتری میں مہینوں کے نام وہی رہیں گے التباس ضرور ہوگا۔ کاروبار کے لئے انگریزی گریگوری اختیار کرلیں۔ اور فرنگی اگر نہیں چاہتے ہیں تو جلالی سن اختیار کرلیں۔ یہ نہ ہو کہ مینۃً آتی تاریخ یہ ہے اور عرفانی تاریخ یہ ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ چاند ظہور سے پہلے دیکھ لیتے ہیں۔ یعنی القمر الجدید کا لمحہ ابھی آیا ہی نہیں، یعنی چاند محاق سے نکلا ہی نہیں اور دیکھ لیا بالکل غلط ہے۔

حال کی مثالیں ۱۳۸۹ھ کا رمضان شریف کا چاند پیر کے دن رات کے ۱۲ بج کر ۵۲ منٹ پر ہو رہا ہے یعنی محاق سے نکل رہا ہے۔ مگر وہاں اتوار کی شام کو دیکھ لیا۔ اسی طرح شوال ۱۳۸۹ھ کا چاند منگل کو دوپہر کے ۱۲ بج کر ۲۳ منٹ پر ہو رہا ہے لیکن اس کو پیر کی شام کو دیکھ لیا یہ بالکل مذاق ہے اس میں کوئی حقیقت نہیں (حوالہ جدول (۱)) جو صاحب چاہیں اس کے متعلق تفصیل سے گفتگو کرلیں۔ خادم ہر وقت تیار ہے۔ یہ کہنا کہ حساب غلط ہے لیکن کتنی دفعہ؟ ایک دفعہ حساب غلط ہو جائے دو دفعہ ہو جائے۔ عام طور سے حساب غلط رہتا ہے۔ حج کا پتہ تو ریڈیو سے۔ اخبار سے چل جاتا ہے کیوں کہ یہ عالمی چیز ہے۔ لیکن رمضان اور عید الفطر کا کبھی کبھی چل جاتا ہے۔

نوٹ:- (۱) وقت مقامی اوسط مکہ مکرمہ بھارت کے معیاری وقت سے دو گھنٹہ پچاس منٹ کم ہے یعنی اگر بھارت کا معیاری وقت ۱۲ بجے دوپہر ہے تو مکہ مکرمہ کا وقت مقامی اوسط ۹ بجکر ۱۰ منٹ قبل دوپہر ہے۔

(۲) مقامات تحت الاعتدال وہ ہیں جہاں عشاء کا وقت ہوتا ہے۔

(۳) لندن میں کچھ عرصہ کے لئے عشا کا وقت نہیں رہتا ہے۔

میں نے مثال میں لندن لے لیا ہے کوئی حرج نہیں ہے۔ الجیریا میں اسی طول البلد پر کوئی مقام لے سکتے ہیں۔

شاہ ولایت صاحبؒ کا نسب

(سید یحیٰ حسن نقوی)

" امروہہ کے سادات نقویہ کے مورث اعلیٰ سید حسن شرف الدین شاہ ولایتؒ کے نسب، ان کی تاریخ پیدائش، تاریخ ورود امروہہ، تاریخ وفات، ان کے چھوٹے فرزند سید عبدالعزیز کی شہزادی کے ساتھ شادی، نیز ان کے مذہب کے سلسلہ میں تمام جدید تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے اور عظیم غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ جن کا ازالہ ضروری ہے۔ اس سلسلۂ مضامین میں ان تمام مسائل کا تاریخی تجزیہ کیا گیا ہے اور خالص تاریخی نقطۂ نظر سے نتائج برآمد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

صاحب تاریخ امروہہ کو نہ جانے کیوں کر حضرت شاہ ولایتؒ کے نسب میں چار واسطوں کی کمی دکھائی دی ہے اور انھوں نے یہ لکھنے کی جرأت کر ڈالی ہے کہ حضرت شاہ ولایت کا سلسلۂ نسب صحیح اور متصل نہیں اور اس لئے اس خاندان کو صحیح النسب نہیں کہا جا سکتا، زیادہ سے زیادہ مشہور النسب کہہ سکتے ہیں[1]، چونکہ اس دعوے کے ثبوت میں صاحب تاریخ نے کوئی مضبوط دلیل بھی پیش نہیں کی ہے اس لئے ان کا یہ دعوی مورخانہ دیانت داری کے منافی ہے۔

حضرت شاہ ولایت کے نسب پر عمدۃ الطالب کی سند حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ عمدۃ الطالب آٹھویں صدی ہجری کے اواخر، یعنی حضرت شاہ ولایتؒ کا ہم عصر تذکرہ ہے اور اس جہت سے سب سے

---

[1] محمود احمد عباسی تحقیق الانساب، صفحہ

زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس کے مصنف سید جلال الدین الحسنی (وفات: ۸۲۸ھ) ہیں۔ یہ عربی زبان میں ہے اور بمبئی اور لکھنؤ سے کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ اس کے ہندوستانی مرتب نے جا بجا حاشیوں کے ذریعہ ہندوستانی سادات کے مختلف خاندانوں کے نسبی سلسلوں کی کڑیاں ائمہ تک ملانے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے صاحب تحقیق الانساب کا یہ خیال کہ "زمانہ حال میں جب...... کتاب لکھنؤ میں...... چھپنے لگی...... تو کسی نے حاشیہ کتاب پر سادات نقوی امروہہ کا سلسلۂ نسب بھی درج کرا دیا۔"[۵] غیر ذمہ دارانہ قیاس پر مبنی ہے جو بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس سے دو شدید غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ عمدۃ الطالب کے حاشیوں میں سوائے سادات امروہہ...... کے کسی اور خاندان کے انساب درج نہیں ہیں، اور یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے۔ اس کے حاشیوں میں سادات گردیز، سادات سامانہ، سادات بھکر، سادات بخاری،...... سادات رضویہ اور بہت سے دوسرے سادات کے انساب درج ہیں دوسری غلط فہمی یہ پیدا ہوتی ہے کہ یہ حاشیہ صرف نسخۂ لکھنؤ میں ہے اور نسخۂ بمبئی میں نہیں ہے اور یہ بات بھی بالکل خلاف واقعہ ہے۔ نسخۂ بمبئی میں بھی وہ تمام حواشی بجنسہ موجود ہیں جو نسخۂ لکھنؤ

---

[۵] محمود احمد عباسی تحقیق الانساب، ص۵۸ (حاشیہ) عمدۃ الطالب کے بمبئی ایڈیشن کے حاشیہ کی عبارت یہ ہے "ومن اولاد سادات امروھہ وھی قریۃ من مضافات دھلی وردھا اولاد السید شرف الدین شاہ ولایت[۱] وھو ابن السید علی بزرگ[۲] وھو ابن السید مرتضیٰ[۳] وھو ابن السید ابی المعالی[۴] وھو ابن السید ابی الفرح[۵] الصید ادی الواسطی وھو ابن السید داؤد[۶] وھو ابن السید حسین[۷] وھو ابن السید علی[۸] وھو ابن السید ہارون[۹] المذکور فی المتن۔" اس طرح شاہ ولایت صاحبؒ سے سید ہارون تک ۹ اور ہارون بن جعفر[۱۰] کذاب بن امام[۱۱] علی نقی کو شامل کرکے گیارہ واسطے موجود ہیں۔ اور یہی حاشیہ بجنسہ لکھنؤ ایڈیشن میں ہے۔

میں ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات غور طلب ہے کہ عمدۃ الطالب کے محشی کی نظر نہ شاید ابن خلدون کے اس نظریئے پر تھی جس کی بنیاد پر صاحب تحقیق الانساب نے حضرت شاہ ولایت کے سلسلۂ نسب میں چار واسطوں کی کمی دریافت کی ہے (اس پر آگے چل کر تفصیلی بحث کی گئی ہے) اور نہ اس کا علم تھا ——— اور یہ بات بہ یقین کہی جا سکتی ہے ——— کہ ۱۳۵۱ھ میں مولوی محمود احمد عباسی تحقیق الانساب لکھنے والے ہیں جس میں وہ ابن خلدون کے قائم کردہ معیار پر حضرت شاہ ولایت کے نسب کو جانچیں گے اور اس میں دو چار واسطوں کی کمی دریافت کریں گے۔ اس لئے موقع غنیمت ہے اس وقت اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ایک حاشیہ بڑھا دیا جائے۔ نسخۂ لکھنؤ کے پبلشر کی نیت پر یہ خواہ مخواہ کا الزام بے بنیاد قیاس پر مبنی ہے تاریخ میں اس قسم کے قیاس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ لکھنؤ ایڈیشن کی اشاعت کے وقت کسی کا داؤ چل گیا اور کسی کو حاشیہ کتاب پر سادات نقوی امروہہ کا سلسلۂ نسب درج کرانے کا موقع مل گیا تو بمبئی ایڈیشن کی اشاعت کے وقت وہاں کون موجود تھا جس نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ نسخۂ بمبئی میں یہ کمی کیوں نہیں ہے؟ اگر نسخۂ بمبئی میں یہ کمی موجود ہوتی اور نسخۂ لکھنؤ[۲] میں نہ ہوتی تب بے شک صاحب تحقیق الانساب کے قیاس کی کچھ قیمت لگ سکتی تھی۔ مندرجہ بالا دلائل کی روشنی میں مولوی محمود احمد عباسی کا یہ قیاسی استدلال مہمل اور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

---

[۱] نسخۂ بمبئی، آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں موجود ہے۔

[۲] عمدۃ الطالب کا ایک نسخہ میرے پاس ہے جسے میں نے مولانا سید محمد عبادت صاحب سے مستعار حاصل کیا ہے۔ یہ آزاد لائبریری والے ایڈیشن سے کتابت، خط، اور چھاپے کے لحاظ سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا غذ ردی اور ٹائیٹل تلف ہو گیا۔ اس لئے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کہاں چھپا ہے۔ لیکن مولانا موصوف کا خیال ہے کہ یہ مطبوعۂ لکھنؤ ہے۔

اسی ضمن میں ایک دوسرے مقام پر موصوف لکھتے ہیں :۔ "ایک قدیم ترین شجرۂ نسب میں جو خاکسار مؤلف کو دستیاب ہوا ہے۔ شاہ ولایتؒ اور امام علی نقیؑ کے درمیان صرف چھ واسطے درج ہیں[1]۔" اس شجرۂ نسب کا ماخذ، اور یا علیہ موصوف نے کہیں نہیں لکھا، اور نہ یہ لکھا کہ کن صاحب سے انھوں نے اسے حاصل کیا، جن صاحب سے حاصل کیا وہ کس حد تک ثقہ ہیں۔ کسی معتبر شخصیت نے اس کی تصدیق کی یا نہیں، کن قرائن کی بنیاد پر انھوں نے اس مفروضہ دستاویز کا اطمینان کیا وغیرہ وغیرہ۔ ایک ذمہ دار مورخ کے لئے یہ بات حیرت انگیز ہے کہ اس نے ان تمام اہم پہلوؤں کی طرف توجہ کئے بغیر ایک بالکل غیر اہم، نامعتبر اور بوگس دستاویز کو استناد کے قابل گردان دیا۔

صاحب تحقیق الانساب کے استدلال کی بنیاد دراصل ابن خلدون کا وہ مشہور و معروف معیار ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جس مورث سے سلسلۂ نسب کو جانچنا ہو یہ دیکھا جائے کہ مورث اور وارث کے درمیان فی صدی تین پشتوں کا اوسط برآمد ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ دراصل ایک استقرائی قاعدہ تھا اس لئے اس میں ترمیم و تنسیخ ہر وقت ممکن تھی۔ چنانچہ نسابین نے بعد میں اس میں یہ اضافہ کیا کہ دو صدیوں میں کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ سات واسطے پائے جانے چاہئیں۔ اس کے علاوہ نسابین اس مسئلہ میں بھی مختلف الخیال ہیں کہ مورث اور وارث کے درمیان واسطے اور مدت معلوم کرنے کے لئے آیا جانبین کی عمروں کو شامل کیا جائے یا نہیں۔

اول تو یہ کہ نسابین کا قائم کردہ یہ استقرائی معیار کافی پرانا اور فرسودہ ہو گیا ہے۔ کاروان تحقیق چوں کہ دن بہ دن آگے بڑھتا جا رہا ہے اس لئے قدیم نظریات بہت تیزی سے بدل رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بقول صاحب تاریخ سادات امروہہ "یہ معیار قاعدۂ اکثریہ ہے قاعدۂ کلیہ نہیں ہے[2]۔" ہو سکتا ہے کہیں سو سال میں چار واسطے دکھائی دیں اور کہیں دو۔ بہرحال یہ ریاضی کا "دو اور دو چار" جیسا کلیہ ہرگز نہیں ہے جس میں

---

[1] محمود احمد عباسی: تحقیق الانساب، ص۳۰

[2] سید حضال احمد: تاریخ سادات امروہہ ص۲۷۲

ردوبدل یا کمی بیشی کا امکان ہی نہ ہو۔ خود صاحب تحقیق الانساب جنھوں نے اس کلیہ کو اپنے استدلال کی بنیاد قرار دیا ہے، لکھتے ہیں ــ "انساب کا علم بعض دیگر علوم ریاضی اور ہندسہ کی طرح کوئی قطعی اور یقینی علم نہیں ہے بلکہ ظنی ہے"[۱]۔

اس کے علاوہ منتہائے عمر کا اوسط زمانۂ قدیم میں کچھ اور تھا اور آج کچھ اور ہے۔ اس وقت بچے کم زندہ رہتے تھے اور جو زندہ رہ جاتے تھے ان کی عمر طویل ہوتی تھی۔ اب سائنس نے بیماریوں پر کنٹرول کر لیا ہے۔ اب بچے کم مرتے ہیں، لیکن انسان کی عمر اب زیادہ طویل نہیں ہوتی۔ پہلے ۱۰۰ سو ۸۰ اسّی برس، یا اس سے زیادہ، لوگوں کی عمر ہو جاتی تھی اور منتہائے عمر کا اوسط ۱۰۰ سو ۸۰ اسّی برس قرار دیا جا سکتا تھا۔ اب ۱۰۰ سو تک بہت کم لوگ پہنچتے ہیں اور اب منتہائے عمر کا اوسط اسّی یا ۹۰ نوّے برس سے زیادہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس جہت سے ابن خلدون کا معیار جو اس وقت بھی قاعدۂ کلیہ نہیں تھا اب بالکل باطل ہو گیا ہے۔ اس لئے آنکھیں بند کر کے اس کی تقلید کرنا یا اس پر ایمان لے آنا مورخانہ احتیاط کے خلاف ہے۔

ابن خلدون کے کلیہ کی صحت یا عدم صحت کو جانچنے کے لئے ایک بالکل سامنے کی مثال بہت کافی ہے۔ یعنی یہ کہ میرے پردادا صاحب مرحوم و مغفور (الحاج سید اصغر حسین، مولف تاریخ اصغری) کا انتقال ۱۹۰۷ء میں ہوا اور میرا لڑکا سید علی امام ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوا۔ گویا میرے لڑکے اور پردادا صاحب کے درمیان ــ اگر جانبین کو چھوڑ کر حساب لگایا جائے، جیسا کہ مولوی محمود احمد عباسی نے شاہ ولایت صاحبؒ کے سلسلہ میں کیا ہے ــ تین واسطے ہوتے ہیں جن کے لئے ابن خلدون کے کلیہ کے مطابق ۱۰۰ سو سال کی مدت درکار ہے جب کہ یہاں صرف ۳۲ بتیس کا فصل برآمد ہوتا ہے۔

اسی طرح صاحب تاریخ سادات امروہہ نے ایک مثال اس کے برعکس نقل کی ہے۔ یعنی یہ کہ مولوی سید محمد احسن ساکن محلہ شاہ علی سرائے کے ۵۰ سال کی عمر میں فرزند تولد ہوا[۲] اور اگر یہی صورت ان کے فرزند کے

---

[۱] محمود احمد عباسی: تحقیق الانساب، ص ۲

[۲] سید اصغر علی احمد: تاریخ سادات امروہہ، ص ۲۴۲

ساتھ بھی رہی ہو، جو عین ممکن ہے۔ تو یہاں دو سال میں بھی پورے تین واسطے برآمد نہیں ہو سکتے۔ اسی قسم کی اور سینکڑوں مثالیں مختلف خاندانوں میں مل جائیں گی۔ جہاں اولاد ذکور نارمل حالات میں ہوئی اور شادیاں نارمل عمر میں ہوگئیں وہاں یہ کلیہ ہو سکتا ہے درست ہو جائے۔ لیکن جہاں شادیاں جلد ہوئیں اور اولاد ذکور بھی جلد ہوتی وہاں واسطے لازمی طور پر زیادہ ہو جائیں گے۔ اور جہاں شادیاں دیر سے ہوئیں اور اولاد ذکور بھی دیر ہوگئی وہاں واسطے یقیناً کم دکھائی دیں گے۔

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابن خلدون کا یہ کلیہ قطعی اور یقینی ہرگز نہیں ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ علی امام (سلمہ) اور سید اصغر حسین (مرحوم و مغفور) کے درمیان مدت میں کمی اور واسطوں میں بیشی پائی جاتی ہے۔ اس لئے علی امام کا سید اصغر حسین کی اولاد میں ہونا مشتبہ ہے، یا چونکہ مولوی محمد احسن اور ان کے فرزند کے درمیان سو سال میں ایک واسطہ بھی نہیں پایا جاتا اس لئے ان کا فرزند ان کی اولاد نہیں۔ اسی طرح ابن خلدون کے نظریئے کے مطابق حضرت شاہ ولایت کے نسب میں ایک دو واسطوں کی کمی فی الحقیقت ہوتی بھی، جو صاحب تحقیق الانساب کو تعصب کی عینک سے دکھائی دی ہے، تب بھی حضرت شاہ ولایت کے نسب میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں تھی۔

لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ابن خلدون کا نظریہ آج بھی وہی حکم رکھتا ہے۔ یا کم از کم شاہ ولایت صاحبؒ کے زمانہ میں وہی حکم رکھتا تھا تب بھی یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ سید شرف الدین شاہ ولایتؒ سے امام علی نقیؑ تک چار واسطوں کی کمی واقعی ہے بھی یا نہیں، جیسا کہ صاحب تحقیق الانساب نے فرض کیا ہے۔ صاحب تحقیق الانساب نے شاہ ولایت صاحبؒ سے امام علی نقیؑ تک ۳۸۲ سال کا فصل قرار دیا ہے۔ ابن خلدون کے نظریئے کے مطابق اس مدت میں کم و بیش گیارہ واسطے درکار ہیں۔ عمدۃ الطالب کی سند سے (جس کی تشریح اوپر کی گئی) شاہ ولایت صاحبؒ سے امام علی نقیؑ تک گیارہ واسطے موجود ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔—

"شرف الدین[1]، شاہ ولایت، بن سید علی بزرگ[2]، بن سید محمد مرتضیٰ[3]، بن سید ابو المعالی[4]، بن سید ابو الفرح الصیداوی الواسطی[5]، بن سید داؤد[6]، بن سید حسین[7]، بن

سید علی، بن سید ہارون، بن سید جعفر، بن امام علی نقیؑ۔"

اسی طرح سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے جو شرح مستند سادات ہندوستان وغیرہ کی کتاب مستطاب کنز الانساب، و بحر المصائب میں لکھی ہے اس میں انھوں نے بھی اس شجرے کی تکرار کی ہے۔ اور اس کے بعد تواتر کے ساتھ صاحب اسراریہ، صاحب ریاض الانساب، اور صاحب تاریخ گلزار شمس تبریز نے اس کی تکرار کی ہے لیے اتنی محکم اور مستند دستاویزی شہادتوں کی موجودگی میں شاہ ولایت صاحبؒ کے نسب کے بارے میں کسی مغالطہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اس کے علاوہ قتاب سادات نقویہ ہر تقریب کے موقع پر صاحب تقریب کے شجرے کی تکرار کرتا ہے۔ اور یہ رسم مشد آمد قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ ہر تقریب میں قتاب ایک "دعا" پڑھتا ہے، جس کے ابتدائی حصے کی زبان، جو عوامی ہونے کے باوجود فارسی، ہندی کا بڑا خوش گوار مکسچر ہے، امیر خسروؒ کے عہد کی زبان کی یاد تازہ کرتی ہے۔ جب اردو اپنے ارتقاء کی ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ امیر خسرو شاہ ولایت صاحبؒ کے ہم عصر ہیں۔ "بدہ ہزار سال، بدہ پشت پناہ و سوار (دوش) رسول، گگن بیچ پھول، سگے مدینے کے، گھر پاک مصلے، پیغمبر گھر نواسے بچے۔" کے ٹکڑے امیر خسرو کے "ز حال مسکین مکن تغافل دُرائے نیناں بنائے بتیاں،" سے اس قدر قریبی لسانی مماثلت رکھتے ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ یہ "دعا" خود حضرت شاہ ولایت کے وقت سے اب تک بدستور چلی آ رہی ہے۔

لے۔ ان کتب کی اصل عبارت اور دیگر تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ سادات امروہہ صفحہ ۲۴۴ تا ۲۴۶، لے یعنی آسمان۔

لے اس "دعا" کا مطلب یہ ہے۔ "(اے خدا تو دولہا دولہن کو) ہزار سال کی عمر اور سوار دوش رسول (یعنی امام حسین) کی پشت پناہی عطا فرما، جو آسمان کے پھول ہیں، سگے مدینے کے ہیں جن کا گھر کعبہ ہے، جو پیغمبر کے نواسے ہیں۔"

اس مقام پر اس حقیقت کا اظہار بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نسابیوں کا مورث اعلیٰ اس کنبیہ جماعت میں شامل تھا جو شاہ ولایت صاحبؒ کے والد ماجد اپنے ہمراہ واسط سے امروہہ لائے تھے۔ نسابوں، یا مقامی اصطلاح میں "میراثیوں" کے بیان میں صاحب اصغری لکھتے ہیں۔—

"سادات کی نسابی ان سے (میراثیوں) سے متعلق ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ موسمی انچھا شہید کو مخدوم سید شرف الدین شاہ ولایتؒ اپنے ہمراہ لائے تھے۔[۱]"

۱؎ سید اصغر حسین: تاریخ اصغری ص۱۴۳

ایران میں چند روز

سعید احمد اکبر آبادی

(۷)

علوم و فنون اسلامیہ و مشرقیہ کی تحصیل سے فراغت کے بعد بدیع الزمان فروزانفر پہلے مدرسۂ حقوق میں منطق کے، اس کے بعد دارالمعلمین میں عربی زبان اور منطق کے معلم ہوئے۔ ایک برس کے بعد اسی درسگاہ میں فارسی زبان اور ادبیات کے درس کی خدمت بھی ان کے سپرد ہوئی۔ دو برس بعد مدرسۂ عالی سپہ سالاری میں تفسیر قرآن مجید اور عربی ادبیات کے مدرس ہوئے۔ دو ڈھائی برس تک یہاں کام کیا۔ پھر مختلف کالجوں اور اداروں میں کہیں صدر شعبہ اور کہیں استاد کی حیثیت سے تاریخ ادبیات فارسی اور اسلامی تصوف کے درس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۳۲۳ھ (ایرانی) میں ایک کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ایران کی پارلیمنٹ اور دوسری اونچے درجہ کی علمی تعلیمی اور سیاسی جماعتوں کے بھی ممبر رہے۔ امریکہ، یورپ، ترکی، بعض عرب ممالک اور ہندوستان و پاکستان کا سفر بھی کیا تھا۔ تمام علوم و فنون میں استعداد، بڑی پختہ اور نظر بہت وسیع تھی۔ مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا ذوق فطری تھا۔ علامہ عبدالوہاب قزوینی کی ہمہ وقتی ہم نشینی اور معیت نے اس شراب دو آتشہ کو اور سہ آتشہ بنا دیا تھا۔ اس بنا پر گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود نہایت انہماک کے ساتھ تحقیقی مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں لگے رہے۔ چنانچہ مقالات اور بعض کتابوں کے حواشی و مقدمات کے علاوہ مستقل کتابیں جو ان کے قلم سے نکلیں یا جن کو انھوں نے اڈٹ کیا تھا، ان کی تعداد بیس بتائی جاتی ہے۔ مولانا جلال الدین رومی اور آپ کی مثنوی سے عشق تھا اور اسی تقریب سے تصوف کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ اس موضوع پر انکی کتابیں اور مقالات کئی ایک ہیں اور ضخیم ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہو سکا ان کے نام یہ ہیں:-

(۱) رسالہ در احوال مولینا جلال الدین
(۲) خلاصۂ مثنوی
(۳) فیہ ما فیہ از گفتار مولوی
(۴) ماخذ قصص و تمثیلات مثنوی
(۵) احادیث مثنوی
(۶) دیوان شمس تبریزی (دیوان کبیر)
(۷) شرح مثنوی شریف
(۸) ترجمۂ رسالہ قشیریہ (متن قدیم)
(۹) احوال و تحلیل آثار فرید الدین عطار نیشاپوری
(۱۰) معارف تالیف بھاء ولد
(۱۱) فارابی و تصوف مقالہ مطبوعۂ یغما ج ۴ ص از ۹۷ تا ۳۰۔)
(۱۲) بو علی سینا و تصوف (مقالہ)
(۱۳) شعر مولوی: یادنامۂ مولوی (مقالہ)

غیر معمولی علم و فضل، بلند عہدہ و منصب اور حسن اخلاق و گفتار کے باعث موصوف کا مرتبہ و مقام ایران کے ارباب علم و تحقیق اور اصحاب سیاست و حکومت دونوں طبقوں میں بڑا اونچا تھا اور ہر شخص ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ ایران سے واپسی کے ایک ڈیڑھ ماہ بعد یعنی گذشتہ مئی ۱۹۷۰ء میں جب ایک دن اچانک ان کی وفات حسرت آیات کی خبر سنی تو جی دھک سا ہو کر رہ گیا۔ مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی اور دیر تک ان کو یاد دلا کے بے چین کرتی رہی۔ رحمۃ اللہ رحمۃ کاسعۃ، مرحوم کی خوش اخلاقی کا یہ عالم تھا کہ نقاہت اور ضعف کے باوجود اس روز ہم کو اپنے گھر بلا کر زیارت و ملاقات کا شرف بخشا، ہندوستان اور خصوصاً علی گڑھ کا ذکر کرتے رہے اور اس کے بعد ہم طہران میں دو روز ٹھہرے تو دونوں دن شام کے وقت بازدید (RETURN VISIT) کے طور پر وہ ہمارے ہوٹل تشریف لاتے رہے۔ بلکہ ایک دن تو ایسا ہوا کہ میں اپنے ہوٹل سے کافی فاصلہ پر ایک گنجان سڑک پر پاپیادہ چل رہا تھا کہ مرحوم اس وقت ہمارے ہوٹل جا رہے تھے کسی طرح ان کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی تو کاروں کے اس بے پناہ ہجوم میں ہی اپنی کار میرے قریب لا کر روک لی اور مجھ کو اپنے ساتھ لے لیا۔ اب ان بزرگانہ اخلاق و مقام کے لوگ کہاں ملیں گے۔!!

فروش گاہ فردوسی آقائے مرحوم سے رخصت ہو کر ہم دونوں فروش گاہ فردوسی آئے۔ تہران ایران کا دار الحکومت ہے۔ اس لئے نہایت وسیع بہت خوب صورت اور گنجان شہر ہے جس طرف نکل جائیے عالی شان عمارتیں، دفاتر، مکانات اور بازار ہیں۔ لیکن ان سب میں بازار کی حیثیت سے فروش گاہ فردوسی

کو وہی اہمیت اور عظمت حاصل ہے جو پرانی دہلی میں چاندنی چوک کو اور کلکتہ میں چورنگی کو ہے۔ بسڑکیں نہایت کشادہ اور صاف ستھری، کاروں اور پاپیادہ لوگوں کی ریل پیل۔ چھوٹی بڑی دکانیں زرق برق قسم قسم کے سامانوں سے بھرپور۔ مغرب کے بعد رنگ برنگ کی روشنیوں کے باعث یہ پورا علاقہ گلزار اِرم نظر آتا ہے۔ مجھ کو نہ شاپنگ سے دل چسپی ہے اور نہ میں اس کا اہل ہوں۔ اس کے برعکس اقبال صاحب کو اس سے دل چسپی ہے اور اس کے ماہر بھی ہیں اس لئے میں اور معتمدی ہم دونوں اقبال صاحب کے تابع بنکر دکان بدکان بازار میں پھرتے اور مختلف چیزوں کا بھاؤ پوچھتے پھرتے۔ اقبال صاحب نے کچھ چیزیں بہت کچھ بھاؤ تاؤ کرنے کے بعد خریدی بھی! اس کے بعد ہم نے پورے بازار کا ایک گشت کیا اور آٹھ بجے کے قریب ٹیکسی میں بیٹھ ہوٹل واپس آ گئے اور ہم کو شب بخیر کہہ کر معتمدی گھر واپس ہو گئیں۔

قم

دوسرے روز یعنی ۲۵ر مارچ کو ڈاکٹر صلاح الدین المنجد۔ ڈاکٹر اقبال انصاری اور راقم الحروف ہم تینوں نے قم جانے کا پروگرام بنالیا۔ آنا جانا اگرچہ ٹیکسی سے ہوا لیکن کرایہ کانفرنس نے ادا کیا۔ اپنے ساتھ رہنمائی کے لئے ایک مقامی شیعہ عالم کو لے لیا تھا۔ صبح آٹھ بجے ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم چاروں روانہ ہوئے اور ڈھائی تین گھنٹہ میں قم پہنچ گئے جو تہران سے ایک سو پچاس کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ ایران کا پرانا اور تاریخی شہر ہے۔ کتابوں میں عام طور پر اس کا ذکر قاشان کے ساتھ معطوف ہو کر آتا ہے۔ بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے نہاوند کی فتح کے بعد ۲۳ھ میں اس کو فتح کیا اور ۸۳ھ میں حجاج بن محمد بن یوسف الثقفی کی گورنری کے زمانہ میں اس کی شہر بندی ہوئی۔ معجم البلدان میں یاقوت حموی کا بیان ہے کہ اس کا اصل نام کمندان تھا۔ عربوں نے اس کو فتح کیا تو پہلے نام کا آخری جزو "ان" اڑا دیا اور پھر "کمند" کو "قم" کر لیا گیا۔ نظامی عروضی سمرقندی نے یہاں کا ایک دل چسپ واقعہ یہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ صاحب بن عباد نے ایک قاضی کو اس کے عہدے سے معزولی کا خط لکھا تو اس میں تحریر کیا:

ایها القاضی بقُمّ : قد عزلناک فقُم : اس کے بعد قاضی غریب جب کسی سے ملتا اس سے کہتا: انا معزول السجع بلا سبب وشیٔ وقع : بہرحال قم کو تاریخ اسلام میں علمی اور دینی طور پر

ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اور فرقہ شیعہ امامیہ کی روایات میں تو اس شہر کے فضائل ومناقب کم وبیش وہی ہیں جو اہل سنت والجماعت کی روایات میں ، دمشق ۔ شام ۔ اور یمن کے ہیں ۔ چنانچہ ان حضرات کے ہاں ایک مشہور روایت ہے : لولا القمیون لضاع الدین ۔ ہمارے نزدیک نہ سنیوں کی وہ روایات بھروسہ کے قابل ہیں ، اور نہ یہ شیعہ روایات ! لیکن اس کے باوجود کتابیں ہیں کہ ان روایات سے بھری پڑی ہیں فیا ماساۃ الاسلام ! چنانچہ خاص فضائل قم پر ایک دو نہیں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ شیخ محمد علی قمی نے اپنی کتاب تاریخ قم کے مقدمہ میں جس کا اصل نام انوار المشعشعین ہے اور جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے ان کتابوں کا ذکر کیا ہے ۔ بہرحال علمی اور دینی اعتبار سے اس شہر کو جو شہرت اور عظمت حاصل رہی ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور خوشی کی بات ہے کہ اس زمانہ میں بھی اس کی یہ حیثیت بڑی حد تک قائم ہے ۔

روضۂ جناب معصومہ شیعہ حضرات کے ہاں اس شہر کے تقدس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں جناب معصومہ جو امام موسیٰ کاظم کی دختر فرخندہ گوہر اور امام علی رضا کی بہن تھیں ان کا مزار یہیں ہے ۔ جو مرجع عوام وخواص ہے اور اس کی زیارت کو شیعہ روایات میں بہشت کی ضمانت قرار دیا گیا ہے شیخ محمد علی قمی نے ان کی وفات کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ جب مامون الرشید ، علی بن موسیٰ الرضا کو ان کے لئے ولی عہدی کی بیعت لینے کی غرض سے مدینہ سے ساتھ لے کر مرو گیا تو جناب معصومہ کو جن کا اصل نام فاطمہ تھا ۔ بھائی سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی اور وہ اپنے مستقر سے روانہ ہوگئیں ۔ مقام ساوہ کے قریب پہنچ کر بیمار پڑ گئیں تو پوچھا : قم یہاں سے کتنی دور ہے ؟ لوگوں نے جواب دیا : دس فرسنگ ! یہ سن کر آپ نے خادم کو حکم دیا کہ مجھ کو قم لے چل ! " چنانچہ آپ قم پہنچیں ۔ چند روز کے بعد آپ کی وفات ہوگئی تو یہاں کے گورنر موسیٰ بن خزرج بن سعد نے تجہیز وتکفین کے بعد خود اپنی مملوکہ زمین میں آپ کی تدفین کی ۔ اس پر ایک قبہ بنوایا (ص ۲۰۷ و ۲۰۸)

ہم جب شہر قم میں داخل ہوئے تو پہلے سیدھے اس روضہ پر آئے ۔ فاتحہ پڑھی اور گھوم پھر کر اس کی مختلف عمارتوں کو دیکھا ۔ چہل پہل ، رونق وزینت اور شان وشوکت اس روضہ کی وہی ہے جو مشہد میں جناب علی الرضا کے روضہ کی ہے ۔ مقبرہ کا گنبد ، اس کے دروازے اور ستون سب پر شیشہ بندی

اور مینا کاری کا اس درجہ حسین و جمیل کام ہے کہ نگاہوں کو اس پر جمنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا اندرونی حصہ اور صحن دونوں مردوں اور عورتوں سے پر تھے۔ اِدھر اُدھر لوگوں کی مختلف ٹولیاں بنی ہوئی تھیں جن کے وسط میں مجلس خوان سلام و منقبت یا مرثیے پڑھ رہے تھے۔ خود بھی روتے اور دوسروں کو بھی رلاتے جاتے تھے۔ مقبرہ سے باہر نکل کر اس کی مختلف عمارتوں کا جن میں ایک مسجد بھی ہے، جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اس کی حیثیت یہاں وہی ہے جو ہمارے ہاں دہلی میں مقبرۂ نظام الدین اولیا یا ہمایوں کے مقبرہ کی ہے۔ یعنی لوگ فاتحہ اور حصول برکت و سعادت کے لئے بھی آتے ہیں اور سیر و تفریح اور وقت گذاری کے لئے بھی! یہاں بھی یہ دیکھ کر سخت افسوس اور صدمہ ہوا کہ روضہ کے نہایت وسیع صحن میں اِدھر اُدھر جا بجا سینکڑوں قبریں تھیں جن کے تعویذ ہم سطح زمین تھے۔ ان تعویذوں پر میت کے نام اور تاریخ وفات کے ساتھ قرآن مجید کی کوئی آیت یا کوئی حدیث وغیرہ بھی کندہ ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوصف عورت مرد، سب ان قبروں پر قدم رکھ کر بے تکلف چلتے پھرتے تھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس سے اجتناب ہو بھی نہیں سکتا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ قم کی علمی اور مذہبی حیثیت اب بھی قائم ہے۔ چنانچہ یہاں متعدد کتب خانے ہیں۔ بازار میں کتابوں کی دکانیں کثرت سے ہیں۔ مدارس اور مکاتب بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ علماء عمامہ برسر اور جبہ در بر ہر کوچہ و برزن میں نظر آتے ہیں۔ شہر میں قدیم تہذیب کی سنجیدہ فضا اب بھی قائم ہے۔ سڑکیں وسیع اور کشادہ ہیں۔ لیکن عمارتیں اور مکانات طرز قدیم کے ہیں۔ زن و مرد سب قومی لباس اور ایرانی وضع قطع میں دکھائی دیتے ہیں۔ روضہ کی زیارت سے فارغ ہو کر اس کے قریب ہی کی ایک بڑی عمارت میں ایک بڑا کتاب خانہ تھا وہاں پہنچے۔ یہاں مطبوعہ کتابوں کے وسیع ذخیرہ کے علاوہ مخطوطات بھی خاصی تعداد میں تھے۔ ہم نے پہلے مخطوطات کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالی اور اس کے بعد چند مخطوطات منگوا کر دیکھے بھی۔ یہاں شیخ طوسی کے بعض ایسے نادر رسائل مخطوط کی شکل میں موجود تھے جو شاید دوسری جگہ نہ ہوں۔ صاحب مکتبہ جو صاحب علم اور صاحب ذوق ہونے کے ساتھ بڑے خلیق اور ملنسار بھی ہیں۔ انھوں نے چائے وغیرہ سے تواضع کی۔ اور ہم اب یہاں سے روانہ ہو کر بازار میں آ گئے۔

دار التبلیغ اسلامی — قم میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا ایک عظیم الشان ادارہ ایک عرصہ سے قائم

ہے۔ عربی فارسی اور انگریزی میں چھوٹے چھوٹے پمفلٹ مختلف موضوعات پر طباعت اور کاغذ کے بڑے اہتمام سے شائع کرتا اور انہیں مفت تقسیم کرتا ہے۔ اس ادارہ کے مختلف شعبہ جات ہیں ان میں سے ایک شعبہ رد مسیحیت اور مشنریز نے اسلام پر جو یلغار رچائی ہے اس کے موثر جواب کا ہے۔ اس سلسلہ میں اب تک جو پمفلٹ شائع ہوئے ہیں ان کی نوعیت کا اندازہ حسب ذیل عنوانات سے ہوگا۔

(۱) دور نمائے مسیحیت کنونی (۲) ارزیابی کتب مقدسہ یہود و نصاریٰ (۳) غذائے فکر برائے مسیحیان سنہ بخش (۴) اناجیل راشناسیم (۵) دربارۂ عہد جدید (۶) نظریۂ فدائی مسیح (۷) تثلیث (۸) عشاء ربانی مقدس (۹) معجزات حضرات مسیح (۱۰) زندگی حضرت مسیح وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ایک شعبہ خالص اسلامی عقائد و اعمال و اخلاق پر۔ اور ایک شعبہ تہذیب جدیدہ کے مسائل پر جو نوجوانوں کے لئے عام گمراہی کا باعث بنے ہوئے ہیں، مختلف زبانوں میں رسالے اور پمفلٹ شائع کرنے کے لئے مخصوص ہے۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ شیعہ سنی اختلافات کا ہلکا سا شائبہ بھی نہیں ہے۔ غرض کہ یہ ایک بڑا ادارہ ہے جو خلوص دیکجہتی اور عزم و ہمت سے نہایت باقاعدگی اور ضبط و نظم کے ساتھ اپنے مقاصد کے مطابق کام کر رہا ہے۔ اور اس کی صدائے بازگشت ایران سے باہر دوسرے ملکوں میں بھی سنی جا سکتی ہے۔ میں اس ادارہ سے تھوڑا بہت کچھ واقف تھا۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اس موقع پر ادارہ کا تصور ذہن سے بالکل خارج ہو گیا۔ چنانچہ کتاب خانہ دیکھ کر ہم لوگ بازار میں آئے تو ڈاکٹر اقبال انصاری نے ڈاکٹر صلاح الدین المنجد اور میں، ہم دونوں سے کہا: آپ دونوں یہاں بازار کی سیر کریں مجھ کو فلاں نمبر کے مکان میں ایک صاحب سے ملنا ہے ان سے مل کر ابھی آدھ گھنٹہ کے اندر اندر آتا ہوں۔ چنانچہ وہ یہ کہہ کر چل دیئے اور ہم بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ کافی دیر اور انتظار کے بعد جب واپس آئے اور معلوم ہوا کہ وہ دراصل دار التبلیغ کے دفتر گئے تھے اور وہاں سے کافی لٹریچر لائے اور امیر ادارہ سے ملاقات اور گفتگو کر کے آئے ہیں تو مجھ کو اپنی محرومی پر سخت افسوس ہوا۔ معلوم ہوا کہ لنچ کا وقت ہو جانے کی وجہ سے اب دفتر بند بھی ہو گیا ہے ورنہ لپک کر ایک نظر تو میں بھی ڈال آتا — خیر یار زندہ صحبت باقی!

چلو کباب چلو کباب ایران کی بہت پسندیدہ اور مقبول غذا ہے۔ کھانے کی دکانوں اور ہوٹلوں پر

جگہ جگہ اس کے بورڈ نظر آتے ہیں۔ میں بیرونی ملکوں کے سفر بہ عام طور پر انگریزی قسم کے کھانے کا عادی ہوں اور انہیں پسند کرتا ہوں۔ اس لئے اب تک ایران کی یہ قومی غذا کھانے کیا اس کو دیکھنے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی۔ اب لنچ کا وقت ہوگیا تھا اس لئے ہم چاروں آدمی ایک ریستاران میں گھس گئے۔ جو چلو کباب کے لئے مخصوص تھا۔ یعنی یہاں اس کے سوا کوئی اور کھانا تھا ہی نہیں۔ خاصہ بڑا ریستاران تھا لیکن اس وقت عورتوں مردوں اور بچوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور سب بڑے شوق سے اپنے کام میں مشغول تھے ہم کو بڑی مشکل سے جگہ ملی۔ کوئی کہیں بیٹھا اور کوئی کہیں۔ بیٹھتے ہی ایک بڑی پلیٹ میرے سامنے رکھ دی گئی۔ میں نے جائزہ لیا تو دیکھا پلیٹ میں سب سے نیچے گوشت کا ایک ماہی نما لانبا چانپ (جس کو یہ لوگ کباب کہتے ہیں) رکھا ہوا تھا۔ اس پر خشک چاول مگر عمدہ قسم کے بہت کافی مقدار میں پڑے ہوئے۔ چاولوں کے اوپر ایک مکھن کی ٹکیہ، ساتھ ہی پنیر کا ایک ٹکڑا اور اس پر ترکاری کے قسم کی کوئی چیز۔ پلیٹ کے ساتھ ایک برتن میں دہی الگ اور ایک طشتری میں کچھ سلاد۔ بس لیجئے! یہ ہے چلو کباب کا پورا سرمایۂ وجود! اب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کھاؤں کس طرح؟ میرے آس پاس جو ایرانی مصروفِ طعام تھے ان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور آخران کی نقالی میں پہلے چھری سے میں نے کباب کے ٹکڑے کئے اور اس کے بعد چمچہ سے سب چیزوں کو الٹ پلٹ کر کے ایک دوسرے کے ساتھ لت پت کر دیا۔ پھر چمچہ سے ہی اس کو اس طرح کھانا شروع کیا کہ ایک دو نوالہ چاول کے لیتا اور ایک گھونٹ دہی کا پی لیتا تھا۔ سات آٹھ نوالے اس طرح زہر مار کئے ہوں گے کہ کام و دہن نے ساتھ چھوڑ دیا اور میں دہی کا گھونٹ بھر کر کھڑا ہوگیا۔ رستوران سے باہر آکر ٹیکسی میں جو ہمارے ساتھ تھی پورے شہر کا ایک چکر لگایا تاکہ اسکا اندازہ ہو سکے۔ جو ایرانی عالم بطور رہنما ہمارے ساتھ آئے تھے ان کی سسرال یہیں تھی اس لئے تھوڑی دیر کے لئے ہم یہاں بھی آئے۔ یہاں ظہر کی نماز ادا کی۔ خشک میوہ اور تازہ پھلوں کے ساتھ چائے پی اور پھر تہران میں اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد معتمدی آگئیں اور میں ان کے ساتھ باہر جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اتنے میں پروفیسر سید حسین نصر اور ان کے بعد پروفیسر بدیع الزماں فروزانفر آگئے۔ پروفیسر سید حسین نصر آج کل تہران یونیورسٹی میں ہیں۔ لیکن اپنے علم و فضل اور افکار و خیالات کی

وجہ سے صرف ایران کے نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے نامور اور بلند پایہ مصنف اور مفکر ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ کے تعلیم یافتہ اور وہاں کے ڈاکٹر ہیں۔ دل اور دماغ کے لحاظ سے نہایت راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ قدرت نے ان میں سائنس، مذہب اور فلسفہ تینوں کا نہایت حسین اجتماع کر دیا ہے انگریزی زبان پر غیر معمولی قدرت ہے۔ اب تک ان کے قلم سے بیسیوں مقالات کے علاوہ انگریزی اور فارسی میں سات آٹھ کتابیں نکل کر شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تصنیف و تالیف کا بنیادی موضوع دو ہی چیزیں ہیں۔

(۱) یہ کہ سائنسی علوم و فنون میں مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں عالم حاضر کو ان سے متعارف کرانا اور (۲) دوسری یہ کہ موجودہ سائنس ٹکنالوجی اور تہذیب جدید نے انسانیت اور تہذیب کے لئے جو مشکلات پیدا کر دیئے ہیں اسلام کی تعلیمات اور اس کے افکار و نظریات کی روشنی میں ان کا حل پیدا کرنا اور انسانِ جدید کے سامنے اسے پیش کرنا چنانچہ ان کی کتاب کائناتی عقیدہ اخوان الصفا ابن سینا اور ابو ریحان البیرونی کے یہاں (انگریزی) اور دوسری کتاب "معارف اسلامیہ در جہان نو" (فارسی) مقصد اول کی ترجمان ہیں۔ اور ان کی کتاب "عہد جدید کے انسان کا روحانی ابتلا" مقصد ثانی کی حامل ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ہمارے مصنفین اسلامیات پر انگریزی یا یورپ کی کسی اور زبان میں لکھتے ہیں تو ان کا لب و لہجہ عموماً دفاعی (DEFENSIVE) یا معذرتانہ (APOLOGETIC) ہوتا ہے لیکن سید حسین نصر کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا انداز جارحانہ (AGGRESSIVE) یا ایجابی (ASSERTIVE) ہوتا ہے۔ ان خصوصیات کے باعث چند برسوں میں ہی انھوں نے عالم اسلام اور یورپ و امریکہ میں غیر معمولی شہرت حاصل کر لی ہے۔

میری اور پروفیسر سید حسین نصر کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب کہ جنوری ۱۹۶۴ء میں نئی دہلی میں بین الاقوامی اورینٹل کانفرنس ہوئی تھی۔ ایک روز اسی کانفرنس کے زیر اہتمام مسٹر عبد الکریم چھاگلہ جو اس زمانہ میں وزیر تعلیم تھے ان کی صدارت میں مسلم پرسنل لا پر ایک سمپوزیم منعقد ہوا تھا اس میں پہلی تقریر میری تھی اور غالباً چوتھی تقریر سید حسین نصر کی (یہ سب تقریریں گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں) بس یہ تھی میری اور ان کی پہلی ملاقات، اس کے بعد نہ کہیں ان سے ملنا ہوا اور نہ خط و کتابت کی نوبت آئی۔ اس درمیان میں ان کے مقالات اور ان کی کتابیں برابر پڑھتا رہا اس لئے وہ مجھ کو نہ صرف یہ کہ یاد رہے بلکہ ان کی قدر و منزلت میں اضافہ

ہوتا رہا۔ خود اپنے متعلق میرا خیال یہ تھا کہ اگرچہ میرے چند مقالات انگریزی اور عربی میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ لیکن ان کو مستثنیٰ کر کے میرا سرمایہ تصنیف وتالیف جو کچھ بھی ہے وہ اردو میں ہے۔ اس بنا پر اب میں سید حسین نصر کو کہاں یاد ہوں گا، لیکن اس وقت مجھ کو سخت مسرت انگیز تعجب ہوا جبکہ موصوف نے مجھ کو دیکھتے ہی بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور فرمایا: میں نے اخبارات میں پڑھا تھا کہ آپ آئے ہیں تو آپ سے ملاقات کا بڑا اشتیاق تھا، میں خود بعض مجبوریوں کے باعث مشہد آ کر جشن طوسی میں شریک نہ ہو سکا؛ اس کے بعد انھوں نے اپنی بالکل ایک نئی کتاب اپنے دستخط کر کے مجھ کو نذر کی اور چند اور اہم اور بلند پایہ علمی مجلات کے خاص نمبر بھی عطا کئے جن میں ان کے مقالات چھپتے رہے ہیں۔ میں نے اس عزت افزائی پر ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ پھر دیر تک ہم بیٹھے عالم اسلام کے مختلف مسائل ومعاملات پر سیر حاصل گفتگو اور تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ اسی اثنا میں یہ جان کر مزید خوشی ہوئی کہ وہ "برہان" اور "ندوۃ المصنفین" سے واقف تھے اور میرے متعدد مقالات ان کی نظر سے گذر چکے تھے۔ مجھے بارہا یہ خیال ہوا ہے اور اب بھی ہے کہ اگر عالم اسلام میں دس بارہ سید حسین اور پیدا ہو جائیں تو آج امریکہ اور یورپ میں ایک عظیم ذہنی اور فکری انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ سید حسین نصر جب رخصت ہونے لگے تو انھوں نے اس پر اظہار افسوس کیا کہ نوروز کی تعطیلات کی وجہ سے تہران یونیورسٹی اور دوسرے علمی وادبی ادارے بند ہیں ورنہ وہ میرے دو تین لکچروں کا انتظام کراتے۔ یہ سن کر افسوس مجھے بھی ہوا کیوں کہ اس بہانہ تہران میں قیام اور وہاں کے ارباب علم وادب سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا زیادہ موقع ملتا۔

حیاتِ عبدالحی مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنی رح (سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کی سوانح حیات، علمی کمالات، دینی خدمات اور ان کی عربی اور اردو تصنیفات پر مفصل تبصرہ معہ ضمیمہ مختصر حالات مولانا مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رح (سابق ناظم ندوۃ العلماء)

مولفہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں صاحب ندوی مدظلہ العالی۔ کتابت وطباعت اعلیٰ کاغذ عمدہ سفید سائز متوسط ۲۰×۳۰/۸ قیمت غیر مجلد دس روپے مجلد گیارہ روپے

پتہ

ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

سولھویں قسط

تاریخِ طبری کے مآخذ

نوشتہ :۔ ڈاکٹر جواد علی ، عراق اکادمی بغداد
ترجمہ :۔ نثار احمد فاروقی ، دہلی کالج ، دہلی

(۱۶)

[سلسلے کے لئے ملاحظہ ہو : برہان جون ۱۹۶۹ء]

حقیقت یہ ہے کہ علمائے شعر ولغت اس شخص سے گھبراتے تھے۔ کیونکہ یہ کلام عرب کا عالم تھا اور اس لئے پیر بدل کرنے یا گھڑ لینے میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ الاصمعی نے کہا تھا " حماد سب سے زیادہ عالم تھا۔ بشرطیکہ وہ بھلا مانس رہے۔ یعنی اخبار و اشعار میں گھٹائے بڑھائے نہیں۔ کیونکہ اس پر یہ الزام ہے کہ وہ خود شعر کہتا تھا۔ اور شعرائے عرب کے نام سے مشہور کر دیا تھا"۔ اور المفضل الضبی کا قول ہے " حماد الراویہ کی وجہ سے شاعری پر وہ چیز غالب آگئی ہے جس نے ایسی گڑبڑ پیدا کر دی ہے جو قیامت تک ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ اس پر لوگوں نے کہا کیا وہ روایت میں غلطی کرتا ہے یا تلفظ خراب ہے؟ اس نے کہا " کاش ایسا ہی ہوتا! اہل علم غلط کو صحیح تو کر لیتے! مگر وہ تو لغات عرب اور اشعار کا عالم ہے۔ اور شاعروں کے انداز و اسلوب کا جاننے والا ہے۔ ان کے مطالب کو پہچانتا ہے، چنانچہ خود ایسے شعر گھڑ لیتا ہے جو کسی شاعر کے رنگ سے ملتے جلتے ہوں۔ اور اس کے کلام میں شامل کر دیتا ہے، پھر یہ اس کی روایت سے ساری دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔ اور قدما کے اشعار میں ایسے مخلوط ہو جاتے ہیں کہ صحیح کو غلط سے تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ صرف کوئی عالم اور ناقد ہی ان کو پرکھ سکتا ہے اور ایسا کوئی ہے کہاں؟ [1] تو یہ ہے وہ حماد جس کا رواۃ شعر میں شمار ہے۔ اور بھی کچھ لوگ ہیں جنہوں نے ایسی ہی حرکتیں کی ہیں۔

عمر کسری المسعودی نے ملوک الطوائف کی خبریں ابو عبیدہ کی ایک کتاب سے نقل کی ہیں جو اس نے اہل فارس کے اخبار میں لکھی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی روایت اس نے عمر کسری سے لی تھی [2]۔ غالباً اس کی مراد وہ کتاب ہے جسے

---

[1] الارشاد ۴/۱۴۰

[2] مروج الذہب ۱/۱۹۹

ابن الندیم "کتاب فضائل الفرس" کہتا ہے [1]

غالباً ابوعبیدہ نے اپنی کتاب میں ایرانیوں سے متعلق اخبار کی حد تک عمر کسری کی تحقیقات پر بھروسہ کیا ہے۔ اس لئے المسعودی نے یہ لکھا ہے کہ اس نے عمر کسری سے روایت کی ہے [2] المسعودی نے ابوعبیدہ کی اور کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

جن سے اس نے اخذ کیا۔ ان میں ایک کتاب "مقاتل فرسان العرب" بھی ہے۔ المسعودی نے اس کا مقابلہ ایک اور کتاب سے کیا ہے۔ جسے وہ مقاتل فرسان العجم کہتا ہے۔ [3] دوسری کتاب "مناقب قریش" ہے جس سے المسعودی نے حلف المطیبین [4] کے اخبار لئے ہیں۔ اسی طرح ایک کتاب الدیباج ہے۔ اس کی طرف اشارہ او فیاء عرب (بات کے دھنی) کے حالات میں ملتا ہے [5]

یہ عمر کسری ان لوگوں میں تھا جو ایران کے بارے میں معلومات اور وہاں کے بادشاہوں کی تاریخ سے واقفیت رکھنے میں مشہور تھے۔ اسی باعث اس کا لقب عمر کسری پڑ گیا تھا [6]

الہیثم بن عدی

اور الہیثم بن عدی ابوعبدالرحمن [7] (متوفی ۲۰۶ھ یا ۲۰۷ھ) بھی اخبار، انساب اور شعر کے علماء میں سے ہے۔ ان موضوعات پر اس کی متعدد تصانیف ہیں۔ جن میں کتاب اخبار الفرس، کتاب تاریخ العجم دبنی امیہ اور تاریخ کی چند کتابیں شامل ہیں۔ جن میں التاریخ علی السنین بھی ہے [8] یہ عربی کی قدیم ترین کتابوں میں سے ہے۔ جن میں تاریخی واقعات سنہ وار درج ہوئے ہیں۔ لیکن یہ ناپید ہے۔ اور ہم تک اس کا کوئی نسخہ نہیں پہنچا۔

---

[1] الفہرست / ۱۰۶ [2] لوفیات ۲/ ۴۰ [3] المروج ۱/ ۴۱۲ [4] التنبیہ / ۹۰ نیز بروکلمان (ضمیمہ) / ۱۶۲ [5] التنبیہ / ۱۰۰ [6] الغار / ۲۰ [7] المروج ۱/ ۱۶۹ [8] الفہرست ۱۴۵ الوفیات ۲/ ۲۴۹ وبعدہٗ الارشاد ۷/ ۲۶۰، الیافعی، المرآۃ ۲/ ۳۲، الخطیب، تاریخ بغداد ۱۴/ ۵۰

الصفدی، الوافی ۱/ ۱۵ ھ الفہرست / ۱۴۵، الوفیات ۲/ ۲۴۹

تاریخ طبری میں الہیثم بن عدی کا نام ۳۱ جگہ آیا ہے۔ [1] ان مواقع کا ہم آگے ذکر کریں گے۔

قبیلہ طی کا ذکر کرتے ہوئے المسعودی نے بھی الہیثم ابن عدی کا نام لیا ہے۔ [2] یہ شاید اس نے ابن عدی کی کتاب سے اخذ کیا ہے۔ جسے ابن الندیم "کتاب اخبار طی و نزولہا الجبلین" کہتا ہے [3] دوبارہ اس نے وہ کتاب التنبیہ والاشراف میں اس کا ذکر بصرہ کی آبادکاری کے بیان میں کیا ہے۔ [4] الہیثم کی ایک تصنیف کتاب قضاۃ الکوفہ والبصرہ تھی۔ اور دوسری کتاب فخر اہل الکوفہ علی البصرہ ہے۔ وہ سب سے پہلے اقسام خطبہ لکھنے والوں میں بھی ہے۔ چنانچہ اس کی ایک کتاب خطط الکوفہ کا نام بھی ملتا ہے [5] ان کے علاوہ بھی کچھ تصانیف تھیں جو اب نہیں ملتیں۔

سیف بن عمر الطبری نے فتح ایران و عراق کے سلسلے میں ساسانیوں کی حکومت کے آخری زمانے تک، کے حالات میں سیف کی روایات پر اعتماد کیا ہے۔ یہ سیف بن عمر التمیمی او البغنی الاسدی (متوفی ۱۸۰ھ) ہے [6] یہ تاریخ اسلام پر عموماً اور ردہ اور فتوح کے موضوع پر خصوصاً وسعت معلومات کے لئے مشہور ہے۔ اس نے مشہور اخباریوں اور ماہرین انساب سے اخذ کیا۔ جن میں ہشام بن عروہ، محمد بن اسحٰق مؤلف السیرۃ، محمد بن السائب الکلبی اور طلحہ بن الاعلم وغیرہ شامل ہیں۔ ابن الندیم نے اس کی تصانیف میں کتاب الفتوح الکبیرہ، کتاب الردہ، کتاب الجمل اور سیرۃ عائشہ و علی کا ذکر کیا ہے [7]

---

[1] تاریخ طبری (فہرست) مرتبہ دی غوے / ۶۱۹ [2] التنبیہ / ۱۷۷
[3] الفہرست / ۱۵۰ [4] التنبیہ / ۲۰۷ [5] الفہرست / ۱۴۶
[6] التہذیب ۴ / ۲۹۵ [7] الفہرست / ۱۳۷

مگر اہل حدیث نے اسے ضعیف، گھڑنے والا اور زندیق کہا ہے۔ ابو حاتم نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ یہ "متروک الحدیث" ہے۔ اس کی احادیث الواقدی جیسی ہوتی ہیں۔ [۱]

تاریخ طبری میں سیف کا نام تین سو سے زائد مقامات پر آیا ہے۔ پہلی بار ۱۱ھ کے حالات میں ملتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مسیلمہ نے رسول اللہ کی حیات میں نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اور آخری حوالہ ۳۶ھ کے حوادث میں آیا ہے۔ جہاں علی بن ابی طالب کے صفین میں خروج کا ذکر ہے۔ اس کے بعد طبری نے اس کی کوئی روایت درج نہیں کی ہے۔ [۲]

ہشام بن عروہ

جن مشائخ سے سیف نے اخذ کیا ان میں ہشام بن عروہ (متوفی ۱۴۶ھ یا ۱۴۷ھ) ہیں جو مدینہ کے محدث اور نساب اور اخباری تھے۔ انہوں نے اپنے باپ عروۃ بن الزبیر اور چچا عبد اللہ بن الزبیر سے اخذ کیا تھا۔ ہشام نے عراق اور کوفہ کا سفر بھی کیا تھا اور خلیفہ المنصور سے ملے تھے۔ ان سے اہل کوفہ نے عروہ کی احادیث اخذ کیں۔ خاص طور سے وہ احادیث جو عروہ نے عائشہ سے روایت کی ہیں۔ ان کے ہم وطنوں نے ان پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ حدیث میں اہل عراق کا بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ اور اہل مدینہ کے بیان میں کنجوس ہیں۔ بظاہر عروہ نے اہل کوفہ اور عراق سے اہل عراق کی احادیث بیان کی ہیں، اہل مدینہ اپنی احادیث پر ان کی حدیث کو فضیلت کیا دیتے وہ خود ہی حدیث و اخبار رسول سے خوب واقف تھے۔ کیونکہ ان کے لئے تو گھر کی بات تھی۔

---

[۱] التہذیب ۴ / ۲۹۵ [۲] فہرست الطبری / ۲۶۲
[۳] التہذیب ۱۱ / ۵۱

اس میں شبہ نہیں کہ الطبری نے ردّہ کے بیان میں سیف کی جس کتاب سے مدد لی ہے وہ کتاب الفتوح الکبیر والردّہ ہی ہے[1] یہ کتاب اتنی معروف ہوئی کہ سیف بھی اس کی نسبت سے مشہور ہو گیا[2] ابن الندیم نے اس کی ایک اور تالیف کا ذکر کیا ہے جس کا نام وہ کتاب الجمل اور سیر عائشہ وعلیؓ بتاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہی وہ کتاب ہے جس سے الطبری نے معرکۂ جمل سے متعلق سیف کی روایات اخذ کی ہیں۔ سیف نے اس معرکہ کے حالات چشم دید راویوں سے لئے تھے جن کے نام الطبری نے بھی دئے ہیں۔ اس طرح اس نے اس افسوسناک جنگ کی صحیح خبریں اور اس کے ان سیاسی اسباب کا بیان محفوظ کر دیا ہے جن کے دور رس اور اہم نتائج جزیرۂ عرب اور عالم اسلام پر مرتب ہوئے۔

مگر یہ روایات چھان پھٹک اور بحث کی محتاج ہیں۔ بروکلمان کا خیال ہے کہ سیف سے جو روایات بیان کی جاتی تھیں وہ ان کی تحقیق نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اس میں قبیلۂ تمیم کو بڑھاوا دینے کے لئے اور مبالغہ کر دیتا تھا۔ کیونکہ وہ خود قبائلی عصبیت رکھتا تھا[5]۔ یہ رائے خود بحث و نظر کی محتاج ہے۔ اور یہ دعویٰ کہ الطبری نے ان باتوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور اس لئے وہ انہیں قبول کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ اور وہ بعض روایات کے چھوڑنے پر بھی مجبور ہوا۔ سو اس کی تصدیق الطبری کی کتاب سے تو ہوتی نہیں۔ مثلاً اخبار ردّہ میں الطبری نے اسے پہلا ماخذ قرار دیا ہے۔ اور دوسرے مراجع پر فضیلت دی ہے۔ اور معرکۂ جمل کی خبروں میں بھی اس کی روایات کو نمایاں امتیاز حاصل ہے۔ پھر یہ کہ اصلی کتاب تو آج تک ناپید ہے۔ پھر کیسے یہ اندازہ

---

[1] الفہرست/ ۱۲۷۔ طبری نے اس کا ذکر تو کیا ہے نام نہیں لکھا دیکھو جلد ۴/ ۱۵۳۔ فتح حمص بروکلمان (ضمیمہ) ۲۱۳ - ۲۱۴ - [2] التہذیب ۴/ ۲۹۵ [3] الفہرست/ ۱۲۷
[5] بروکلمان ضمیمہ/ ۲۱۴

ہوا کہ الطبری نے سیف کی وہ روایات چھوڑ دیں جو تمیم کی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے تھیں؟

اور السری کا نام تاریخ طبری میں ۴۱۲ سے زیادہ موقعوں پر ملتا ہے۔ سب سے پہلے اخبار ردّہ میں اور آخری بار ۱۴۵ھ کے حوادث میں۔ جو المنصور کا زمانہ ہے یہ شہر بغداد کی تعمیر کے بیان میں آیا ہے۔ طبری نے السری کے لئے ایسا صیغہ استعمال کیا ہے جو وہ عام طور پر نہیں کرتا۔[1] جیسے "ذکر عن السری" اور دوسرے مواضع پر یوں کہتا ہے "مجھ سے السری نے بروایت شعیب بیان کیا۔ یا "مجھے السری نے بروایت شعیب لکھا۔ یا" جو السری کو شعیب کی روایت سے لکھا گیا" اس سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ الطبری اس سے خط و کتابت کر کے معلومات حاصل کرتا تھا اور السری اسکے لئے سیف بن عمر کی کتابیں نقل کر کے بھیجتا تھا جو اس کے اپنے ذخیرے میں تھیں۔

السری بن یحییٰ یہ السری بن یحییٰ، شعیب بن ابراہیم الکوفی کے راویوں میں سے ہے[2] اس نے سیف بن عمر کی کتابوں کی روایت کی

اس کے متعلق ابن حجر العسقلانی کا قول ہے کہ "اس میں جہالت ہے" "وہ معروف بھی نہیں ہے۔ اس نے احادیث اور اخبار کی روایت کی ہے۔ اور وہ کچھ عیار بھی ہے"[3] مگر افسوس ہے کہ تاریخ طبری میں اتنی کثرت سے حوالہ آنے کے باوجود ہم ان دونوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ ابن الندیم کا یہ خیال غلط ہے کہ "سیف

---

[1] الطبری طبع ثالث ۶ / ۲۷۶ طبع لیدن۔ حوادث ۱۴۵ھ

[2] الطبری ۴ / ۱۲۴ (طبع مصر) طبع لیدن۔ طبع اول / ۱۹۷، ۱۸۴۵

[3] لسان المیزان ۳ / ۱۲ ، میزان الاعتدال ۱ / ۴۴۷

نے شعیب بن ابراہیم سے روایت کی ہے"[1] کیونکہ شعیب وہی شخص ہے جس نے سیف ابن عمر کی کتابوں کو روایت کیا۔ ابن الندیم اور دوسرے تراجم رجال لکھنے والے جو شعیب بن ابراہیم اور السری کے باب میں خاموش ہیں۔ اس کا سبب بظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں صاحب تالیف نہیں تھے۔ صرف سیف کی کتابوں کے راوی تھے تاریخ طبری سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سیف کی کتابیں السری بن یحییٰ کے پاس تھیں۔ اور الطبری نے ان میں سے کچھ اجزا، کی قراءت السری کے سامنے کی تھی اور کچھ باتوں کو لکھ کر اخذ کرلیا تھا۔

عبیداللہ بن سعد الزہری سیف بن عمر کی کتابوں سے اخذ کرنے میں الطبری نے ایک اور طریقہ بھی اختیار کیا ہے یہ عبیداللہ بن سعد الزہری[2] بن ابراہیم بن سعد بن عبدالرحمن بن عوف ابوالفضل البغدادی نزیل سامرا، (متوفی ۲۶۰ھ) کا واسطہ ہے[3] انہوں نے اپنے باپ سے اور چچا یعقوب سے اور بھائی ابراہیم بن سعد اور یونس بن محمد کے حوالے سے روایت کی ہے۔ اور خود ان سے ثقات کے ایک گروہ نے اخذ کیا۔ جو مشاہیر اہل حدیث میں ہیں۔ مثلاً بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی ابن ابی عاصم، البغوی، ابن ابی الدنیا وغیرہ۔

ان کا نام تاریخ طبری میں چالیس جگہ آیا ہے[4] جہاں ان کے بیان کا حوالہ ہے عبیداللہ نے سیف کے اقوال اپنے چچا یعقوب بن ابراہیم بن سعد الزہری نزیل بغداد

---

[1] الفہرست / ۱۳۷

[2] طبع لیدن میں ہے: عبیداللہ بن سعید الزہری، مگر یہ غلط ہے۔ صحیح سعد ہی ہے

[3] تہذیب التہذیب ۷ / ۱۵۔

[4] فہرس الطبری / ۳۶۷

(متوفی سنہ ۲۰۸ھ)[1] سے اخذ کیا۔ یہ سیف بن عمر کے اور بعض دوسرے اخباریوں کے راوی تھے۔ ان کے پاس ایسی کتابیں تھیں جن میں احادیث نبوی جمع کی گئی تھیں۔ اور الزہری کی کتابیں بھی انہوں نے اپنے باپ ابراہیم بن سعد سے بحوالہ الزہری اخذ کی تھیں۔ پھر اس سے اور لوگوں نے لکھا۔

یعقوب بن ابراہیم

اس کے مشائخ کی فہرست دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب صرف ایک محدث ہی نہیں تھا۔ بلکہ اصحاب تاریخ و ادب میں سے تھا اور شعر کا راوی تھا۔ اس کا نام تاریخ طبری میں ۳۹ جگہ آیا ہے۔ پہلی بار سنہ ۱۰ھ کے حوادث میں جہاں حجۃ الوداع کا بیان اور رسول اللہؐ کے مرض وفات کا ذکر ہے[2] یہ اس نے سیف کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک روایت جو سنہ ۱۱ھ کے کچھ حوادث سے متعلق ہے سیف ہی کے حوالے سے بیان ہوئی ہے۔

ان دو روایتوں سے[4] نیز دوسری روایات سے جو اس نے سیف بن عمر سے لی ہیں اور جو رسول اللہؐ کی وفات، ابوبکر کی بیعت اور سقیفہ وغیرہ سے[5] متعلق ہیں، اندازہ ہوتا ہے کہ سیرۃ اور اسلامی واقعات پر سیف کی کچھ اور کتابیں بھی تھیں۔ لیکن انہیں وہ شہرت نہیں ملی جو ان کتابوں کو نصیب ہوئی۔ جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ شاید ابن الندیم کے زمانے سے پہلے ہی یہ ضائع بھی ہو گئیں۔

الطبری نے جو اخبار یعقوب بن ابراہیم کے حوالے سے درج کئے ہیں ان میں اکثر سیف ہی سے آئے ہیں۔ اور اس کی تصانیف سے لئے گئے ہیں۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ تاریخ طبری اور یعقوب الزہری و شعیب بن ابراہیم کی روایات کا متن یکساں ہے

---

[1] تہذیب التہذیب ۱۱/ ۳۸۰ [2] الطبری (پہلا ایڈیشن) ۱/ ۱۷۴۹ [3] الطبری ۴/ ۱۷۹۴
[4] الطبری ۴/ ۱۸۲۴-۱۸۲۵ [5] الطبری ۴/ ۱۸۴۴، ۱۸۴۵، ۱۸۴۷، ۱۸۴۹

ابوروق الہمدانی فتوح کے بیان میں بھی الطبری نے سیف کی کتاب پر اعتماد کیا ہے۔ اور اس کتاب کا متن اکثر السری بن یحییٰ کے حوالے سے اخذ کیا ہے۔ عہد عثمانی کے فتنوں کے ذکر میں بھی اسی کا حوالہ ہے۔ مثلاً فتنۂ عبداللہ بن سبا جو ۳۲ھ میں بصرہ میں ظاہر ہوا۔ اسے سیف نے عطیہ بن الحارث ابوروق الہمدانی سے لیا تھا۔ جو کوفہ کے بڑے راویوں میں اور مشہور مفسروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا بیان گذر چکا ہے۔ یہ عکرمہ اور الشعبی اور الضحاک بن مزاحم کے راویوں میں سے ہے[1] الطبری نے ۴۶ جگہ اس کا نام لیا ہے[2] اس نے زمانہ ماقبل اسلام کے اخبار میں بھی کچھ جملے بیان کئے ہیں۔ جو اس کی تفسیر سے ماخوذ ہیں۔ الطبری کو اس کی اجازت اس کے شیخ محمد بن ابی منصور الآملی نے بواسطہ علی بن الہیثم[3] بواسطہ المسیب بن شریک ابوسعید التمیمی الکوفی شُدی تھی۔ الآملی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ضعیف راویوں اور متروکین میں سے ہے۔ اس نے ابوروق سے انہوں نے ضحاک بن مزاحم صاحب تفسیر سے روایت کی ہے۔

المثنیٰ بن ابراہیم الطبری کے شیوخ میں سے ایک اور نے بھی ضحاک کی تفسیر براویت ابوروق بیان کی ہے۔ یہ المثنیٰ بن ابراہیم الآملی ہیں جنہوں نے علی بن الہیثم سے انہوں نے المسیب بن شریک سے انہوں نے ابوروق سے روایت کیا۔ المثنیٰ کا نام تاریخ طبری میں اٹھائیس جگہوں پر آیا ہے[5] یہ سب تاریخ ماقبل اسلام یا اسرائیلیات کے ذیل میں ہے۔ سوائے ایک قبلہ کے بیان میں، اگرچہ اسے

---

[1] تہذیب التہذیب / جلد ۷ : ۲۲۴ [2] فہرس الطبری / ۱۹۶ [3] علی بن الہیثم البغدادی سے بخاری نے اور محمد بن علی الطبری اور حسین بن اسماعیل المحاملی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ تہذیب التہذیب ۷/ ۲۹۴ [4] لسان المیزان ۶/ ۲۶ [5] فہرس الطبری / ۴۹۷۔

بھی یہودیات سے علاقہ ہے[۱] یہ اصحاب تفاسیر میں سے تھے یا تفسیر کی روایت کرتے تھے۔ ان کی اکثر روایات اسحاق بن الحجاج سے ہیں[۲]

یزید الفقعسی

عطیہ بن الحارث ابو روق نے یزید الفقعسی سے انہوں نے ابو العریف سے بھی روایت کی ہے۔ تاریخ طبری میں یزید الفقعسی کا نام پانچ جگہ ملتا ہے۔ یہ حوادث عثمان و علی کے ذیل میں آیا ہے۔[۳] ان سے عبداللہ بن سبا کا قصہ بھی روایت ہوا ہے۔ اسی طرح ابو ذر الغفاری کا قصہ اور مسلمانوں کی دولت کے سلسلے میں ان کے خیالات، عبداللہ بن سبا کی بصرہ میں آمد اور اس کا حکیم بن جبلہ کے گھر ٹھہرنا[۵]۔ جو فتنۂ بصرہ کا لیڈر تھا، پھر ابن سبا کی تحریک اس کا نسب اور اطراف و جوانب سے اس کی مراسلت[۶] کرنے کا بیان، روایت ہوئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگا کہ سیف نے جو کچھ یزید الفقعسی سے لیا ہے وہ ایک خاص موضوع سے متعلق ہے۔ یعنی وہ فتنہ ہے جو عثمان بن عفان کے خلاف اٹھا تھا۔ اس فتنے کی یہی وحید روایت ہے۔ دوسری روایات جو اور کتابوں میں ملتی ہیں، وہ روایات سیف ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔ ان کا مناسب تذکرہ تاریخ طبری کے ماخذ کے سلسلے میں وہاں کیا جائے گا، جہاں عہدِ عثمانی سے افسوسناک حالات کا بیان ہوگا۔

---

[۱] الطبری (پہلا ایڈیشن) / ۱۲۸۰ [۲] الطبری / ۷۸۵

[۳] الطبری / ۲۸۴۹، ۲۸۵۸، ۲۹۲۲، ۲۹۴۲

[۴] الطبری / ۲۸۵۸ [۵] الطبری / ۲۹۲۲

[۶] الطبری / ۲۹۴۲۔

تبصرے

محمد علی جناح از جناب کانجی دوارکاداس ترجمہ و ترتیب از جناب سید شہاب الدین صاحب دسنوی۔ تقطیع متوسط ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ کتابت و طباعت اور کاغذ اعلیٰ۔ قیمت مجلد ۵۰/۴ پتہ: علمی مجلس۔ دہلی۔

کانجی دوارکاداس ہندوستان کے بہت مشہور مصنف، قومی کارکن اور ہندوستانی سیاست کے نامور مورخ اور مبصر ہیں۔ موصوف نے ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ پر انگریزی میں دو کتابیں لکھی تھیں۔ ان کتابوں میں مسٹر محمد علی جناح کا تذکرہ بار بار اور مفصل آیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں اپنی عام روش کے مطابق فاضل مصنف نے جو کچھ لکھا ہے بالکل بے لاگ اور ایک نقاد کے نقطۂ نظر سے اور ان معلومات اور مشاہدات کی بنیاد پر لکھا ہے جو مسٹر جناح سے قرب تعلق کے باعث ان کو بلا کسی واسطہ کے براہ راست حاصل ہوئیں اور جن کو وہ اپنی یادداشت میں حسب معمول وقت کے وقت بڑی پابندی سے درج اور محفوظ کرتے رہے اس بنا پر اس آئینہ میں مسٹر جناح کی شخصیت کے جو خدوخال نظر آتے ہیں اصلی اور واقعی ہونے کے باعث جہاں وہ بڑے جاذب نظر حسین اور دلکش ہیں ساتھ ہی ان نقوش اور خطوط سے بالکل مختلف ہیں جو ہندوستان اور پاکستان میں جنگ آزادی کی تاریخ پر چھپی ہوئی کتابوں میں نظر آتے ہیں۔ اس میں جو تصویر ابھرتی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم ملک و وطن کی محبت میں کسی سے کم نہیں تھے۔ وہ نہایت شریف باوضع اور مخلص مگر ساتھ ہی بااصول انسان تھے۔ انھوں نے آخر تک کوشش کی کہ مسلمانوں کے معاملات و مسائل سے متعلق کانگریس کے ساتھ کوئی قابل اطمینان سمجھوتہ ہو جائے۔ لیکن جب اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا اور ہر طرف سے مایوسی ہوگئی تو مجبور ہو کر تقسیم ملک کا مطالبہ کیا۔ لیکن اس کے باوجود ان کا ارادہ خود ہندوستان میں رہنے کا تھا۔ چنانچہ ماہ نومبر ۱۹۴۵ء میں انھوں نے اپنے

بمبئی کے بنگلہ کی ازسرِ نو تعمیر کئی لاکھ روپے کے خرچ سے کرائی تھی اس کتاب کا ایک اقتباس سننے کے لائق ہے۔ فاضل مصنف لکھتے ہیں:-

"میں سمجھتا ہوں کہ جناح پاکستان نہیں چاہتے تھے۔ ۱۹۴۶ء تک وہ متحدہ ہندوستان کے لئے کام کرنے پر تیار تھے۔ میرے خیال میں وہ پاکستان کا مطالبہ پیش کرکے مسلمانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ حقوق و مراعات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ اگر اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ کانگریسی لیڈران سے سمجھوتہ کرنا نہیں چاہتے تھے تو وہ اس میں حق بجانب تھے۔ جب کبھی کانگریسی رہنماؤں نے یہ دیکھا کہ برطانیہ سمجھوتہ پر آمادہ ہو رہا ہے تو ان کے ذہن میں جناح کو نظر انداز کردینے کا خیال فوراً آجاتا تھا۔ کانگریسی لیڈروں کا کہنا تھا کہ ہندو مسلمان مسئلے کو کانگرس جناح اور مسلم لیگ نہیں بلکہ صرف کانگریس اور برطانیہ حل کرسکیں گے۔" (ص ۱۳۲)

جناب سید شہاب الدین صاحب، دسنوی نے فاضل مصنف کی اجازت سے مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے اسی حصہ کو مرتب کرکے اردو میں اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔ ترجمہ کی زبان اس درجہ شگفتہ برجستہ اور رواں ہے کہ ترجمہ پر اصل کتاب کا گمان گذرتا ہے۔ اور اس کے پڑھنے میں وہی لطف آتا بھی ہے۔ آخر میں اشخاص و افراد کے اسماء کا اشاریہ بھی ہے۔ کتاب اس لائق ہے کہ ہر اردو خواں اس کا مطالعہ کرے۔

تلمیحات و اشارات اقبال از جناب ڈاکٹر اکبر حسین صاحب قریشی۔ تقطیع متوسط ضخامت ۴۳۴ صفحات کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت مجلد ۱۲/۵۰ پتہ:- انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

علامہ اقبال مرحوم کا پورا کلام تلمیحات و اشارات سے بھرا ہوا ہے۔ اور وہ بھی کسی ایک خاص علم و فن کی نہیں بلکہ مشرق و مغرب کے ہر علم و فن اور مذہب و مسلک کی اور یہ ظاہر ہے کہ ان تلمیحات و اشارات کو سمجھے بغیر کلام سے نہ استفادہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس میں لطف آتا ہے اس بنا پر

ارباب ذوق کو فاضل مرتب کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے مقالہ تحقیق کے لئے یہ موضوع منتخب کیا اور پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کی نگرانی میں بڑی محنت اور تگ و دو اور جستجو کے بعد اس کو اس طرح مرتب کیا کہ حق ادا کر دیا۔ ہر تلمیح اور اشارہ کی انھوں نے تشریح کی اور اس کا حوالہ دیا ہے۔ آخر میں موصوف نے ان تلمیحات کی ایک فہرست بھی درج کی ہے جن کا سراغ ان کو نہیں مل سکا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ "اے تماشا گاہ عالم روئے تو" شیخ سعدی کی مشہور غزل:

سرو سیمینا بصحرا می روی سخت بے مہری کہ بے ما می روی

دیدہ سعدی و دل ہمراہ تست تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

کا شعر ہے اور پھر بھی موصوف کو اس کا پتہ نہیں چلا۔ علاوہ ازیں کتاب میں بعض افسوسناک غلطیاں بھی رہ گئی ہیں۔ مثلاً: ص ۲۴۲ پر نمبر ۱ میں لیس للانسان الا ماسعی۔ نمبر ۱۵ میں لاتدع مع اللہ ہونا چاہئے: ص ۱۴۴ نمبر ۵ (ص) پر کُم نشتم اور ص ۲۴۴ نمبر ۲ (ت) تو اس ت بالعجاب صحیح ہے ص ۲۸۴ نمبر ۶۰: اصل نام محمد عوفی ہے نہ کہ عرفی۔ ص ۲۷۴ نمبر ۴۴: ابن قتیبہ ہونا چاہئے ص ۲۸۶ نمبر ۲۱: کتاب کا صحیح نام "الاستیعاب" ہے اور نمبر ۲۲: اخبار الاخیار ہونا چاہئے۔ یہ کتابت و طباعت کی غلطیاں ہیں۔ آئندہ ایڈیشن میں ان کی تصحیح ہو جانی چاہئے۔ آخر میں مقالہ کے ماخذ کی ایک طویل مگر مفید فہرست اور متعدد اشارے بھی ہیں۔ بہرحال کتاب بہت مفید اور لائق مطالعہ بلکہ لائبریری میں رکھنے کے لائق ہے۔

انگریزی ادب کی مختصر تاریخ از ڈاکٹر محمد لیس صاحب تقطیع متوسط ضخامت ۳۴۹ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۱۰/۵۰ پتہ:۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڈھ۔

لائق مولف علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں ریڈر اور اردو زبان کے معروف ادیب اور نقاد ہیں۔ اس بنا پر اردو میں انگریزی ادب کی مختصر تاریخ لکھنے کا حق ان کے سوا اور کس کو پہنچ سکتا تھا۔ یہ کتاب سات ابواب پر تقسیم ہے جن میں انگریزی ادب کو اس کے مختلف ادوار پر تقسیم

کرکے ہر دور کے ممتاز شاعروں اور ادیبوں کے مختصر سوانح حیات کے ساتھ ان کے کارناموں کا تعارف اور ان کی خصوصیات فن کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ باب ہفتم ہماری موجودہ صدی کے لئے مخصوص ہے۔ اس بنا پر یہ طبعی طور پر زیادہ طویل اور مفصل ہے۔ شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے جس میں عالمی ادب میں انگریزی ادب کی اہمیت اور اردو ادب کے لئے اس سے استفادہ کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بہرحال کتاب بہت مفید اور لائق مطالعہ ہے۔ زبان اور بیان بھی شگفتہ اور دل نشین ہے۔ البتہ کہیں کہیں غلطی ہوگئی ہے مثلاً ص ۹۰ سطر ۱۰: صحیح عبارت یوں ہونی چاہیئے "اس ڈرامہ کا مصنف اب توریت کے دس احکام اور انجیل" ص ۱۱۰ سطر ۸: "اثر پذیری" کی جگہ "اثر انگیزی" ص ۱۲۹ سطر ایک "زیر تحت" کے بجائے "ماتحت" ہونا چاہیئے۔ ص ۱۸۰ سطر ۱۹: "باغیانہ خیالات سے گہرے تعلقات" کے بجائے "باغیانہ خیالات سے گہرا تعلق" ہونا چاہئے۔

نقش غالب۔ از پروفیسر اسلوب احمد انصاری تقطیع متوسط ضخامت ۱۶۲ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ اعلیٰ۔ قیمت مجلد ۔/۱۲ پتہ غالب اکیڈمی۔ نظام الدین۔ نئی دہلی ۱۳-

یہ کتاب مرزا غالب پر حسب ذیل چھ مقالات کا مجموعہ ہے۔ جو فاضل مصنف کے قلم سے گاہے گاہے وقتاً فوقتاً نکلتے اور شائع ہوتے رہے ہیں (۱) کلام غالب کا ایک رخ (۲) غالب کا فن (۳) غالب اور اقبال (۴) "ابر گہر بار" کا ایک پہلو (۵) خطوط غالب میں نفس کی پرچھائیاں۔ (۶) غالب کی فارسی غزل۔

فاضل مصنف کو جو چیز آج کل کے عام اردو زبان کے ادیبوں اور نقادوں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ وہ انگریزی کے پروفیسر اور صدر شعبہ (مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) ہونے کی حیثیت سے اس زبان اور اس کے ادب پر بہت وسیع اور عمیق نظر رکھتے ہیں۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ فارسی اور اردو ان دونوں زبانوں کا ذوق اعلیٰ اور ان کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ بھی وسیع اور ناقدانہ ہے۔ پھر طبیعت میں بڑی سلامت روی اور قلم میں دلکشی و دلاویزی بھی ہے۔ مذکورہ بالا تمام مقالات اپنے مصنف کی ان تمام خصوصیات کا آئینہ دار ہونے کے باعث فکر انگیز بھی ہیں اور بصیرت افروز

بھی۔ لیکن ص ۱۲۱ پر موصوف نے غالب کے مصرعہ "وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے" میں نگہہ سے مراد "درون بینی" لی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس شعر کا پہلا مصرعہ:

"بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی" اس بات کی دلیل ہے کہ چونکہ وہی نگاہ ہے جو "تغافل پیشگی" کے باعث ایک دیدہ ناکشودہ "تمام کی نیم نگاہی" بنکر رہ گئی ہے۔ اس بنا پر "نگہ" سے مراد کچھ اور نہیں بلکہ دیدۂ ناتمام کی جلوہ گری ہے۔ علاوہ ازیں املا کی غلطیاں بھی کہیں کہیں نظر آئیں مثلاً "غیظ" کی جگہ "غیض" اور "مقفی" کی جگہ "مقفع" ص ۱۲۱ و ۱۲۸ علی الترتیب اردو زبان و ادب کے ہر طالب علم کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

علامتِ حیات و قوت

چالیس اہم اجزا کا زندگی بخش مرکّب عرق،
جو انسانی جسم کو بے پناہ قوت و تغذیہ عطا کرتا ہے

محرک ہے۔ مردوں اور عورتوں کی عام کمزوری کو
بہت جلد دُور کرتا ہے۔

ہمدرد

علیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے الجمعیۃ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب
سعید احمد اکبرآبادی

بُرہان

جلد ۶۶ | ذالحجہ ۱۳۹۰ھ مطابق فروری ۱۹۷۱ء | شمارہ ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

افسوس ہے پچھلے دنوں ہمارے ادارۂ ندوۃ المصنفین کے دو پرانے ساتھی داعی اجل کو لبیک کہہ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ جناب اسرار احمد آزاد اردو زبان کے ادیب اور نامور اخبار نویس تھے یوں انھوں نے غالباً کسی یونیورسٹی سے باقاعدہ کوئی سند نہیں لی تھی لیکن محض اپنی ذاتی محنت اور شوق سے اردو اور ہندی کے علاوہ انگریزی میں اتنی استعداد بہم پہنچالی تھی کہ اس زبان کے اخبارات و رسائل اور کتابیں بے تکلف پڑھ لیتے اور سمجھ لیتے تھے۔ سیاسیات پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ادارہ کے ابتدائی زمانہ میں مکتبۂ برہان کی طرف سے ان کی کتاب "بین الاقوامی سیاسی معلومات" شائع ہو کر بڑی مقبول ہوئی تھی۔ مرحوم نظر ثانی کرکے اس پر برابر اضافہ کرتے رہے چنانچہ اس کتاب کا آخری ایڈیشن جو شائع ہوا ہے وہ تین نہایت ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور بے شبہ یہ کتاب اردو زبان کے پورے لٹریچر میں اپنی نوعیت کی ایک ہی ہے۔ اس کے علاوہ:

مرحوم بہت جلد اور بہت اچھا لکھتے تھے۔ ان کی ساری زندگی جرنلزم کے نذر ہوگئی ورنہ اگر ان کو معاشی اطمینان حاصل ہوتا اور تصنیف و تالیف میں لگے رہتے تو اردو زبان کے ذخیرہ میں بہت کچھ قابل قدر اضافہ کر سکتے تھے۔ اخلاقی اعتبار سے ان کی ساری زندگی سراپا ایثار تھی۔ خود مجرد رہے، محنت مزدوری کی اور ایک بھائی کے بچوں کی تعلیم و تربیت پر ہمیشہ اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ سرینگر میں روزنامہ چنار کے ایڈیٹر تھے دہرادون میں انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت عطا فرمائے۔

قاری محمد یوسف صاحب ندوۃ المصنفین کے یوم تاسیس سے ۱۹۵۸ء تک ادارہ سے برابر وابستہ رہے لیکن ان کا تعلق دفتر سے تھا اس سے بھی بڑھ کر ہم لوگوں سے ان کا بڑا تعلق یہ تھا کہ وہ خود دیوبند کے فارغ التحصیل اور مولانا قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھی جو حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب رح

(والد ماجد مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی) کے خلیفۂ مجاز اور ایک بلند پایہ صوفی اور عارف باللہ تھے۔ ان کے صاحبزادے تھے ۱۹۳۶ء سے پاکستان جانے تک قاری اور مترجم کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو سے برابر وابستہ رہے اور بہت مقبول تھے۔ ترکِ وطن کے بعد حیدر آباد سندھ میں ناظم تعلیمات اسلامی کی حیثیت سے برسوں کام کیا۔ دو تین سال سے بعض خانگی حوادث کے باعث خانہ نشین ہو گئے تھے۔ انتقال کے وقت ۷۲-۷۳ برس کی عمر ہو گی۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ۔

افسوس ہے گذشتہ ماہ جناب روش صدیقی بھی رہگزائے عالم جاودانی ہو گئے۔ مرحوم بلند پایہ اور صاحب فن شاعر تھے۔ ان کی شہرت کا آغاز رومانی نظموں سے ہوا جو اس زمانہ کے مشہور ادبی رسائل میں بڑے اہتمام سے چھپتی تھیں اور جنہیں وہ اپنی خاص پرجوش آواز میں لہرالہرا کے پڑھتے تھے۔ بعد میں ان کی شاعری حکمت وفلسفہ اور انسانی و وطنی مسائل و آلام کی ترجمان بن گئی لیکن ان کا کلام عام فہم اور دقیق ہوتا تھا اور الفاظ اور تراکیب پرشکوہ و باوقار۔ طبیعت میں روانی اور جدت پسندی بلا کی تھی۔ اخلاقی اعتبار سے بڑے باوضع۔ ملنسار۔ اور مذہبی حیثیت سے صوم وصلوٰۃ کیا اوراد و وظائف تک کے پابند تھے۔ انتقال سے چھ سات روز پہلے (۱۴ر جنوری کو) شام کے وقت نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر اچانک ملاقات ہو گئی تو حسب معمول بڑے تپاک سے ملے اور معانقہ کیا۔ کافی ہشاش بشاش اور مگن تھے۔ اس وقت اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس عالم آب و گل میں وہ بس اب چند روز کے اور مہمان ہیں اور ان سے یہ آخری دید و شنید ہے۔ شاہجہانپور کے ایک مشاعرے میں گئے تھے وہیں دل کا دورہ ہوا اور جان بحق ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر ٹھنڈی رکھے اور ان کے پسماندگان کا حامی و ناصر ہو۔ آمین۔

النباء العظیم

(۱۶)

تعلیم ہمیشہ سے اصلاح اور افساد دونوں کا ذریعہ رہی ہے۔ اگر تعلیم صحتمندانہ اور عمدہ اور مفید قسم کی ہو تو اس سے قوم ابھرتی اور ترقی کرتی ہے اور اگر وہ مریضانہ اور مخرب ہو تو اس سے قوم میں پستی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر الہ آبادی نے انگریزی تعلیم کی نسبت طنز کیا تھا "افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی"

مسلمانوں کو محسوس کرنا چاہئے کہ ملک کے موجودہ حالات میں جب کہ تعلیمی نظام میں اس درجہ ابتری اور پراگندگی ہے انہیں کسی طرح اس کے تدارک کا سامان کرنا چاہئے تھا۔ اس سلسلہ میں شمالی ہند کے مسلمان جنوبی ہند کے مسلمانوں سے اور عیسائیوں سے سبق لے سکتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ عیسائیوں پر آئے دن پارلیمنٹ میں اور پبلک میں بھی لے دے ہوتی رہتی ہے لیکن ان کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ تعلیم کی راہ سے انھوں نے ملک کی جو خدمت کی اور اس ذریعہ سے انھوں نے جو ایک خاموش ذہنی انقلاب پیدا کیا ہے۔ اس میں ہندوستان کا کوئی فرقہ ان کا حریف نہیں ہوسکتا ان کے اسکول اور کالج ہمیشہ اعلیٰ تعلیم اور ڈسپلن کے مرکز سمجھے گئے ہیں۔ جو لوگ ان پر پبلک میں خردہ گیری کرتے ہیں آج ان کا بھی حال یہ ہے کہ اپنے بچوں اور بچیوں کو بڑے فخر کے ساتھ انہیں لوگوں کی قائم کردہ نرسریز، کنونٹ اور پبلک اسکولوں میں بھیجتے اور اس کے لئے اخراجات کا بارگراں برداشت کرتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ ان میں ایسے مذہبی اور دیندار حضرات بھی شامل ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ تعلیم و تربیت کے یہ تمام ادارے مشنریز کے قائم کئے ہوئے ہیں اور ان کا اصل مقصد عیسائیت کی طرف دعوت و تبلیغ ہے اور اس کے کچھ نہ کچھ اثرات ظاہر ہوتے بھی ہیں۔ لیکن اس علم اور اذعان و یقین کے باوجود ہندو اور مسلمان سب اپنے بچوں اور بچیوں کو ان کے اداروں میں تعلیم دلانا اپنے لئے نشانِ امتیاز اور ضروری سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مشنریز اجنبی اور بدیسی ہونے کے باوجود

ہمارے ملک کی ایک وقیع اور اہم خدمت انجام دے رہے ہیں، اور ساتھ ہی وہ اپنی قوم اور اپنے مذہب کو بھی عظیم فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

اب جنوبی ہند کے مسلمانوں کو دیکھئے! وہ بھی اس لائن پر کس بیدار مغزی، روشن ضمیری اور وقت شناسی سے بڑی خاموشی مگر عزم وثبات کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ ٹامل ناڈ اور کیرالا وغیرہ میں جنرل اور پروفیشنل اور ٹکنکل تعلیم کے چھوٹے بڑے کتنے اعلیٰ سے اعلیٰ ادارے اور ہاسٹل ہیں جو ان مسلمانوں نے اپنے روپے سے قائم کئے ہیں اور بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں یہ ادارے کمونل یعنی مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔ بلکہ نیشنل یعنی قومی ہیں اور ان میں ہر مذہب کے لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پاتے ہیں لیکن چونکہ سرمایہ جو کچھ بھی ہے وہ مسلمانوں کا ہے۔ اس بنا پر اڈمنسٹریشن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس لئے ان کالجوں اور تعلیمی اداروں میں اسلامی روایات وشعائر کا پورا ادب و احترام ملحوظ رکھا جاتا ہے طلبا کے اخلاق کی نگرانی اور صحت مندانہ طریقہ پر ان کی ذہنی تربیت پر خاص توجہ کی جاتی ہے۔ اب ذرا غور کیجئے! ان مسلمانوں کی عالی ہمتی اور روشن ضمیری کے نتائج کیا ہیں؟ وہ یہ ہیں:

(۱) مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے تعلیم کا اعلیٰ انتظام ہے۔

(۲) کوئی مسلمان لڑکا یا لڑکی محض غربت کی وجہ سے تعلیم سے خواہ وہ کسی قسم کی اور کسی درجہ کی ہو محروم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تعلیمی وظائف بھی کثرت سے ہیں اور ان کے لئے اوقاف الگ ہیں۔

(۳) اڈمنسٹریشن چونکہ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے تعلیمی نظم ونسق اور اس کی پالیسی بھی ان کے ہاتھ میں ہے۔

(۴) مسلم اور غیر مسلم سب طلبا ساتھ پڑھتے اور ایک دوسرے کے ساتھ کالج لائف میں شریک رہتے ہیں اس بنا پر ایک دوسرے کو سمجھنے، اس کی روایات اور کلچر سے واقف ہونے اور باہمی اشتراک و تعاون کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا جو موقع یہاں ملتا ہے وہ کسی اور جگہ نہیں مل سکتا۔

(۵) اکثریت کے فرقہ کے لوگوں میں نیم شعوری طور پر مسلمانوں کے لئے احساس تشکر پیدا ہوتا ہے،

کہ سرمایہ اور انتظام اور وہ بھی اعلیٰ قسم کا سب مسلمانوں کا ہے اور ان کی اولاد بھی اس سے فائدہ اٹھارہی ہے۔

ان سب چیزوں کا مجموعی اثر یہ ہے کہ ایک طرف تعلیم اور سائنس و ٹکنالوجی میں اس علاقہ کے مسلمانوں کا قدم کسی سے پیچھے نہیں ہے اور جو دشواریاں اور دقتیں یہاں ہمارے راستہ میں حائل ہیں وہاں ان کا کہیں نام ونشان بھی نہیں۔ اور دوسری جانب وہاں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اس غضب کی پائی جاتی ہے کہ مسلم لیگ تک کو وزیر اعظم کی طرف سے غیر فرقہ وارانہ جماعت ہونے کا قولاً اور عملاً دونوں قسم کا سرٹیفکیٹ مل چکا ہے۔

آج ہمارے بعض دوست کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا منصب قیادت کرنا ہے لیکن انھوں نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ قیادت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ہوا میں معلق ہو اور کسی بھی قوم کے حصہ میں محض بخت و اتفاق سے آجائے۔ قیادت کا دارومدار خدمت اور نفع رسانی پر ہے جس قوم میں یہ وصف جس درجہ کا ہوگا اس کو اسی درجہ کی قیادت حاصل ہوگی سید القوم خادمھم جس کا ترجمہ فارسی میں "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" ہے اس کا آخر کیا مطلب ہے؟ اگر سوال کیا جائے کہ وہ کون سا مذہبی فرقہ ہے جس کو بحیثیت مجموعی آج دنیا کی ذہنی قیادت کا شرف حاصل ہے؟ تو اس کا جواب صرف ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ ہے "عیسائی"! اور بات ہے بھی درست، کیونکہ تعلیم میں، سیاست میں، لباس میں اور تہذیب و تمدن کے بیسیوں معاملات میں آج اقوام عالم کس کی تقلید اور پیروی کررہی ہیں؟ امریکہ اور یورپ کی ہی یا کسی اور کی؟ اور ان دونوں کا مذہب مسیحیت ہی ہے یا کچھ اور؟ تو سوچنا چاہیئے کہ آخر مسیحی قوم کو یہ مرتبہ و مقام کیونکر حاصل ہوا؟ یا تاریخ میں کبھی مسلمانوں کو بھی یہ مقام حاصل تھا تو اس کے اسباب کیا تھے؟

بہر حال جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے مسلمانوں کو دو باتوں کا عزم کرنا چاہیئے:۔ (۱) ایک یہ کہ وہ تعلیم سے کسی مسلمان لڑکے یا لڑکی کو محض غربت اور افلاس کی وجہ سے محروم نہیں ہونے دیں گے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ بعض پست قسم کا پیشہ کرنے والے مسلمانوں کے بچے بڑے ذہین اور

اور طباع ہوتے ہیں لیکن والدین کو ان کی تعلیم کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کا فرض یہ بھی ہوگا کہ وہ اس قسم کے ہونہار بچوں کا سراغ لگائیں اور ان کے والدین کو متوجہ کریں کہ وہ تعلیم کا بندوبست کریں اور (۲) دوسری بات یہ ہے کہ انہیں کم از کم ہر ضلع میں ایک ہائی اسکول اور ایک کالج قائم کرنا ہے جس میں آرٹس۔ سائنس اور کامرس تینوں کی تعلیم کا اعلیٰ بندوبست ہوگا۔ اس کی بلڈنگ، لائبریری کھیل کے میدان۔ لیبوریٹریز۔ غرض کہ ہر چیز اعلیٰ سے اعلیٰ ہوگی۔ اس کالج کے اساتذہ کی تنخواہیں نسبت دوسرے کالجوں کے کہیں زیادہ ہوں گی تاکہ قابل سے قابل اساتذہ فراہم ہوں اور جو یہاں آئیں وہ اطمینان اور دلجمعی سے کام کریں۔ یہ نہ ہو کہ آج یہاں اور کل وہاں! کبھی امریکہ ہیں اور کبھی نائیجیریا میں اس کالج کے ساتھ ہوسٹل بھی لازمی طور پر ہوگا اور کسی طالب علم کو ہاسٹل سے باہر رہنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اسی طرح کالج کے کیمپس کے اندر ہی سب اساتذہ کے مکانات ہوں گے اور کوئی استاد کیمپس سے باہر رہنے کا مجاز نہیں ہوگا۔ ہفتہ میں کم از کم ایک دن اساتذہ اور طلبا ایک ساتھ کھانا کھائیں گے۔ یہ کالج صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں ہوگا۔ اس میں غیر مسلم طلبا بھی تعلیم حاصل کر سکیں گے لیکن چونکہ مسلمان تعلیم میں پیچھے ہیں اور ان کو دوسرے کالجوں میں داخلہ لینے میں بعض ٹکنکل قسم کی دشواریاں بھی ہوتی ہیں۔ اس بنا پر اس کالج میں ساٹھ یا ستر فیصد سیٹیں مسلمان طلبا کے لئے مخصوص ہوں گی۔

یہ کالج تو جنرل ایجوکیشن کا ہوگا۔ اس کے علاوہ پروفیشنل اور ٹکنکل ایجوکیشن کے کالج اور لڑکیوں کے کالج بھی اسی نہج اور ڈھنگ کے ہونے چاہئیں کہ کالج کہلائیں۔ ان سب کاموں کی تکمیل اور ان کا انصرام اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ جس طرح جنوبی ہند کے مسلمانوں کا ایک عظیم الشان تعلیمی ٹرسٹ ہے اسی طرح مسلمانوں کا ایک مرکزی تعلیمی ٹرسٹ ہو اور یہ سب کام اس کے ماتحت انجام پائیں۔ امریکہ کناڈا اور یورپ کو چھوڑیئے۔ جہاں قدم قدم پر رفاہی اور انسانی فلاح و بہبود کے کاموں کے لئے بڑے بڑے ٹرسٹ اور فنڈ ہیں۔ خود اپنے ملک میں دیکھئے۔ برادران وطن کے کتنے عظیم الشان ٹرسٹ ہیں جو فلاح عام کا کام کر رہے ہیں۔ مشکل کوئی چیز نہیں ہے۔ ضرورت صرف احساس

توجہ اور خود شناسی کی ہے۔ ملک میں اگر مسلمانوں کی آبادی سات کروڑ بھی مان لی جائے اور فی کس صرف ایک روپیہ سالانہ جس کے معنی ہیں کہ آٹھ پیسے سے کچھ زائد ماہانہ وصول کیا جائے تو ایک برس میں سات کروڑ کی رقم جمع ہو جاتی ہے اس رقم سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا اور کسی پر کوئی بوجھ بھی نہیں ہوتا۔

سماجیات | کسی قوم کی معاشرت اس کے رہن سہن۔ کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے کے طور طریق۔ اس کا لباس اور اس کی وضع قطع۔ شادی اور غمی کی تقریبات اور اس کے تہذیبی آداب و رسوم یہ سب عکس ہوتے ہیں اس کے عقیدہ اور زندگی سے متعلق اس کے بنیادی نظریہ اور فکر کے عربی کا مشہور مقولہ ہے "كل اناءٍ يترشح بما فيه" "ہر برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جب کبھی کوئی تحریک کسی خاص نظریہ اور فکر کی بنیاد پر شروع ہوتی ہے تو وہ اس بات پر بھی زور دیتی ہے کہ روزمرہ کے معمولات و مشاغل حیات میں اس نظریہ کی تطبیق کس طرح ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انسان کو ایک عقیدہ اور انسانی زندگی اور اس کے معاملات و مسائل سے متعلق ایک نظریہ اور ایک فکر عطا فرمایا تو ساتھ ہی اس امر کی تعلیم دی کہ اس نظریہ اور عقیدہ کے حاملین کے آداب و رسوم معاشرت کیا ہونے چاہئیں۔ اس سلسلہ میں کون سی چیزیں اچھی ہیں اور کون سی بری۔ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز۔ اور اس معاملہ میں اس درجہ بسط و تفصیل سے کام لیا کہ زندگی کا کوئی معمولی سے معمولی اور ادنیٰ سے ادنیٰ پہلو بھی اس کے احاطہ سے بچ نہیں سکا ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تمام چیزوں کا مکمل نمونہ عمل بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا کہ بس معیار حق و باطل آپ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ علم کلام کے دور از کار مباحث کچھ کہیں۔ حق یہ ہے کہ عقیدہ اور عمل میں کوئی فصل ممکن ہی نہیں ہے۔ عقیدہ سے استدلال عمل پر ہوتا ہے اور عمل سے عقیدہ پر۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ اور تحریک نظم جماعت

(۲)

چند مریدین، مخلصین کا تذکرہ

جناب ابوسلمان صاحب شاہجہانپوری

ماہنامہ "برہان" بابت ماہ ستمبر ۱۹۷۰ء میں راقم السطور کا ایک مضمون "ہندوستان میں تاریخ دعوت اسلامی کا ایک باب ــــ مولانا ابوالکلام آزادؒ اور تحریک نظم جماعت" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں متعدد ایسے حضرات کا نام آیا ہے جنھوں نے نظم جماعت کے قیام میں سعی کے لئے مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ان میں سے بعض حضرات مختلف علاقوں اور صوبوں میں کام کرتے اور بیعت لینے کے مجاز بھی تھے۔ ان میں سے بعض حضرات معروف ہیں، بعض غیر معروف۔ . . . . . . لیکن ان کی زندگی کے اس پہلو اور مولانا آزادؒ سے تعلق و ربط کی اس نوعیت پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ میرے علم میں جو حضرات آئے اور ان کے جو حالات بہم پہنچ سکے محض تکمیل مبحث کے خیال سے یہاں ان کا تذکرہ کر دیا ہے۔ بعض حضرات کے مفصل حالات تک رسائی نہیں ہو سکی۔ مثلاً سندھ میں نظم جماعت کی بیعت کے مجاز پیر سید تراب علی شاہ اور پنجاب میں مولانا کے خلیفہ مجاز، مولانا عبداللہ قصوریؒ۔ مولانا سید داؤد غزنویؒ کا تذکرہ ابھی مرتب نہیں کر سکا ہوں اس کے لئے ضروری مواد نظر میں ہے۔

مذکورہ بالا مضمون کی اشاعت کے بعد جو چیزیں علم میں آئیں ان کے مطالعے سے کامل اطمینان ہو گیا کہ صوبہ بنگال میں امارت شرعیہ اور نظم جماعت کے قیام کے لئے مولانا محمد منیر الزماں اسلام آبادی کی کوششیں مولانا آزادؒ کی تحریک نظم جماعت کے سلسلے میں کی گئی تھیں۔ اگرچہ ابھی ان کے حالات اور ان کے مساعی کی تفصیلات تک رسائی نہیں ہو سکی۔

اس تذکرے کے سلسلے میں یہ بات ضرور ذہن نشین رہے کہ نہ تو ابھی یہ مکمل ہے اور نہ ترتیب

کی یہ آخری شکل ہے۔ اس لئے کسی بزرگ کے تذکرے میں تقدیم و تاخیر پر کسی عزیز کو آزردہ خاطر نہیں ہو
چاہیے۔

غلط اندازِ فکر | اس تذکرے سے مولاناؒ کے متعلق ایک غلط اندازِ فکر کی تصحیح خود بخود ہو جاتی ہے۔ مولاناؒ
کے خلاف بعض حلقوں میں کہا جاتا ہے کہ ان کی تعلیم و ارشاد نے دینی فکر و رجحان رکھنے والے اور صالح افراد
پیدا نہیں کئے۔ اور اس کے ثبوت میں پروفیسر محمد اجمل خاں مرحوم مولانا کے پرائیویٹ سکریٹری
اور پروفیسر ہمایوں کبیر مرحوم سکریٹری وزارت تعلیمات، بعد میں وزیر سائنسی ریسرچ کو پیش کیا جاتا ہے
اس سلسلہ میں تین باتیں عرض ہیں:

اولاً: | مولانا ابوالکلام آزادؒ ہرگز اس قسم کے مصلح و مرشد نہیں تھے جو ایک خاص وضع و قطع کے
ساتھ ہجوم مریدین، گوشۂ خانقاہ اور مجمع عرس میں دیکھے جاتے ہیں جن کے ساتھ کچھ خاص قسم کی روایات
وابستہ ہوتی ہیں۔ مولاناؒ سے اس قسم کی توقع وابستہ ہی نہیں کرنی چاہیے۔

ثانیاً | ان دونوں حضرات سے مولاناؒ کے تعلقات ایک خاص نوعیت کے تھے۔ تعلقات کی اس
نوعیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اجمل خاں ۱۹۳۵ء کے بعد مولانا کے سکریٹری کی حیثیت سے ان سے
وابستہ ہوئے اور ہمایوں کبیر صاحب ۱۹۴۵ء میں جسے زندگی کا آخری دور کہنا مناسب ہوگا۔ شملہ
کانفرنس کے موقع پر مولانا کے ترجمان کی حیثیت سے ان سے قریب ہوئے اس لئے مولاناؒ کی تعلیم و ارشاد
کے حاصل اور نمونے کے طور پر ان دونوں حضرات کو پیش کرنا انصاف سے بعید اور ایک ایسی منطق ہے جو
معترضین کی بصیرت ہی کا نہیں ان کی دیانت تک کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ اگر مولانا کی دعوت اور افکار کے
اثرات تلاش کرنا ہوں تو ملک کے سینکڑوں اکابر اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے ہزاروں
افراد کے ساتھ اجمل خاں اور ہمایوں کبیر کی شخصیتیں بھی موضوع بن سکتی ہیں اور ان کے افکار میں مولاناؒ کے
افکار کے اثرات کو تلاش کیا جا سکتا ہے لیکن مولانا کی تعلیم و ارشاد کے حاصل اور نمونے کی تلاش ہو تو پھر
ان حضرات کی بجائے سب سے پہلے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (یوپی)، مولانا سید تراب علی شاہ راشدی
(سندھ) مولانا داؤد غزنوی امرتسری، مولانا عبداللہ قصوری اور مولانا محی الدین قصوری (پنجاب) مولانا عبدالحی

فاروقی، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد (بہار)، مولانا غلام رسول مہر، مستری محمد صدیق وغیرہم کے افکار اوران کی سیرتوں کو دیکھنا چاہیئے شخصیت وسیرت کے ان ثمرات سے اس کے درخت کو پہچاننے کی کوشش اور تعلیم وارشاد کے ان مظاہر میں سے اس تعلیم وارشاد کے بارے میں فیصلہ کرنا چاہیئے اس باب میں یہی صحیح انداز فکر ہے اور نتیجہ تک پہنچنے کا یہی صحیح طریقہ ہے۔

ثالثاً ویسے بھی کسی کے فکر اور رجحان کے بارے میں اتنی جلد فیصلہ نہیں کر دینا چاہیئے کہ وہ اسلامی اور دینی ہے یا نہیں۔ بلاشبہ اس قسم کی رائے چند باتوں پر ہوتی ہے لیکن جب تک ایک شخص اسلام کے دائرے میں ہے اور اپنے تئیں مسلمان کہلاتے میں فخر محسوس کرتا ہے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ دینی اور اسلامی فکر و رجحان نہیں رکھتا۔ ہمارے یہاں سیاسی جدوجہد کا جو پچھلا ایک سال گذرا ہے اس میں علماء کرام کی ایک ایسی جماعت کو جس کے رہنماؤں کی زندگی قال اللہ وقال الرسول میں گذری ہے لیکن جہاں اس نے شریعت کے جام لنڈھائے ہیں وہاں سندان عشق حریت سے کھیلنا بھی اس کا شعار رہا ہے، علمائے کرام ہی کی ایک جماعت نے اشتراکیت پسندی کے الزام میں اسے دائرہ اسلام سے خارج کیا تھا۔ لیکن قومی اسمبلی کے انتخاب میں ان علما کی کامیابی کے سرکاری اعلان کے ساتھ ہی علماء کی ثانی الذکر جماعت کے سب سے بڑے ترجمان نے اول الذکر جماعت کے ایک عالم دین کی تصویر نہایت اہتمام سے پورے صفحے پر چھاپی ہے اور اگر پہلے دائرہ اسلام سے باہر نکالنے کے لئے قرآن وحدیث سے استدلال کیا گیا تھا تو اب ان کے ایمان واستقامت اور سیرت اسلامیہ کے اعتراف کے لئے علامہ اقبال مرحوم ان کے کام آئے ہیں۔ تصویر کے نیچے درج ہے۔

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

کل ان کا ایمان واسلام ناقابل اعتقاد، ان کا نقطۂ نظر غیر اسلامی اور ان کا کردار اشتراکیت پسند تھا لیکن آج اسلامی آئین کی تدوین میں اسلامی نقطہ نظر کی ترجمانی کی تمام توقعات انہی حضرات سے وابستہ ہیں۔

ایک گذارش | چونکہ اس موضوع کی طرف تقریباً نصف صدی کے بعد پہلی بار توجہ کی جارہی ہے۔ اس لئے یہ تو ممکن ہی نہیں کہ سلسلہ بیعت کی تمام کڑیاں ایک ایک کر کے گن دی جائیں لیکن یقین ہے کہ ابھی اس سلسلہ کے بہت سے افراد بقید حیات ہوں گے اور بہت سے مرحومین کے بارے میں ان سے قریبی تعلق رکھنے والوں کو مولانا آزاد سے ان کی اس نسبت کا علم ہوگا اس لئے وہ توجہ فرمائیں تو تاریخ دعوت اسلامی کا یہ پہلو کلی طور پر تاریکی میں جانے سے بچ سکتا ہے۔ اس لئے مولانا آزادؒ کے خلیفہ مجاز مولانا محی الدین قصوری (لاہوری) جو بفضلہ بقید حیات ہیں، مولانا کے مریدین اور دیگر حضرات سے جنہیں مولاناؒ کے کسی مرید کا علم ہو، گذارش ہے کہ وہ اس مضمون کے مصنف کو "آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ہاؤسنگ سوسائٹی، منگھوپیر روڈ، کراچی - ۱۶" کے پتے پر اپنے اور دوسرے مریدوں کے ضروری حالات سے مطلع فرمائیں۔

مولانا غلام رسول مہر

مولانا غلام رسول مہر، مئی، ۱۸۹۵ء میں ایک گاؤں پھول پور (ضلع جالندھر، مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد چند سال تک ریاست حیدرآباد میں پائیگاہ وقار الامراء کے محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے اور انسپکٹر آف اسکولس کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔ لیکن ملازمت کی پابندی ان کے مزاج کے خلاف تھی اس لئے اخبار جاری کرنے کے خیال سے وطن لوٹ آئے۔ یہاں سیاسی حالات خاصے بگڑ گئے تھے۔ ایک عزیز دوست کے مشورے کے مطابق (نومبر ۱۹۲۱ء میں) زمیندار کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن والدہ اس تعلق پر راضی نہ ہوئیں۔ دو مہینے کے بعد خود زمیندار کے منیجر نے گاؤں پہنچ کر والدہ کو اس شرط پر راضی کیا کہ مہر صاحب کا رسمی تعلق زمیندار کے ساتھ نہ ہوگا۔ اس طرح فروری، ۱۹۲۲ء سے یہ کام مستقل طور پر سنبھالا اور ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء تک "زمیندار" سے وابستہ رہے۔ زمیندار اپنے وقت کا سب سے بڑا وقیع اردو اخبار تھا۔ تقریباً چھ سال تک زمیندار میں ادارتی فرائض انجام دینے کے بعد ۲ اپریل ۱۹۲۷ء سے مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کے اشتراک سے انھوں نے اپنا اخبار "انقلاب" نکالا جو اکتوبر ۱۹۴۹ء میں

حالات کی نامساعدت کی بنا پر بند کر دینا پڑا۔ اس کے بعد مہر صاحب ہمہ تن تصنیف و تالیف کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

مذہب، تہذیب، تمدن، تاریخ عالم، تاریخ اسلام، تحریک آزادی ہند، اسلامیان ہند، مجاہدین آزادی اور متعدد علمی، ادبی، مذہبی، قومی شخصیات اور موضوعات پر ان کی نہایت بلند پایہ و محققانہ تصانیف ہیں۔

مہر صاحب نے اب تک علمی، ادبی، تہذیبی اور وقتی حالات و مسائل پر ہزارہا نہایت فکر انگیز مقالات لکھے ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس وقت کہ ۱۹۷۰ء اپنا بیشتر سفر ختم کر چکا ہے اور قریب ہے کہ ۱۹۷۱ء کو جا لے پاکستان اور عالم اسلام کے حالات و مسائل پر ان کی شگفتہ نگاری اور عطر بیزی افکار کا سلسلہ جاری ہے اور تاریخ و سیاست ملی کے سرائر و خفایا سے پردے اٹھا رہے ہیں۔

مہر صاحب تقریباً ڈیڑھ سو کتابوں کے مصنف، مرتب یا مترجم ہیں۔ تاریخ اسلام خصوصاً مسلمانان ہند کی تاریخ پر اس وقت ان سے بڑا محقق کوئی نہیں۔ انھوں نے بیسویں صدی کے سیاسی، علمی، تہذیبی نشیب و فراز کو اپنی آنکھوں سے نہ صرف دیکھا ہے بلکہ نصف صدی سے اسی قلزمِ حوادث و انقلابات کے شناور رہے ہیں۔

تاریخ دعوتِ اسلامی اور عزیمت دعوت کے سلسلے میں امام ابن تیمیہ اور سیرت سید احمد شہید ان کی بلند پایہ محققانہ تصانیف ہیں۔ انداز و معیار اور جامعیت کے لحاظ سے اردو کا دامن ابھی تک اس پایے کی تصانیف سے خالی ہے۔ کلام اقبال اور دیوان غالب کی شرحیں نہ صرف صحت و کمالِ تشریح کے لحاظ سے بلکہ ادبی اور تنقیدی لحاظ سے نہایت اعلیٰ درجے کی شروح ہیں۔

مہر صاحب نے سوانح کے موضوع پر جو کتابیں تحریر فرمائی ہیں ان میں فنی نقطہ نظر سے زندگی کے ہر پہلو سے بحث کی ہے اور ان کے معیارِ علم و تحقیق اور ترتیب و توازن کا پیمانہ ہر جگہ بلند ہے

اور حسنِ تالیف اور اسلوبِ نگارش ہر مقام پر دامن قلب و نظر کو اپنی جانب کھینچتا ہے لیکن اصلاً وہ حسنِ فکر اور حسنِ سیرت کے عاشق ہیں اس لئے جہاں انھوں نے اس پہلو کا بیان اور اس گوشے کی نقاب کشائی کی ہے۔ وہاں ان کا حسنِ بیان اور اندازِ نگارش کمال دل فریبی و دل آویزی کی انتہائی بلندیوں پر ہے۔ ان کے ندرت کار قلم کی اصل جولان گاہ کسی کے حسنِ فکر اور کمالِ سیرت کا تذکرہ ہے زبان و بیان پر اپنی بے پناہ قدرت، علم و مطالعہ کی بے اندازہ وسعت، کمال انشاء پردازی اور طبع رسا و فکرِ بلند سے کام لے کر وہ اپنی جنبش قلم سے فکر و سیرت کا مینا بازار سجاتے اور تاج محل تعمیر کرتے چلے جاتے ہیں۔

مہر صاحب اردو کے بلند پایہ ادیب، صاحب طرز انشا پرداز، صاحب فکر مورخ، نکتہ رس نقاد، عظیم صحافی اور ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ ان کی تحریریں استدلال کی پختگی اور کمال ترتیب و تہذیب کا ایک عدیم المثال اور نادر الوجود نمونہ ہوتی ہیں۔ ماضی کے تذکار ہوں یا حدیث العہد مسائل و مباحث سیاست ہوں ان کی تحریر و تقریر میں طنز و مزاح کی ہلکی چاشنی ایک عجیب لطف دیتی ہے۔

شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت زیادہ نہیں اور اب تو ایک مدت سے تصنیف و تالیف اور ترجمے کے کاموں کی مشغولیت میں یہ شوق چھوٹ چکا ہے لیکن وہ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر ہیں اور ان کا کلام وقت کے بلند پایہ ادبی رسائل میں چھپتا رہا ہے۔

وہ فارسی اور اردو شعر و ادب کا نہایت پاکیزہ اور علمی ذوق رکھتے ہیں۔ اردو اور فارسی کے علمی و ادبی خزائن و ذخائر پر ان کے عبور کا تو کہنا ہی کیا، عربی اور انگریزی کی قدیم و جدید ادبیات اور تاریخ پر ان کی گہری نظر ہے۔

علامہ اقبال سے انہیں بڑی عقیدت ہے۔ ایک مدت تک علامہ مرحوم سے دوستانہ تعلقات اور ہم مجلسی کا شرف حاصل رہا۔

علامہ مرحوم کی زندگی، ان کی شخصیت، ان کے کمالات اور ان کی ادبی و سیاسی خدمات

کے مختلف پہلوؤں پر پچاسوں مقالے اب تک ان کے قلم سے نکل چکے ہیں اور علامہ کے کلام کی شرحیں اہل علم میں مقبول ہو چکی ہیں۔

اقبال کی طرح انہیں غالب سے بھی بڑی عقیدت ہے۔ غالب کی شخصیت و فن پر اب تک دہائیوں سے متجاوز نہایت محققانہ اور تنقیدی مقالات ان کے قلم سے نکل چکے ہیں۔ غالب پر انکی سوانحی کتاب کو غالبیات میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔ غالب کے خطوط، دیوانِ غالب، کلیاتِ غالب، اور فارسی تحریروں کی ترتیب ان کی قابل قدر ادبی خدمت ہے۔ ان کے خامۂ گہربار سے دیوانِ غالب کی ایک بے مثال شرح بھی ہے جو زیور طبع سے آراستہ ہو کر اہل علم اور اصحاب ذوق میں شرف قبول حاصل کر چکی ہے۔

اقبال اور غالب کے علاوہ عہد جدید کی شخصیتوں میں مولانا ابوالکلام آزادؒ سے مہر صاحب بہت متاثر ہیں۔ مولانا سے ان کا پہلا باقاعدہ تعارف ۱۹۱۴ء میں ہوا، اس سے پیشتر ۱۹۱۳ء میں مہر صاحب حزب اللہ کے ممبر بن چکے تھے جب وہ بی اے کے آخری سال میں تھے تو مولانا آزادؒ نے انکے بارے میں پیشین گوئی فرمائی تھی۔

"اگر غفلت طاری نہ ہوئی تو میں آپ کے اندر عظیم الشان مستقبل کے آثار دیکھ رہا ہوں"

نصف صدی میں ان کے علمی، ادبی کارنامے اور سیاسی، صحافتی، تاریخی اور دینی خدمات مولاناؒ کی اس پیشین گوئی پر شاہد عادل ہیں۔

مہر صاحب مولاناؒ کے مرید بھی ہیں۔ بیعت کی سعادت انہیں ۱۹۲۳ء میں حاصل ہوئی تھی۔ مولاناؒ سے ابتدائے تعارف سے انتقال تک تقریباً بیتالیس برس رشتہ ارادت و عقیدت قائم رہا۔ اس مدت میں بارہا ایسے مواقع پیش آئے کہ ملکی و سیاسی معاملات میں انھوں نے مولاناؒ سے اختلاف کیا لیکن ان کے رشتۂ ارادت اور علاقۂ عقیدت میں کبھی فرق نہیں آیا۔ مولانا کی رائے سے اختلاف کے باوجود مولانا کی عظمت، دینی وجاہت، سیاسی و ملکی خدمات اور محاسن اخلاق و سیرت کے اعتراف میں ان کی زبان اور ان کے قلم نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ مولاناؒ کی شخصیت

کے مختلف پہلوؤں پر ایک درجن سے زائد بلند پایہ اور نہایت لاجواب مقالات ان کے قلم فیض ترجمان اور خامۂ گہربار سے نکل چکے ہیں۔ اپنے نام مولانا کے مکاتیب کا مجموعہ "نقش آزاد" کے نام سے اور چند دیگر اکابر و مشاہیر کے نام مکاتیب اور مولانا کی بعض تاریخی تحریروں کا مجموعہ "تبرکاتِ آزاد" کے نام سے ترتیب دے کر چھپوا چکے ہیں۔ نیز ترجمان القرآن کی تیسری جلد سے متعلق متفرق سور و آیات کے تراجم و تشریحات "باقیات ترجمان القرآن" کے نام سے ترتیب دے کر ناقابلِ فراموش اور قابلِ ستائش دینی خدمت انجام دی ہے۔

اس کے علاوہ پچھلے کئی سال سے وہ مولانا کے افادات کی ترتیب کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر مولانا کی تحریریں تہذیب و ترتیب اور کتابت و تصحیح کے مراحل سے گذر کر پریس پہنچ چکی ہیں۔ مولانا کی تحریریں اگرچہ سیرت پر کام کے ایک عظیم الشان منصوبے کے مطابق تھیں لیکن خود ان میں کوئی ربط نہ تھا۔ یہ سیرت کے مختلف پہلوؤں پر الگ الگ مقالات تھے۔ مہر صاحب نے ان تمام تحریروں کو ایک خاص ترتیب سے جمع کیا اور مولانا کے منصوبے کے مطابق ان کے درمیانی خلاؤں کو پر کر کے اس طرح مسلسل و مربوط کر دیا کہ یہ اضافے مولانا کی تحریروں میں ربط کا کام بھی دیں اور ان سے ممیز بھی رہیں اور مولانا کی تحریروں سے خلط ملط نہ ہو جائیں۔ اس طرح مہر صاحب کی سعی و کاوش نے مولانا کی متفرق تحریروں کو ایک مربوط و مبسوط تصنیف کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ سیرت پر یہ بے نظیر کام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ مولانا "سیرت نبوی کے علم و مطالعہ کو علوم اسلامیہ میں کتنی اہمیت دیتے تھے اور اس کے لئے ان کے سامنے ایک عظیم الشان منصوبہ تھا۔ اسی قسم کا ایک کام سیرت انبیاء کے متعلق ترتیب و تہذیب کے مراحل سے گذر کر کتابت کے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔

مہر صاحب نے افاداتِ آزاد کی ترتیب سے صرف اپنی عقیدت و محبت ہی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ اہم موضوعات پر بہترین تحریروں کے انتخاب و ترتیب سے بہت بڑی دینی اور علمی خدمت

بھی انجام دی ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کاموں کی اہمیت کا کوئی اندازہ شناس نہیں، مہر صاحب کی ان خدماتِ جلیلہ وعظیمہ کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

مہر صاحب اس عہد کی ایک جامع حیثیات اور نادر الوجود شخصیت ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں صحتِ فکر کی دولت اور حسنِ عمل کی توفیق سے نوازا ہے۔ وہ نہایت وسیع المطالعہ، باریک بین، بیدار مغز، قوی الحافظہ اور استحضار کی حیرت انگیز صلاحیت کے مالک ہیں۔

علم وفکر کی دولتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں اخلاق وسیرت کے کمالات وخصائص سے بھی نوازا ہے۔ وہ نہایت بااخلاق، صاحبِ مروّت، فراخ دل، دوستوں سے انتہائی محبت کرنیوالے، نیازمندوں کے لئے سراپا شفقت، نہایت شگفتہ مزاج، بذلہ سنج اور باغ وبہار شخصیت ہیں۔ ان کی صحبت کبھی کسی کے لئے بارِ خاطر نہیں ہوتی۔

اردو زبان وادب کی کوئی تاریخ، کوئی علمی وسیاسی تذکرہ، اسلامی ہند کی تاریخ، تہذیب وثقافت، اور کوئی دائرۃ المعارف مہر صاحب کی شخصیت اور خدمات کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

خواجہ عبدالحئی فاروقی

خواجہ عبدالحئی مرحوم برصغیر پاک وہند کے مشہور عالم دین تھے۔ ایک مدت تک جامعہ ملیہ دہلی میں دینیات کے استاد رہے۔ کچھ دنوں تک حضرت بل (کشمیر) میں شیخ محمد عبداللہ کے قائم کردہ دارالعلوم میں درس وتدریس کی خدمات انجام دیں۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان تشریف لے آئے تھے اور اسلامیہ کالج لاہور میں شعبۂ اسلامیات کے صدر رہے۔

خواجہ صاحب مرحوم مولانا آزادؒ کے قدیم ارادت مندوں میں سے تھے اور مولاناؒ کے

ہاتھ پر بیعت تھے۔ حزب اللہ میں شامل تھے۔ مولاناؒ نے کلکتہ میں دارالارشاد قائم کیا تو خواجہ صاحب نے اس میں مولاناؒ کے درسِ قرآن حکیم سے استفادہ کیا۔ ۱۹۱۶ء میں مولاناؒ آزاد کو کلکتہ سے اخراج کا حکم ملا۔ اس وقت تک پندرہ بیس طالب صادق جمع ہو چکے تھے۔ لیکن کلکتہ سے مولاناؒ کے اخراج کی وجہ سے یہ سلسلہ درس و تعلیم ٹوٹ گیا جو حضرات جمع ہوئے تھے منتشر ہو گئے۔ خواجہ صاحب لاہور تشریف لے آئے۔ مولانا سے تعلق و ارادت اور رفاقت کی قیمت انہیں یہ دینی پڑی کہ لاہور میں نظر بند کر دیئے گئے۔

خواجہ صاحب نے متعدد بلند پایہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سورہ بقرہ، سورہ آل عمران، سورہ انعام، سورہ توبہ، سورہ یوسف، تیسویں پارے کی چند سورتوں کی تفسیر بھی ہیں جو اصلاً مولانا کے افادات پر مبنی ہیں۔

خواجہ صاحب نہایت نیک متقی، وسیع النظر، صاحب علم، و فضل بزرگ تھے۔ ۱۰ جنوری ۱۹۶۵ء کو لاہور میں انتقال فرمایا اور مالک حقیقی سے جاملے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ۱۸۹۵ء میں لکھنؤ کے مشہور و مردم خیز قصبہ ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حاصل کی۔ ۱۹۱۳ء میں مصر چلے گئے اور علامہ رشید رضا کے مدرسہ "دعوت و ارشاد" میں داخل ہو کر علوم ادبیہ، تفسیر قرآن وغیرہ کی تحصیل کی۔ دورانِ تعلیم ۱۹۱۴ء میں ترکی کا سفر کیا اور چند دن تک "جہان اسلام" کو ایڈٹ کیا۔ "جہان اسلام" قسطنطنیہ سے اردو، عربی، ترکی تین زبانوں میں حکومت ترکیہ کی جانب سے انور پاشا کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔ اس کے عربی اور ترکی حصے کے ایڈیٹر عمر رضا ایک مصری ادیب تھے۔ اردو حصے کو ابو سعید العربی الہندی، نامی ایک صاحب ایڈٹ کرتے تھے۔ ابو سعید سے ملیح آبادی کی ملاقات مصر میں ہوئی تھی۔ اور ملیح آبادی کی پر جوش تحریروں سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ یہی ملاقات ملیح آبادی کے سفر ترکیہ کا سبب بنی۔ "جہان اسلام" ۱۹۱۳ء سے نکل رہا تھا۔ ۱۹۱۴ء کے الہلال کلکتہ

میں کئی دنوں تک اس کا اشتہار چھپتا رہا۔

بلیح آبادی ابھی ترکیہ ہی میں تھے کہ جنگ عظیم اوّل کا اعلان ہو گیا اور بہت پر خطر حالات میں آخری جہاز سے وہ مصر واپس پہنچے۔

۱۹۱۴ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا بلیح آبادی ہندوستان واپس آئے وہ تحریک آزادی وطن کے بہت پُر جوش داعی اور انگریزوں کے بڑے کٹر دشمن تھے۔ اس کے لئے وہ مصر اور ترکی میں مشہور ہی نہیں بدنام رہے تھے۔ انگریزوں کی سی۔ آئی۔ ڈی۔ ان کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ ان کے ہندوستان واپس آنے سے پہلے مصر میں ان کے سیاسی مشاغل اور انگریز دشمنی کے متعلق سی۔ آئی۔ ڈی۔ رپورٹ پہنچ چکی تھی۔ انگریزوں کا ابھی جنگ سے پیچھا نہ چھوٹا تھا اور انگریز اور سامراج کے ایسے کٹر دشمن کو آزاد چھوڑ دینا خطرے سے خالی نہ تھا۔ حکومت کسی خطرے کو مول لینے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس لئے ہر وقت یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ وہ گرفتار ہو جائیں گے اس لئے کچھ تو عزیزوں کے اصرار سے مجبور ہو کر اور کچھ اس وجہ سے کہ ملک کے تمام سیاسی اکابر اور رہنما ملک اور بیرون ملک کی جیلوں میں قید تھے یا نظر بند تھے ان حالات میں کوئی تحریک شروع نہ کی جا سکتی تھی۔ یہ مناسب سمجھا کہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں دوبارہ داخل ہو کر تکمیل علم حدیث کی آرزو پوری کر لی جائے اس سے زیادہ مناسب اور مفید طریقہ دوسرا نہ تھا۔ اس طرح حکومت اور پولیس بھی مطمئن ہو جائے گی اور تکمیل علم حدیث کی دلی آرزو بھی پوری ہو جائے گی۔ حالانکہ ندوہ میں داخلے کے باوجود نہ تو انکے سیاسی مشاغل، جو بھی ان حالات میں جاری رہ سکتے تھے، ختم ہوئے اور نہ پولیس مطمئن ہوئی، وہ داخل ہوئے تو سی آئی ڈی سے تعلق رکھنے والے ایک طالب علم کا اضافہ بھی ہوا جو ان کی شب و روز نگرانی کرتا تھا۔ ڈیڑھ دو سال سی۔ آئی۔ ڈی۔ اور مولانا بلیح آبادی میں آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ وہ گرفتاری سے ضرور بچ گئے اور ان کی دلی مراد بھی پوری ہو گئی اور حدیث کی انھوں نے تکمیل کر لی۔ لیکن پولیس کی نظر میں ان کی خطرناکیوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا لیکن جنگ عظیم کے خاتمے کے ساتھ ہی ملک کے تمام سیاسی رہنماؤں کو رہا کر دیا گیا اور اسی لئے ان کی بھی گرفتاری عمل میں

نہیں آئی۔

سیاسی رہنمائی کے لئے وہ وقت کے تمام اکابر کے قریب ہوئے لیکن کسی سے وہ مطمئن نہیں ہوئے اور کوئی ان کی اولوالعزمیوں اور برق رفتاریوں کا ساتھ نہیں دے سکا۔ البتہ مولانا آزاد سے مل کر انہیں اطمینان ہوگیا کہ صحیح فکر سیاسی ہے تو یہی ہے اور ملک کی آزادی، مسلمانوں کی فلاح اور ملی اتحاد وترقی کی راہ ہے تو یہی۔

مولانا ملیح آبادی کی مولانا سے پہلی واقفیت ۱۹۱۲ء میں ہوئی تھی۔ لکھتے ہیں:

"۱۹۱۲ء میں الہلال نکلا میں دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں پڑھتا تھا۔ پہلا پرچہ دیکھتے ہی الہلال کو دل دے بیٹھا.... .... میں الہلال پڑھتا رہا۔ چھٹیوں میں لکھنؤ سے گھر آتا تو والد...کو بھی سناتا۔"

مولانا سے ان کی پہلی سیاسی ملاقات اوائل ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں ہوئی جہاں وہ خلافت کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"کانفرنس کے بعد مولوی منیرالزماں اسلام آبادی کے ساتھ مولانا آزاد سے ملنے ان کے گھر گیا۔ رپن لین کی ایک چھوٹی سی بوسیدہ عمارت میں رہتے تھے بڑے تپاک سے ملے اور یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مجھ سے انجان نہیں ہیں... چلتے وقت دوبارہ ملاقات کا اصرار کیا اور وقت بھی مقرر کر دیا۔ میں پہنچ گیا۔ آج تنہائی تھی ایسا معلوم ہوا کہ گویا ہم عمر بھر کے ساتھی ہیں۔ دل کھول کے ملے۔ مولانا نے تفصیل سے اپنی سکیم بتائی کہ........ ہندوستان کی آزادی کے لئے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اور مجھے شریک ہو جانے کی دعوت دی۔ میں بلا کسی پس و پیش کے فوراً راضی ہوگیا۔ حیرت انگیز طور پر ہمارے خیالات میں یکسانی تھی۔"

مولانا آزادؒ کے سیاسی و مذہبی مسائل کے بارے میں ان کے اندازِ فکر اور حصولِ آزادی اور اتحاد و تنظیم ملت کے بارے میں ان کے خیالات اور طریق کار سے کامل اتفاق کے بعد ۲۲؍اپریل ۱۹۲۰ء کو انھوں نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ مولانا نے انہیں لکھنؤ کو مرکز بنا کر صوبہ یوپی میں کام کرنے کی ہدایت کی اور اگلے روز مندرجہ ذیل سند خلافت عطا فرمائی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اخویم مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے وہ بیعت لینے اور تعلیم وارشادِ سلوکِ سنت میں فقیر کی جانب سے ماذون و مجاز ہیں جو طالب صادق ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ انھوں نے خود فقیر سے بیعت کی والعاقبۃ للمتقین۔

فقیر

ابوالکلام کان اللہ لہ

(۴؍شعبان، ۱۳۳۸ھ)

مولاناؒ کی ہدایت کے مطابق انھوں نے لکھنؤ کو مرکز بنا کے کام شروع کردیا۔ اس مدت میں کئی سو آدمی حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ اکتوبر یا نومبر ۱۹۲۰ء میں مولاناؒ نے انہیں کلکتہ بلالیا جہاں وہ مدرسۂ اسلامیہ کے قیام کے لئے کوشاں تھے اور اس کے اہتمام و انتظام کے لئے انہیں ایک قابل اعتماد رفیق کی ضرورت تھی۔

یہ مدرسہ تحریکِ ترکِ موالات کے زمانے میں سرکاری مدرسوں سے نکلے ہوئے طلبا کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ ۱۳؍دسمبر ۱۹۲۰ء کو گاندھی جی نے اس مدرسہ کا افتتاح کیا تھا۔ تقریباً دو سال تک نہایت شان کے ساتھ چلا۔ مولاناؒ کی وجہ سے بہت سے فاضل جمع ہوگئے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ندوہ کے فاضل عبدالرحمن نگرامی اس کے

اساتذہ میں شامل تھے۔ لیکن ۱۹۲۱ء کے اواخر میں مولانا آزادؒ اور ملیح آبادی مرحوم اور مدرسہ کے کئی اور ہمدردوں کی گرفتاریوں سے اس کی ترقی پر بہت برا اثر پڑا۔ پھر جوں جوں تحریک خلافت کا زور کم اور ترک موالات کا جوش ٹھنڈا پڑتا گیا۔ اس مدرسہ کی طرف سے بھی لوگوں کی توجہ ہٹتی گئی۔ اور بھی متعدد رکاوٹیں تھیں۔ رہائی کے بعد مولانا رحمتہ اللہ علیہ خود بھی اس کے لئے پورا وقت نہیں دے سکتے تھے۔ اس وجہ سے اس کی اہمیت کم ہوتی گئی اور آخر کار وہ برائے نام مدرسہ رہ گیا۔

مولانا ملیح آبادی کو لکھنؤ میں صرف پانچ چھ ماہ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس مدت میں جو کئی سو آدمی حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے ان میں مولوی شفاعت علی اور سردار محمد خاں کے نام خود ملیح آبادی کے بیان میں آئے ہیں اور کچھ مزید تفصیل کے علاوہ منے خاں کا ایک نام مولانا ریاست علی ندوی کی ایک تحریر میں آیا ہے۔ مولانا ریاست علی جو مولانا ملیح آبادی کے دوبارہ داخلۂ ندوۃ سے لے کر کلکتہ جانے تک ان کے ساتھ رہے تھے۔ اور ملیح آبادی کی زندگی اور ان کے کاموں کو ایک رازداں اور غمگسار دوست اور رفیق کی حیثیت سے دیکھا تھا، فرماتے ہیں:

> "مولانا ملیح آبادی نے بیعت کے سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ کرسچین کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی کے کچھ طلبا ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ نیز مولوی گنج اور گولہ گنج کے کچھ جوشیلے مسلمانوں نے بھی بیعت کی۔ جن میں منے خاں صاحب بھی تھے۔ اسی طرح رابرٹ گنج کے کچھ مسلمان جن میں بعض اطبا بھی تھے داخل حلقہ ہوئے تھے۔" لیکن جب مولانا آزادؒ کے بلاوے پر وہ کلکتہ چلے گئے تو بیعت وارشاد کا یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

مدرسہ اسلامیہ کلکتہ کے اہتمام کی ذمہ داری کے ساتھ، مولاناؒ کی نگرانی میں "پیغام" اخبار جاری کیا۔ ۱۹۲۱ء میں پیغام ہی کے ایک مضمون کی بنا پر ملیح آبادی گرفتار ہو گئے۔ اگرچہ وہ مضمون

خود ان کے قلم سے نہ تھا۔ مولانا نے ان کی گرفتاری پر ایک پر زور تحریر لکھی ۔ اس سے ملیح آبادی کی سیرت و کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے اور ان سے مولانا کے تعلق خاطر کا پتہ بھی چلتا ہے ۔ مولانا فرماتے ہیں :

" کل چار بجے جب میں بمبئی میل سے کلکتہ پہنچا اور متوقع تھا کہ حسب معمول اسٹیشن پر مولوی عبدالرزاق صاحب سے ملاقات ہوگی تو ان کی جگہ ان کی گرفتاری کی خبر نے میرا استقبال کیا ۔ وہ اسٹیشن پر ملتے تو میرے دل میں ان کی محبت بڑھتی جو گذشتہ دو سال سے برابر بڑھتی رہی ہے ۔ مگر وہ نہ ملے اور جیل خانے چلے گئے ۔ اس طرح انھوں نے صرف اپنی محبت ہی نہیں بلکہ اپنی عزت کے لئے بھی میرے دل سے تقاضہ کیا ۔ اب میں ان سے صرف محبت ہی نہیں کرتا ، بلکہ ان کی عزت بھی کرتا ہوں ۔ "

" ۱۹۱۸ء میں وہ ہندوستان واپس آئے اور اس وقت سے اب تک برابر علمی و قومی خدمات میں مشغول رہے ۔ نہ صرف وہ بلکہ ان کا پورا خاندان اپنے جوشِ ایمان اور حبِ اسلامی کے اعتبار سے اخلاص و عمل کا ایک قابل عزت گھرانا ہے ۔ ان کے والد اور تینوں بھائی ہمیشہ راہ حق و عمل میں سرگرم عمل رہتے ہیں ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ ان کے بڑے بھائی ملیح آباد میں اس لئے گرفتار کئے گئے تھے کہ انھوں نے مقاصد خلافت کی تبلیغ کے لئے ایک اعلان شائع کیا تھا ...... "

" دو سال ہوئے جب یہ مجھ سے ملے اور میں نے ان میں بہترین قابلیت علم و عمل نمایاں پائی ۔ یہ ملک کے ان مخصوص اہل علم نوجوانوں میں ہیں جن کی غیر معمولی قابلیتوں سے بہترین امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں ۔ انھوں نے خدمتِ خلق و دعوت کی راہ میں مجھ سے جو رشتہ رفاقت و اخوت جوڑا تھا وہ روز بروز قوی ہوتا گیا

اور ایک سچے رفیق اور بھائی کی طرح ان کی صداقت میرے دل کو جذب کرتی رہی۔

پچھلے دنوں جب مدرسہ جامع مسجد، عربی کا افتتاح ہوا تو میں نے انہیں کلکتہ بلالیا اور انہی کی محنت وسعی سے مدرسہ قائم ہوا۔ یہ مشغولیت ان کے لئے کم نہ تھی لیکن ان کا ولولۂ خدمت زیادہ وسیع میدان ڈھونڈتا تھا۔ بالآخر "پیغام" جاری ہوا اور اس کی ترتیب واشاعت کا تمام بار انھوں نے اپنے سر لے لیا۔ یہ کہنا ضروری نہیں کہ اس بار کے وہ اہل تھے اور نہایت مستعدی و قابلیت سے تن تنہا اس کی ایڈیٹری کرتے رہے قارئین پیغام میں کوئی شخص نہ ہوگا جو ان کی تحریروں کو دلچسپی و شوق کے ساتھ نہ پڑھتا ہوگا۔

اب وہ گرفتار ہو گئے۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے ان کی حسنِ نیت اور حسنِ عمل کو قبول کر لیا۔ اس بارے میں انسانی قلب کی درماندگیوں کا کچھ عجیب حال ہے، میں اگر کہوں کہ میرے دل پر کوئی صدمہ نہیں، تو یقیناً میں اپنے قدرتی جذبات کے لئے پردہ پوش ہوں گا۔ میں اپنے دل کو راز بنانا پسند نہیں کرتا۔ میرے دل کو ایسے موقعوں پر غم ہوا ہے..... لیکن الحمدللہ کہ دل کے جذبے پر دماغ کا ایمانی یقین واعتقاد غالب ہے..... میں خوش ہوں اور سچے دل سے اپنے عزیز و رفیق کو مبارکباد دیتا ہوں، وہ بے گناہ ہیں اور ان کی گرفتاری ان کے لئے ایک پاک عبادت ہے۔ انھوں نے جس سچی اور بے تکلف ہمت و بشاشت کے ساتھ اپنی گرفتاری کا استقبال کیا اور جس اطمینان و استقامت کے ساتھ اس وقت قید خانے میں ہیں، خدا تعالیٰ وہ جوہر ہر مسلمان کو عطا کرے (باقی)

اسلام کے اقتصادی نظام پر ایک نظر

از جناب کمال الدین ظفر ایم۔ کام و بی۔ ٹی۔ ایچ (علیگ)

اسلام دینِ فطرت ہے اور ہر اس چیز کا حکم یا اجازت دیتا ہے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہو اور ان تمام باتوں سے روکتا ہے جو تقاضائے فطرت کے خلاف ہوں۔ اسلام فی الحقیقت انفرادی و اجتماعی زندگی کی خوش حالی کا ضامن ہے۔ لہٰذا اسلام کے تمام احکام عدل و امن پر مبنی ہیں۔ اسلام نے فطری ضروریات کی حلال طریقہ سے تکمیل و تسکین کو فرض قرار دیا ہے اور یا کم از کم اجازت دی ہے۔ معاش اہم ترین انسانی فطری ضرورت ہے۔ اسلام نے کسب معاش کو فرض کیا ہے اور ذاتی و قومی فلاح کے لئے ایک مکمل معاشی نظام قائم کیا ہے جس کی بنیاد عدل و امن پر ہے اور جو فلاح و صلاح کا ضامن ہے۔ لہٰذا اسلامی اقتصادیات میں ہر وہ چیز غلط قرار دی گئی جس سے معاشرے کو کسی طرح کا نقصان پہنچتا ہو اور ہر وہ چیز روا رکھی گئی جس میں مضرت کا پہلو نہ ہو اور جو صالح معاشرت کی تشکیل کا باعث ہو۔ لہٰذا اسلامی اقتصادیات کے ہر شعبہ میں ہمیں تین[۳] اصول کارفرما نظر آتے ہیں۔

اسلامی اقتصادیات کے تین اصول اقتصادیات کے ہر شعبہ ــــــ تصنیع[۱]، تصرف[۲]، تبدیل[۳] تقسیم[۴] اور اطوار و ضوابط[۵] ــــ میں اصلاح[۱]، آزاد گردش[۲] اور مساوات[۳] کے اصول کارفرما ہیں یہ تینوں اصول بنیاد ہیں اسلامی اقتصادی نظام کے لئے۔

اسلامی اقتصادیات کا پہلا اصول اصلاحِ فرد و معاشرہ ہے، لہٰذا اسلامی اقتصادیات میں ہر وہ چیز غلط قرار دی گئی جس سے معاشرہ کے کسی فرد کو یا بحیثیت مجموعی پوری قوم کو

کسی طرح کا قرار واقعی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہو۔ اسی بناء پر خمریات کی بیع و شرا کو حرام قرار دیا گیا۔ اسلامی اقتصادیات کا دوسرا اصول آزادانہ گردشِ زر ہے۔ اسلام TURNOVER اور FREE FLOW کا قائل ہے۔ - CENTRALIZATION OF MONEY کو اسلام برداشت نہیں کرتا۔ اسی اصول کے تحت احتکار کی مذمت کی گئی، سود کو حرام قرار دیا اور قمار کی تمام شکلوں (معمہ، لاٹری، شرط بدنا وغیرہم) سے باز رکھا۔ اسلام دراصل زر ونقد کو STORED VALUE سے زیادہ MEDIUM OF EXCHANGE مانتا ہے جس سے زیادہ سے زیادہ افراد کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ اسلامی اقتصادیات کا تیسرا اصول عدل و مساوات ہے۔ اسی بنا پر سرقہ اور غصب کو حرام قرار دیا۔ یہی تین اصول اسلامی معیشت کے ہر شعبہ میں کارفرما نظر آتے ہیں۔ انسان اپنی معاش کسی بھی جائز طریقہ سے حاصل کرے، امن و اصلاح عدل و مساوات اور ترقی و خوش حالی اس کا مقصد ہونا چاہئے۔ ان اصولوں کو پیش نظر رکھ کر انسان ہر جائز پیشہ کو اپنا سکتا ہے، خواہ وہ تجارت و صنعت ہو یا زراعت و ملازمت۔ بھیک مانگنے کی اسلام نے مذمت کی ہے۔ مساوات اور خوش حالی لانے کے لئے امراء سے غربا تک انتقال زر کا بہترین طریقہ زکوٰۃ و فطرہ بتایا ہے۔ عام قومی اقتصادیات کے انتظام اور دیگر امور کے لئے حکومت کی موجودگی لازمی ہے۔ حکومت کی تحویل اور ذمہ داری میں بیت المال کو دیا۔ حکومت کو بھی تجارت و صنعت اور زراعت و خدمت علی الاجرۃ کا حق دیا۔ اس کے علاوہ حکومت محصول بھی لے سکتی ہے۔

تجارت کے شعبہ میں اسلام نے سود کو حرام قرار دیا بلکہ اس کو سرے سے تجارت ہی نہیں مانا اور وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فرما کر بیع و ربوا میں امتیاز فرما دیا۔ تجارت کی ہر تنظیم مثلاً انفرادی (SOLE TRADER) اور شرکت و مضاربت کو جائز بتایا گیا۔ انفرادی تجارت میں چونکہ ایک ہی شخص بلا شرکت غیرے نمائندہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں زیادہ مسائل نہیں ہوتے صرف عام اصولِ صداقت و دیانت کا ہی لحاظ ہوتا ہے۔ شرکت و مضاربت میں چونکہ افراد

کی تعداد ایک سے زیادہ ہوتی ہے لہٰذا ان کے باہمی تعلقات کی بنیاد پر مسائل سامنے آتے ہیں۔ شرکت میں ہر شریک اپنے سرمایہ کے مطابق نفع کا مستحق یا نقصان کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ کوئی شریک بغیر سرمایہ لگائے ہوئے صرف اپنی انتظامی ذمہ داریوں کی وجہ سے ایک خاص نسبت (RATIO) میں شریک ہوتا ہے لیکن نقصان میں اس کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔ شرکاء کے مابین نفع (اور نقصان) کی تقسیم ایک معین نسبت سے مثلاً فیصد یا کسر (تہائی، چوتھائی وغیرہا) ہونا چاہئے۔ ایک متعین اور مقررہ رقم (مثلاً صمار) کا حقدار یا ذمہ دار کسی شریک کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ نقصان کی صورت میں منتظم شریک (جس نے سرمایہ نہیں لگایا) ذمہ دار نہیں ہے کیوں کہ اس کی تمام محنت و کوشش رائیگاں ہو جانا ہی اس کا نقصان ہے بالکل اسی قاعدہ کے مطابق مضاربت میں نقصان کا ذمہ دار سرمایہ کار ہے، محنت کار نہیں۔ البتہ نفع میں ایک متعین نسبت سے دونوں شریک ہیں۔ یہاں بھی متعین نسبت ہے، کوئی رقم کسی بھی فریق کے لئے متعین نہیں ہے محنت کار رب المال کا اور ہر شریک اپنے شرکاء کا امین اور وکیل بھی ہوتا ہے (اگر غیر اختیاری طور پر مثلاً آفت سماویہ سے مال ہلاک ہو جائے تو تاوان نہیں) تمام موجودہ شرکاء کی اجازت سے (صراحۃً یا دلالۃً) کسی نئے فرد کو شریک کیا جا سکتا ہے۔ اور شرکت کو وسعت دے کر کمپنی کی شکل میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ کمپنی میں بھی اگر کچھ حصہ داروں کو ترجیح دی گئی اور ان کے لئے نفع کی ایک ... متعین رقم مقرر کر دی گئی تو کمپنی ختم ہو جائے گی یعنی اسلامی قانون کے تحت اس کا DISSOLUTION ہو جائے گا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ نفع کی تقسیم سرمایہ کی مناسبت سے ہو اور پھر ایک خاص رقم حصہ دار کے حوالے کر کے نفع میں سے اسکا باقی حصہ RESERVE کی صورت میں رہنے دیں، لیکن اس RESERVE پر صرف اسی حصہ دار کا حق ہے جس کے حصۂ نفع سے یہ RESERVE قائم ہوا ہے۔ اگر کوئی حصہ دار کمپنی سے علیحدہ ہوتا ہے تو اسے اختیار ہو گا اپنے حصہ کے نئے خریدار سے اس RESERVE کی قیمت وصول کر لے جب بھی فرم یا کمپنی DISSOLVE ہو تو سب جائداد یا اس کی قیمت شرکاء یا حصہ داروں میں ان کے

سرمایہ کی نسبت سے تقسیم ہو جائے گی۔

فرد واحد (SOLE) یا فرم یا کمپنی کو صنعت و زراعت اور خدمت علی الاجرۃ کرنے کا حق ہے صنعت و زراعت کے شعبہ میں کاریگر اور ماہرین سے مدد لے سکتے ہیں۔ کاریگروں کو نفع کا کچھ حصہ یا متعین رقم کی شکل میں اجرتِ معقودہ یا اجرت مثل دی جا سکتی ہے۔ تجارت میں جس طرح مضاربت جائز ہے زراعت میں وہی شکل مزارعت کی ہے۔ تجارت یا بیع اس چیز کی نہیں ہو سکتی۔ فی الحال جس کا وجود ہی نہ ہو۔ ہاں موجود اشیاء کی تجارت ہو سکتی ہے۔ تجارت میں جس طرح مضارب پر غیر اختیاری طور سے سرمایہ کے ہلاک ہو جانے پر کوئی تاوان نہیں اسی طرح مزارعت میں مزارع پر کوئی تاوان نہیں اور اسی طرح صنعت میں صانع یا کاریگر پر تاوان نہیں۔ اسی طرح ودیعت میں امین پر تاوان نہیں۔ اجارہ میں چیز کو کرایہ پر دیا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی شئے منقولہ یا غیر منقولہ کرایہ پر دی جا سکتی ہے لیکن سرمایہ کو کرایہ پر نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ یہ کرایہ سود ہے جو قطعی حرام ہے وجہ یہ ہے کہ سرمایہ جب واپس ہوتا ہے تو اپنی پوری قیمت کے ساتھ واپس ہوتا ہے یعنی السو" قرض دیا تو واپسی میں السو کے ہی نوٹ یا سکّے ملیں گے اور یہ ضروری نہیں کہ وہی نوٹ یا سکّے واپس ہوں جو قرض دیئے گئے تھے، دوسرے نمبر کے نوٹ یا سکّے بھی ہو سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے اشیاء میں متواتر گھساوٹ (DEPRECIATION) ہوتی رہتی ہے اور چیز میں واپسی کے وقت ضرور کچھ کمی ہو جاتی ہے۔ اسی کمی کے عوض کرایہ لیا جاتا ہے۔ اور کرایہ پر دی گئی چیز بھو بعینہٖ لا غیرہ واپس ہونا ضروری ہے۔ جو لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ "چیز کے حجم و وزن میں کمی کی وجہ سے جس طرح کرایہ لیا جاتا ہے اسی طرح روپیہ سے تھوڑے عرصہ تک دست بردار رہنے کی وجہ سے ہم اپنے تجارتی منافع میں کمی کرتے ہیں جس کا عوض سود ہے" وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ:

۱۔ دستبرداری کا عوض سود نہیں بلکہ منافع ہوتا ہے اور یہ منافع مضاربت کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔

۲۔ اگر اپنی تجارت میں اس کو لگایا جاتا تو کچھ کام بھی کرنا پڑتا اور ذمہ داری (RISK) بھی قبول کرنا پڑتی۔ اسی کا عوض وہ منافع ہوتا۔ یہاں سود کا معاملہ یہ ہے کہ بغیر کسی RISK اور WORK کے جو رقم حاصل ہوتی ہے وہ صریحاً حرام ہے۔

۳۔ کرایہ پر دی جانے والی چیز سے بھی کرایہ پر دی گئی مدت تک انتفاع محال ہوتا ہے پھر بھی واپسی کے وقت کچھ قیمت کی (DEPRECIATED) چیز واپس ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے قرض دی گئی رقم پوری قیمت کے ساتھ واپس ہوتی ہے۔ پھر بھی اس پر ایک زائد رقم کا مطالبہ سراسر ظلم ہے۔ قرض لینے والا اگر کوئی اضافہ غیر مشروط طور پر اپنی خوشی سے کر دے وہ جائز ہے۔ لیکن کسی معینہ رقم کا مطالبہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہاں ایک معین اور مشروط شرح سے زیادتی کا مطالبہ صرف مضاربت میں جائز ہے وہ بھی:

(۱) متعین و مشروط "شرح" کی زیادتی نہ کہ "تعداد و مقدار" کی۔

(۲) متعین و مشروط شرح "منافع" پر نہ کہ "اصل سرمایہ" پر

(۳) صرف اس وقت جب نقصان کی صورت میں پورے نقصان کی ذمہ داری بھی لی ہو۔

مضاربت کے اصول پر ہی بنک قائم ہو سکتے ہیں۔ یہ بنک بانڈ اور سیکیورٹی کی تجارت بھی کر سکتے ہیں جس میں سود کی شکل نہ ہو۔ یعنی کسی کمپنی کے حصے (SHARES) خرید و فروخت کر سکتے ہیں لیکن سودی قرض ناموں (DEBENTURES) کی تجارت نہیں کر سکتے۔ بنک انفرادی ملکیت بھی ہو سکتا ہے، فرم بھی ہو سکتی ہے اور کمپنی بھی۔ بنکنگ کے علاوہ (STOCK EXCHANGE) کا کام بھی افراد، فرم یا کمپنیاں کر سکتی ہیں۔ حکومت بھی BANKING یا STOCK EXCHANGE کا کام سنبھال سکتی ہے۔ صنعت و تجارت اور زراعت و اجارت کے علاوہ اپنی خدمات کے صلہ میں حکومت TAX بھی وصول کر سکتی ہے۔ جنگلوں، دریاؤں، پہاڑوں، وحشی جانوروں اور معدنیات وغیرہم قدرتی خزینوں پر (جن کا کوئی ادارہ یا

فرم مالک نہیں ہے) حکومت کا اختیار رہے اور یہ تمام چیزیں قوم کی بھلائی میں صرف ہونا چاہئیں، اور بیت المال کے تحت اس کا انتظام ہو۔ اس کے علاوہ آب وہوا کے ذخائر قوم کی مشترکہ دولت ہے۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ تمام قدرتی ذرائع کو قوم کی فلاح کے کام میں لائے۔ قوم اور افراد کے جان و مال کی حفاظت بھی حکومت پر فرض ہے جس کے لئے وہ TAX وصول کرنے کی مجاز ہے۔ آفات سماویہ وارضیہ مثلاً ژالہ باری، شدت باراں، سیلاب اور قحط سے عوام کو جو نقصان پہنچا ہو، حکومت بیت المال سے اس کی تلافی کرے۔ بیمہ کا نظام بھی اسی طریقۂ کار پر چلایا جا سکتا ہے۔ آگ اور سمندر کے بیمہ میں ایک مخصوص رقم حکومت یا بیمہ کمپنی لے سکتی ہے اور اس کے عوض مال کی ذمہ داری .... لے گی اور نقصان کی صورت میں تلافی بھی کرے گی۔ زندگی بیمہ میں زندگی چونکہ ایک غیر معین شے ہے لہٰذا اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ یوں بھی زندگی بیمہ ایک خالص قمار بازی ہے اور معاشیات کے حلقہ میں شامل نہیں ہے۔

تصنع، تصرف، تبدیل اور تقسیم کی دیواروں پر اطوار وضوابط کی چھت ڈال کر اقتصادی قلعہ کی تعمیر ہوتی ہے لیکن اس میں استحکام اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب اس کی بنیاد اسلامی ہو ورنہ سرمایہ داری کی بنیاد پر یہ چاروں دیواریں ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہو جائیں گی کہ سوائے ایک بنجر ٹیلہ کے عمارت کا وجود نہ رہے گا اور اشتراکیت کی بنیاد پر اس عمارت کے اجزاء اتنے منتشر ہو جائیں گے کہ اقتصادی عمارت کا وجود بلکہ نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ صرف اسلامی بنیاد پر یہ قلعہ قائم رہ سکتا ہے۔ اور اس قلعہ کے اندر پناہ لے کر معاشرہ فاقہ کشی، غذائی قلت، بے روزگاری اور پست معیارِ زندگی کے حملوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

"نظام تصنع"

اقتصادیات کی پہلے حلقہ تصنع میں —— PRODUCTIVITY MAXIMIZATION ہونا چاہئے۔ یعنی قدرتی ذرائع کا پورا پورا استعمال کیا جانا چاہئے۔ اور یہ پورا استعمال یا....

FULL UTILIZATION OF NATURAL RESOURCES معاشرہ کی فلاح وبہبود کے لئے ہو۔ کوئی ایسی چیز تیار نہ کی جائے جس سے افراد کی زندگی اور صحت خطرے میں پڑ جائے۔ مثلاً خمریات پر پابندی ہو یعنی شراب، افیون، کوکین وغیرہم نہ تیار کی جائیں۔ فحش کتابوں کی تصنیف وطباعت نہ ہو۔ نئی نئی مصنوعات وایجادات ایسی ہونا چاہئیں جن سے افراد کی دماغی وجسمانی صلاحیتوں میں اضافہ ہو اور دولت وقوت تیز وقت کی بچت ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مصنوعات سے قومی معیار زندگی پست نہ ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر فرد کسی کام میں مشغول ہو۔ کسی بھی جائز کام کو حقیر وذلیل سمجھ کر چھوڑ نہ دے۔ ملازمت اور غلامی کی حقیر تمنا کو ٹھکرا کر تجارت کے میدان میں قدم رکھے یا کسی صنعت میں (خواہ وہ کتنے ہی چھوٹے پیمانے پر ہو) اپنی صلاحیتیں صرف کرے۔ اپنی ضروریات کی چیزیں جو بھی تیار کر سکتا ہے خود ہی بنالے۔ بیروزگاری کا علاج یہ ہے کہ قومی مسائل کے حل کے لئے آزادانہ فکر وکوشش کرے یعنی کوئی ذاتی صنعت یا تجارت یا زراعت کا شغل اختیار کرے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی کے پاس سرمایہ اور زمین نہ ہو تو وہ کس طرح صنعت وتجارت یا زراعت اختیار کرے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ:۔

(۱) بہت سی صنعتیں ایسی ہیں جن کو لوگ حقیر سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں انہیں سرمایہ کی ضرورت نہیں ہوتی مثلاً مٹی کے برتن بنانا، کھجور کے پتوں سے پنکھے، چٹائیاں اور دوسری چیزیں (وغیرہا)

(۲) بہت سی صنعتیں بہت قلیل سرمایہ سے شروع ہو سکتی ہیں۔ مثلاً جلد سازی، کاغذ کے گلدستے، گتے کے بکس وغیرہم۔

(۳) اگر ذاتی سرمایہ نہ ہو کہ مضاربت یا شرکت کے اصول سے فائدہ حاصل کیا جائے۔ چند افراد کی قلیل رقوم ایک کثیر مجموعی سرمایہ بن سکتی ہیں۔ مثلاً اگر دس اشخاص شرکت میں تجارت پر راضی ہوں اور ہر ایک ۵ے دے یا بیس اشخاص شرکت کے لئے تیار ہو جائیں اور ہر ایک کا CONTRIBUTION ہو ۵ے تو یہ رقم ۵۰ے ہوتی ہے جس سے کوئی بھی چھوٹا کاروبار شروع کیا جا سکتا ہے۔

(۴) زراعت کے لئے اگر بہت زیادہ زمین نہ ہو تو چھوٹی سی جگہ میں ہی ترکاریاں اگائی جاسکتی ہیں۔ پانی میں مچھلیاں پکڑی جاسکتی ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ بے روزگاری کا حل بھی اسلام میں موجود ہے۔ ملازمت کے لئے عزت نفس کو بیع کردینا یا بھیک مانگنا قطعاً غیر ضروری ہے۔ جس ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا یہ اقتصادی نظام پیش کیا ہے۔ اس نے ایک سائل کو ہدایت کی تھی کہ اپنی خودداری کو فروخت کرنے کے بجائے جنگل سے لکڑیاں کاٹ لاؤ اور انہیں فروخت کرو۔ چنانچہ اس کام میں اس سائل کو خدا نے برکت عطا فرمائی۔ اسلام میں ملازمت حرام نہیں ہے اور تمام جائز پیشوں کے ساتھ ملازمت بھی جائز ہے۔ لیکن کہنا صرف یہ ہے کہ بے روزگاری کا حل بھی اسلام میں موجود ہے اور ہر انسان کسی بھی جائز طریقہ سے کسی PRODUCTION میں لگا ہے اور یہ PRODUCTION انسانی فلاح کے لئے ہو۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے صالح غذا، صالح لباس اور جائے پناہ کا انتظام ہو۔ ان کی تعلیم کے لئے معیاری کتب کی تصنیف واشاعت ہو۔ تحفظ صحت کے لئے دواسازی کی بھی صنعت ہو۔ آمدورفت کے لئے سواریاں بھی میسر ہوں قوت (ENERGY) اور وقت (TIME) کی حفاظت اور بچت کے لئے اور صالح تفریح طبع کے لئے بھی مصنوعات ہوں وغیرہم۔

"نظام تصرف"

تصرف کے حلقہ میں اسلام نے ان تمام چیزوں کو حلال کیا ہے جو نوع انسانی کے لئے ضروری ہیں اور ایسی تمام اشیاء حرام قرار دی گئی ہیں جن سے افراد یا معاشرہ کی روحانی، قلبی، ذہنی اور جسمانی صحت پر نقصان دہ اثر پڑسکتا ہے۔ اسلام نے کسب معاش کو فرض کیا حصول معاش واقعی ایک امر دقیق ہے لیکن اس سے بھی زیادہ مشکل کام حاصل شدہ آمدنی کو سلیقہ سے خرچ کرنا ہے۔ اخراجات کی جن مدوں کا اسلام نے حکم دیا ہے ان میں سب سے پہلے اپنے اور اہل وعیال کے بعد والدین کی خدمت احسن طریقہ سے (زکوٰۃ وفطرہ سے ممتاز) اور پھر امداد اقرباء ویتامیٰ ومساکین ومسافر وسائل ومقروض (وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى

والمسٰکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب) زکوٰۃ و فطرہ کے ذریعہ اور جو کچھ بچے اس میں
تحائف اور پرخلوص مدارات ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ آمدنی کے ہر جز کو FULLY UTILIZE
کر لیا جائے اور بچا کر نہ رکھا جائے کیوں کہ اس طرح قومی آمدنی کا ایک حصہ LOCKED UP ہو
جاتا ہے اور آزادانہ گردش باقی نہیں رہتی اس طرح بحیثیت مجموعی قومی آمدنی میں بھی کمی ہوتی ہے
کیوں کہ ایک شخص کا خرچ دوسرے کی آمدنی ہوتا ہے۔ لہٰذا جب پوری آمدنی میں سے ایک حصہ خرچ
میں سے بچا لیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے اشخاص کی آمدنی اور مجموعی قومی آمدنی کا
ایک حصہ کم ہو جاتا ہے۔ بچت کا مقصد عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ پس انداز کی ہوئی رقم مستقبل کی نادیدہ
ضروریات کی کفالت کر سکے۔ لیکن یہاں تو ایک عقیدۂ توحید پہ زد پڑتی ہے کہ خدائی قوت کے
وجود کا پشتہ رقم میں یقین ہونے لگتا ہے دوسرے عملی میدان میں لوگ اپنی ضروری جدوجہد اور
جفاکشی سے اس لئے کنارہ کش ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے کافی رقم پس انداز کر لی ہے اور پھر یہ
پس اندازہ رقم سرمایہ داری اور سود کو فروغ دیتی ہے۔ جس مزدور و مقروض کا EXPLOITATION
ہوتا ہے ..... تیسرے یہ کہ ملک میں DEPRESSION کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں جس کا لازمی
نتیجہ بے روزگاری کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ چوتھے یہ کہ پس اندازہ رقم تلف بھی ہو سکتی ہے
یا INFLATION کی صورت میں اس کی قیمت بھی کم بلکہ ختم ہو سکتی ہے۔ اس لئے اسلام بچت یا
SAVINGS کو نہیں بلکہ INVESTMENT کو پسند کرتا ہے

"نظام مبادلہ"

تصرف کے بعد تبدیل کا نمبر آتا ہے۔ مبادلہ کا مقصد اشیاء صرف کو صارفین تک پہنچا
دینا ہے۔ مبادلہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ جس چیز کی بیع ہو رہی ہے وہ موجود ہو، دو فریق ہوں مبیع
کے عوض میں کچھ ثمن بھی ہو اور دونوں فریق معاملہ کرنے میں آزاد ہوں یعنی FREE CONSENT
ہو اور یہی چاروں شرائط INDIAN CONTRACT ACT, 1872 میں بھی ہیں۔ ایجاب
جب قبول ہو جائے تو عقد بیع تکمیل پاتا ہے اور اس سے مبیع کی ملکیت بدل جاتی ہے۔ اسلامی نظام

کے تحت بھی مبادلہ کی یہی صورت ہے لیکن BARTER SYSTEM میں ادھار بیع وشراء کو ناجائز قرار دیا گیا ہے ایک ہی جنس کے مبادلے میں تفاضل کو بھی حرام بتایا گیا ہے۔ مگر — MONETARY ECONOMIES میں اُدھار جائز ہے۔ البتہ بین الاقوامی تجارت میں اب بھی BARTER SYSTEM کے ہی احکام مطلق ہیں جب تک کہ کسی خاص ملک کی (CURRENCY) کو ذریعۂ مبادلہ نہ مان لیا جائے۔ جب یہ خاص CURRENCY بطورِ معیارِ مبادلہ قبول کرلی گئی اور اسکی قیمت میں زیادہ تغیر بھی نہیں ہوتا تو اب بین الاقوامی قرض ومبادلہ جائز ہوگیا کیوں کہ اب یہ BARTER نہیں بلکہ MONETARY ECONOMY ہے۔ مبادلہ میں ثمن کو کسی دوسرے پر حوالہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ شرا میں خیار رؤیت اور خیار عیب بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن مبادلہ میں مساوی فائدہ بہت ضروری ہے یعنی ثمن ومبیع اپنی UTILITY میں برابر ہوں اور یہ اصول سرق وغصب، لاٹری، جوا، فیس والے معمّے اور BLACKMARKETING کا دروازہ بند کرتا ہے کیوں کہ ان سب ہی میں دونوں فریقوں کو EQUAL UTILITY نہیں ملتی۔ "مساوات" کا یہ اصول اسلامی اقتصادیات کا تیسرا اصول ہے جس کا اطلاق مبادلہ میں صوبائی، ملکی اور بین الاقوامی تجارت پر بھی ہوتا ہے علاوہ ازیں پہلا بنیادی اصول "اصلاح" ہے جس کی رو سے SMUGGLING ناجائز ہے کیوں کہ SMUGGLING کے اثرات اکثر منفی ہوتے ہیں۔ اسلامی اقتصادیات کا دوسرا اصول "آزاد گردش" ہے اور حقیقت میں یہی "تجارت" یا "BUSINESS" ہے کیوں کہ اسی کے مطابق، زر ونقد اور مال واشیاء "جاری" یا "BUSY" رہتے ہیں ورنہ وہ "راکد" یا "LAZY" ہوجاتے ہیں اور پھر وہ "تجارت" نہیں بلکہ "ترکید" یا "LAZINESS" ہوتی ہے اسی وجہ سے تصرف میں بچت اور مبادلہ میں احتکار کی مذمت کی گئی ہے۔ بچت کی طرح احتکار کا مقصد عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ روکے ہوئے ذخیرے سے مستقبل میں افادیت حاصل کی جائے لیکن اول تو اس سے جذبۂ خدمت خلق پر ضرب لگتی ہے دوسرے عملی میدان میں لوگ MARKETING کی صلاحیت کھودیتے ہیں اور پھر یہ چھپائے ہوئے ذخائر BLACK MARKET اور منافع خوری کو فروغ دیتے ہیں جس سے

صانع وصارفین کا ضرر ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ملک میں INFLATION کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ تقصیرِ قدر ہوتا ہے۔ چوتھے یہ کہ ذخیرہ شدہ مال تلف بھی ہو سکتا ہے یا DEFLATION کی صورت میں اس کی قیمت کم اور DEPRESSION میں ختم بھی ہو سکتی ہے، اس لئے خود ذخیرہ اندوز کو ہی منافع خوری کا لالچ برباد کر سکتا ہے۔ پانچویں احتکار سے ملکی برآمدات میں خلل اور درآمدات میں اضافہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلامی اقتصادیات میں احتکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

"نظامِ تقسیم"

اقتصادیات کی چوتھی فصل تقسیم ہے جو بہت نازک ترین معاملہ ہے۔ صنعت ہو یا حرفت، تجارت ہو یا زراعت شرکت ہو یا مضاربت۔ ہر ایک کا مقصد حاصل شدہ آمدنی کو پیداوار کے اسباب و ذرائع (FACTORS OF PRODUCTION) میں تقسیم کرنا ہے۔ پیداوار کے یہ محرکات ہیں: ۱۔ زمین و عمارت، ۲۔ سرمایہ، ۳۔ محنت، ۴۔ انتظام اور ۵۔ ذمہ داری۔ لہٰذا پیداوار یا آمدنی کو انہیں محرکات (FACTORS) پر ۱۔ کرایہ، ۲۔ سود ۳۔ مزدوری، ۴۔ تنخواہ اور ۵۔ منافع کے نام سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ تیسرے محرک (مزدوروں) کی تعداد باقی سب کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہوتی ہے لہٰذا یہ سب مزدوروں کے مقابلہ پر متحد ہوتے ہیں اور اس طرح سماج میں محنت کا ر اور "سرمایہ دار" (اس میں باقی چاروں FACTORS شامل ہیں) کی سرگرم جنگ جاری رہتی ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جو نظریات پیش کئے گئے ہیں ان میں اشتراکیت اور سرمایہ داری یہاں تک مشہور ہوئے کہ اقتصادیات کی حدود سے نکل کر سیاست میں پہنچ گئے۔ لیکن دنیا کا کون انسان کہہ سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی غیر جانبدارانہ ہے۔ یہاں اسلام اور صرف اسلام آگے بڑھ کر مسئلہ کو "غیر جانبداری اور انصاف"، "آزاد گردش" اور "اصلاح" کے ساتھ حل کرتا ہے اور اس کے لئے دوسرے (سرمایہ) اور پانچویں محرک (ذمہ داری) کو علیحدہ نہیں کرتا اور سرمایہ دار کو ذمہ داری سے آزاد نہیں کرتا اور سود کی اجازت نہیں دیتا۔ اس طرح مزدوری کے حریفوں کی تعداد صرف تین رہ جاتی ہے، اور کل FACTORS کی تعداد چار۔ اب انتظام کا کام یا تو سرمایہ دار کے سپرد کیا جاتا ہے یا مزدور و ملازم کو دیا جاتا ہے اور

اس طرح اسلامی اقتصادیات کے پہلے اصول اصلاح کی بنیاد پر اختلاف کو کم کیا جاتا ہے اور مزدوری کے صرف حریف باقی رہتے ہیں اس کے بعد عدل و مساوات کی بنیاد پر زمین دار یا عمارت کے مالک کو اتنا معاوضہ ملے گا جتنا اس میں DEPRECIATION ہوا ہے مزدور کو اتنی مزدوری ملنی چاہیئے کہ اس کی خرچ شدہ ENERGY بحال ہو جائے۔ باقی رقم سرمایہ دار کو مل جائے گی (خواہ وہ کتنی ہی کثیر المقدار ہو کیوں کہ نقصان کی صورت میں برداشت بھی اسی کو ہی کرنا تھا)

"اطوار و ضوابط"

اقتصادیات کے ہر گوشے پر چھت کی طرح چھائی ہوئی جو چیز ہوتی ہے وہ ہیں اطوار و ضوابط اسلامی اقتصادیات کے اطوار و ضوابط کے تحت، سرمایہ دار اپنے سرمایہ کی وجہ سے منافع کی ایک کثیر رقم حاصل تو کر سکتا ہے لیکن نقصان کی صورت میں وہی تنہا اس کا ذمہ دار بھی ہوگا۔ منافع بھی اگر ہو تو یہ مزدوروں کی واجب مزدوری اور دوسرے محرکات کو ان کا مناسب عوض دینے کے بعد ہوگا۔ اور اس منافع پر اس کا جائز حق اس لئے ہے کہ یہ اس کے سرمایہ، اس کے انتظام اور اس کی ذمہ داری کا عوض ہے اور پھر بھی بہت ممکن ہے کہ منافع کی شکل میں یہ بقیہ رقم مزدوروں کی مزدوری سے بھی کم رہ جائے لیکن اگر یہ کثیر المقدار بھی ہے تو بھی زکوٰۃ و فطرہ کے ذریعہ اس کا ایک بڑا حصہ منتقل اور وراثت کے ذریعہ اس کا پورا وجود منتشر ہو جائے گا۔ پھر سرمایہ دار کو حکومت کے محاصل بھی ادا کرنا ہیں لیکن یہ ادائیگی اس وقت روکی بھی جا سکتی ہے جب محاصل کی رقم قوم کی فلاح بہبود پر خرچ ہونے کے بجائے حکمران افراد کی ذات پر صرف ہوتی ہو حکومت کی ذمہ داری ہے کہ بیت المال کا نظام پوری دیانت کے ساتھ چلائے تہذیب کے نام پر مخرب اخلاق عادات و حرکات پر قومی دولت کا کوئی حصہ نہ تو حکومت صرف کرے اور نہ افراد کو اس کی اجازت دے۔

<u>حرف آخر</u> اس طرح اسلامی نظام اقتصادیات کے تحت قوم اسراف بیجا سے بچی رہیگی۔ پورا معاشرہ خوشحال ہوگا کسی فرد کو کوئی تکلیف نہ ہوگی اسلامی نظام کے تحت اقتصادی ترقی کی نئی نئی راہیں بھی نکل سکتی ہیں BANKING بیمہ اور STOCK EXCHANGE کے ادارے قائم ہو سکتے ہیں۔ معیار زندگی بلند ہو سکتا ہے، غذائی اور بیروزگاری کے مسئلے حل ہو سکتے ہیں انسانی فلاح کا ضامن اسلامی نظام ہے - ٥٥٥

ابوبکر باقلانی کے تنقیدی افکار

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی ایم اے، پی ایچ ڈی لیکچرر شعبۂ عربی وینکٹیشور یونیورسٹی۔ آندھرا

ابوبکر باقلانی کے تنقیدی افکار اپنی عظمت کے لحاظ سے اس قدر اہم ہیں کہ چوتھی صدی ہجری کے ناقدوں میں ان کو اچھی خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ انھوں نے ادبی تنقید... پر کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔ مگر اپنی کتاب "اعجاز القرآن" میں انھوں نے زبان و بیان کے رموز و نکات پر جو عالمانہ اور فنکارانہ مباحث پیش کئے ہیں ان کی مثال بہت سی خالص تنقیدی کتابوں میں بھی ملنی مشکل ہے۔ اس عظیم ناقد نے قرآن مجید کے محاسن کا مطالعہ مختلف انداز سے کیا ہے۔ اس طرح باقلانی نے درحقیقت اعجاز القرآن میں ادبی تنقید میں تقابلی مطالعہ کے طریقہ کا رواج ڈالا ہے۔ اس خاص نقطۂ نظر سے اتنی کامیاب کوشش اس سے قبل کبھی نہیں کی گئی تھی۔ باقلانی نے عربوں کے ادبِ عالیہ سے قرآن مجید کے محاسن کا مقابلہ کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کی زبان اور اس کا اسلوبِ بیان سب سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ ان مباحث میں باقلانی کے زمانے کے تمام ادبی و تنقیدی رجحانات شامل ہو گئے ہیں جن سے کتاب کی عظمت بڑھ گئی ہے۔

علماء نے اس امر کی کوشش کی کہ قرآن مجید کے معجزہ کو اس کی زبان و حسن بیان میں تلاش کریں چنانچہ قرآن مجید کی ادبی زبان کے محاسن پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں کچھ زمانہ کے دست برد کی نذر ہو گئیں اور کچھ آج بھی ہمارے لئے تنقیدی بصیرت کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ جو کتابیں باقی رہ گئی ہیں ان میں اعجاز القرآن مصنفہ رمانی (المتوفی ۳۰۹ھ)

کتاب مشکل القرآن مصنفہ ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) اعجاز القرآن از خطابی اور معانی القرآن مصنفہ فراء (متوفی ۲۰۷ھ) ایسی کتابیں ہیں جو تیسری صدی ہجری میں تصنیف کی گئیں۔ جس طرح شعراء کے تراجم میں کتابیں لکھی گئیں اسی طرح قرآن مجید کے محاسن و بیان پر کثرت سے کتابیں تصنیف کی گئیں اسی طرح بیک وقت ادبی تنقید ایک طرف ادب کے دامن میں اور دوسری طرف قرآن مجید کے دامن میں یکساں پروان چڑھتی رہی۔ اس نقطۂ نظر کی تفسیر کرتے ہوئے ڈاکٹر زغلول سلام نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ خالص عربی تنقید قرآن مجید سے وجود میں آئی۔ علماء نے تنقید کے عناصر، طرز بیان میں قرآنی نہج سے مستنبط کئے۔ یہی وہ عربی تنقید کا مکتب فکر ہے جو یونانی اور فلسفیانہ مدرسہ کی ضد میں وجود میں آیا۔

بہر حال اس بحث میں اتنی بات یقینی ہے کہ خالص عرب ناقدوں نے یونانی اثرات کی مخالفت کی ہے۔ باقلانی نے درحقیقت دونوں مدارسِ فکر سے تاثر قبول کر کے قرآن مجید کے اسلوبِ بیان کی عظمت کو سامنے لانے کی قابل ستائش جدوجہد کی ہے۔

باقلانی نے قرآن مجید میں سجع کے وجود سے انکار کیا ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ قرآن مجید شعر نہیں ہے اس لئے کہ اس میں وزن نہیں پایا جاتا[1]۔ وہ سجع سے بھی مبرا ہے اس لئے کہ سجع میں معنی اس لفظ کا پابند ہو جاتا ہے جس سے صفت سجع ظاہر ہوتی ہے[2] جس کلام میں معنی لفظ کا پابند ہوگا وہ کبھی عمدہ اور دلکش نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں الفاظ معانی کے ماتحت استعمال کئے گئے ہیں اس لئے اس میں سجع کا وجود نہیں۔

ان کا یہ نظریہ ہے کہ کلام حسن و بلاغت میں مختلف معیار کا ہوتا ہے۔ ایک معنی سے دوسرے معنی کی طرف کامیابی سے منتقل ہونا فنی مہارت چاہتا ہے اور اکثر اس مرحلہ میں کامیابی حاصل

---

[1] اعجاز القرآن تالیف ابو بکر باقلانی تحقیق احمد صقر طبع دار المعارف مصر ص ۵۸

[2] ایضاً ص ۵۸

نہیں ہو پاتی، مگر قرآن مجید کا معاملہ اس کے برعکس ہے اس کی زبان میں تفاوتِ کلام بالکل پایا نہیں جاتا۔ اس طرح نہایت بلاغت و کامیابی سے قرآن مجید میں انتقالِ معانی کی مثالیں موجود ہیں۔ اگر ہم شعراء کے کلام پر غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان کے کلام میں فروق و تفاوت پایا جاتا ہے۔ کسی معنی کو بڑے فنی انداز سے وہ پیش کرتے ہیں اور کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی مفہوم کو پیش کرنے میں وہ بری طرح ناکام نظر آتے ہیں۔ بعض شعراء ایسے ہیں کہ قصیدہ میں وہ ایک اعلیٰ فنکار کے لباس میں ظاہر ہوتے ہیں مگر "رجز" میں ان کا مرتبہ بہت گھٹ جاتا ہے بعض نثر..... عمدہ لکھتے ہیں مگر ان کی شاعری میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا اسی طرح بعض شاعری میں ممتاز ہوتے ہیں مگر نثر میں فنی حیثیت سے بہت گر جاتے ہیں[1]۔

مذکورہ اختلافات کی بنا پر باقلانی نے شعراء کو مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم کیا ہے۔

کچھ شعراء ایسے ہیں جو مدح میں ید طولیٰ رکھتے ہیں مگر ہجو میں بالکل ناکام ہیں۔ بعض ہجو میں صاحبِ امتیاز ہیں مگر مدح میں نہیں چل سکتے۔

بعض شعراء مدح میں عمدہ کلام پیش کرتے ہیں مگر مرثیہ میں عاجز ہیں۔ اسی طرح کچھ شعراء مرثیہ میں عظمت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ مگر دوسری اصنافِ سخن میں عاجز نظر آتے ہیں۔

اسی طرح بعض شعراء اونٹ اور گھوڑے کی تعریف میں مہارت کا ثبوت دیتے ہیں، بعض رات کے سفر، باغوں کی تعریف، شراب نوشی کی کیفیات، عورتوں کے متعلق جذبات اور جنگ کے بیان پر قدرت تامہ رکھتے ہیں کسی کو کسی خاص موضوع پر خاص ملکہ ہوتا ہے اور کسی کو کسی دوسرے موضوع پر امتیاز حاصل ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ مثل مشہور ہے امرؤ القیس جب گھوڑے پر سوار ہو تو عمدہ شاعر کے لباس میں جلوہ گر ہوتا ہے نابغہ جب خوف کی حالت میں ہو تو بڑا شاعر ہے زہیر

---

[1] اعجاز القرآن مؤلفہ باقلانی ص ۵۴۔۵۵

کو جب رغبت ہو تو وہ عظیم شاعر ہے اور اعشی جب پی لے اور خوش ہو تو بڑا شاعر ہے۔ بالکل یہی کیفیت خطبات، رسائل اور کلام کی دوسری اصناع میں بھی پائی جاتی ہے[۱]

باقلانی رقمطراز ہیں کہ عربوں کا عقیدہ تھا کہ "جن" بھی اشعار موزوں کرتے ہیں چنانچہ انھوں نے جنوں کے سترہ اشعار نقل کر کے یہ ثابت کیا کہ وہ بھی قرآن مجید کی ایسی زبان استعمال کرنے سے عاجز ہیں[۲] تعجب اس پر ہے کہ باقلانی نے کیوں کر جنوں کی طرف منسوب اشعار کو صحیح تسلیم کر لیا ہے

ان کا نظریہ یہ ہے کہ عمدہ کلام میں جتنی خوبیاں ممکن ہو سکتی ہیں وہ سب قرآن مجید میں موجود ہیں۔ یہ اوصاف الطناف، ایجاز، جمع، تفریق، استعارہ، تصریح اور تحقیق وغیرہ جیسی خوبیوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں[۳] مطلب یہ ہوا کہ عمدہ کلام کی یہ خوبیاں ہونی چاہئیے

عمدہ کلام وہ ہے جس میں الفاظ و معانی باہم مناسبت کے ساتھ پائے جائیں الفاظ معانی سے نہ بڑھنے پائیں۔ اور معانی الفاظ سے تجاوز نہ کریں۔ ایسی شکل میں فصاحت کی جلوہ گری پوری طرح ظاہر ہوتی ہے[۴]

باقلانی حسنِ کلام کا ایک معیار بیان کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ عمدہ کلام وہ ہے کہ دوسرے کلام و اشعار کے درمیان اس طرح ممتاز ہو جائے کہ انسانی نفوس کو اپنی طرف متوجہ کر لے۔ اس کی رونق اور چمک اس طرح واضح ہو جیسے موتی کنکروں میں چمکے یا جیسے یاقوت ہار میں[۵]

ان کا خیال ہے کہ کلام کو وحشی طرز عبارت و الفاظ سے خالی اور صنعت و تکلف سے مبرا ہونا چاہئے۔ یہاں تک کہ سنتے ہی وہ دل میں گھر کر جائے۔ اس کو اتنا شیریں ہونا چاہئے

---

[۱] اعجاز القرآن ص ۵۴ [۲] ایضاً ص ۵۸ تا ۶۱ [۳] ایضاً ص ۶۲

[۴] ایضاً ۶۳ [۵] ایضاً ص ۶۴

جیسے آبِ زلال مگر اس کا حال یہ ہو کہ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ وہ بھی ایسا آسان کلام کہنے پر قادر رہے لیکن جب کہنا چاہے تو اس کو ایسا محسوس ہو جیسے کہ وہ اس کلام سے اتنی دور ہے جتنے ستارے اس سے دور ہیں[1]

وحشی و مستکرہ کلام تمام ادباء و شعراء کے یہاں موجود ہے حتیٰ کہ امرؤالقیس کے یہاں بھی پایا جاتا ہے[2]

باقلانی کہتے ہیں کہ شعر کو اجزاء کے اعتبار سے مساوی ہونا چاہئے یہ مساوات طول وقصر، ساکن اور حرکت سب میں لازم ہے[3]

باقلانی ابتدائے شعر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شاعری بغیر قصد کے وجود میں آئی جب لوگوں نے یہ نظام دیکھا تو بہت پسند کیا۔ اور انداز پر عمداً شعر کہنے لگے[4] ان کا خیال ہے کہ عربوں کی شاعری ان کی نثر سے زیادہ فصیح ہے[5]

نظم قرآن کے بارے میں باقلانی نے ایک طویل بحث کی ہے۔ جس میں ادبی تنقید کے مظاہر پوری طرح جلوہ گر ہیں۔ اس میں چند وہ قصائد بھی ہیں جن کی عظمت پر عرب ناقدین کا اجماع ہے انھوں نے ان کو لے کر ان کی تحلیل کر کے ان کے عیوب ونقائص کو واضح کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ عمدہ سے عمدہ کلام میں بھی کتنے عیوب موجود ہیں مگر اس کے مقابلہ میں قرآن میں کسی قسم کا کوئی عیب ونقص نہیں پایا جاتا[6]

باقلانی نے امرؤالقیس کے مندرجہ ذیل اشعار پر تنقید کی۔

ففاضت دموع العین منی صبابۃ		علی النحر حتی بل دمعی محملی

---

[1] اعجاز القرآن ص ۹۹		[2] ایضاً ص ۷۰		[3] ایضاً ص ۸۴ - ۸۹ -

[4] ایضاً ص ۶۵ - ۹۶		[5] ایضاً ص ۲۳۶

[6] ایضاً ص ۲۳۷ تا ۲۴۱

محبت کی وجہ سے سینہ پر آنکھوں سے آنسو بہہ کر آئے حتیٰ کہ میرا محمل بھیگ گیا۔

الارب یوم کان منھن صالح ولا سیما یوم بدارۃ جلجل

بعض دن ان عورتوں کی وجہ سے بڑے پر لطف گذرے خصوصاً جو دن " دارہ جلجل میں گذرا

اس میں عیب یہ ہے کہ لفظ " منی " حشو ہے اسی طرح " علی النحر " بھی حشو غیر بلیغ ہے " دمعی

محملی " بھی حشو ہے صرف وزن کو برقرار رکھنے کے لئے شاعر کو یہ سب کرنا پڑا ورنہ " محمل بھیگ

گیا " کہنا کافی ہے۔ اسی طرح دوسرا شعر بھی عمدہ معانی اور دل کش طرز بیان سے

عاری ہے[1]

دوران تنقید باقلانی نے بعض اشعار کی تعریف بھی دل کھول کر کی ہے۔ مثلاً

یہ شعر:-

قد اغتدی والطیر فی وکناتہا بمنجرد قید الاوابد ھیکل.....

میں سویرے جب کہ چڑیاں اپنے گھونسلہ میں ہوتی ہیں ایک بڑے اور تیز گھوڑے

پر نکلتا ہوں۔

وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں لوگ عمداً ایسے اشعار کہنے کی کوشش کرتے ہیں

مگر دور جاہلیت میں لوگ فطری طور پر ایسے اشعار کہتے تھے جس کی وجہ سے ان میں تکلف کی جھلک

ذرا بھی نظر نہیں آتی[2]

اگرچہ باقلانی نے امرؤ القیس کے قصیدہ پر بہت سخت تنقید کی ہے مگر اس سے یہ حقیقت

بھی سامنے آجاتی ہے کہ اس دور میں تنقید ترقی یافتہ تھی اور اشعار کی تنقید بڑی ژرف

نگاہی سے کی جاتی تھی۔ ناقد الفاظ و معانی سب ہی پر گفتگو کرتا تھا۔ وہ مذکورہ قصیدہ کے بارے

میں لکھتے ہیں کہ اس میں ناپسندیدہ، وحشی اور سوقی اشعار بھی ہیں متوسط درجہ کے بھی ہیں۔

---

[1] اعجاز القرآن ص ۲۴۹ تا ۲۵۰ [2] ایضاً ص ۲۷۶-۲۷۷

اور چند عمدہ بھی ہیں۔ جس میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ پھر اس طرز کے قصائد دوسرے شعراء کے یہاں بھی مل جاتے ہیں یعنی امرؤ القیس کے قصیدہ کے مثل محاسن دوسروں کے یہاں بھی موجود ہیں[1] اس کے بعد وہ قرآن مجید کی فصاحت و عظمت کا بیان کرتے ہیں[2]

اس کے بعد باقلانی بحتری کے قصیدہ پر آتے ہیں جس کا مطلع ہے :-

اھلاً بذلکم الخیال المقبل   فعل الذی نھواہ اولم یفعل

مبارک ہے یہ آنے والا خیال جواز خود آرہا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ "ذلکم الخیال" حشو اور ثقل روح ہے۔ اس مفہوم کا صنوبری کا شعر نقل کر کے باقلانی اس کو زیادہ عمدہ قرار دیتے ہیں۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ حسنِ شعر ایک حرف کی کمی یا زیادتی سے ختم ہو جاتا ہے۔ وہ "فعل الذی تھواہ اولم یفعل" کو بھی ایک ناپسندیدہ الفاظ اور عبارت قرار دیتے ہیں۔

اس قصیدہ کے ایک شعر کی انھوں نے تعریف کی ہے۔

برق سری فی بطن وجرۃ فاھتدت

وجرہ کے بطن میں بجلی چمکی تو اس کی

بسناہ اعناق الرکاب الضلل .....

روشنی سے ان سواریوں نے جو راہ بھول گئی تھیں راہ پالی

وہ لکھتے ہیں کہ یہ شعر حسن و خوبی کا منبع ہے۔ اس کے باوجود اس شعر پر یہ تنقید کی گئی کہ اس میں "بطن وجرہ" حشو ہے پھر روشنی کی کسی مقام تک تحدید بھی مناسب نہیں۔ بجلی چمکنے سے راہ پانا ایک ایسا تخیل ہے جس میں کوئی جدت نہیں اس سے قبل بھی لوگوں نے اس کیفیت کو بیان کیا ہے[3] یہ باقلانی کی تنقید کا ایک نمونہ تھا جو پیش کیا گیا۔

---

[1] اعجاز القرآن ص ۲۷۷   [2] ایضاً ص ۲۳۵ تا ۳۳۸

ان کے نزدیک تنقید ایک مستقل فن ہے۔ جس طرح اپنے فن کے رازوں سے صراف اور بزاز واقف ہوتا ہے اور وہ دوسروں کو نہیں معلوم ہوتے اس طرح کلام کے حسن و قبح سے ناقد کو پوری واقفیت ہوتی ہے البتہ اس میں اہل نظر کا اختلاف قابل قبول ہو سکتا ہے[1]

ناقدوں کے ذوق پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ بعض ناقد پرشکوہ کلام پسند کرتے ہیں اور بعض سلیس عبارت کے شائق ہوتے ہیں۔ بعض غامض معنی و غریب لفظ کے دلدادہ ہوتے ہیں بعض صنائع و بدائع پر جان دیتے ہیں۔ بحتری الفاظ کی شیرینی پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا تھا۔ کچھ ناقد مبالغہ کو روحِ شاعری تصور کرتے ہیں اور کچھ صداقت کو حاصلِ شاعری سمجھتے ہیں۔ بعض وحشی کلام کے شائق ہیں جیسا کہ مفضل نے منصور کے لئے اپنی کتاب "المفضلیات" میں وحشی کلام منتخب کیا ہے اس پر اکثر ناقد متفق ہیں کہ درمیانی راہ بہتر ہے چنانچہ جو طریقہ ابو تمام نے حماسہ میں اختیار کیا ہے وہ افضل ہے۔ جو ناقد وحشی اشعار منتخب کرتا ہے تاکہ اس کا علم ظاہر ہو تو وہ کسی مقصد کے لئے تو ٹھیک ہے مگر شعر کی شیرینی و عظمت اسکو حاصل نہیں ہوتی[2]

ناقد کو ایسا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے کہ کسی شاعر کے چند قصائد کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اسکے دوسرے اشعار کی شناخت آسانی سے کر سکتا ہے[3] البتہ کبھی دو شاعروں کے درمیان رنگ کی مشابہت کی وجہ سے ناقد پر معاملہ مشتبہ ہو سکتا ہے جیسے بحتری اور ابو تمام کے بعض اشعار خصوصاً وہ اشعار جن میں ابو تمام نے فطری سادگی اختیار کی ہے۔ جو ناقد شعر کی معرفت میں کامل نہ ہو وہ تنقید میں عظمت کا حامل نہیں ہو سکتا[4] ناقد کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کون دیوان چور ہے اور کون واقعی صاحب کمال ہے[5]

---

[1] اعجاز القرآن ص ۱۷۲ [2] ایضاً ص ۱۷۲ تا ۱۷۸ [3] ایضاً ص ۱۰۳

[4] ایضاً ۱۸۹ [5] ایضاً ۱۸۵ - ۱۸۶

ناقد ہر شاعر کے رنگ کا شناسا ہوتا ہے اس کو بحتری، ابن رومی، ابو نواس، مسلم، اعشٰی، امرؤ القیس نابغہ، زہیر، جریر، اخطل، فرزدق اور لبیث کے درمیان فروق خوب معلوم ہیں[1] اسی طرح نثری اسالیب کے امتیازات بھی اس کی نگاہوں میں ہوتے ہیں۔ عبد الحمید کے اسلوب سے لے کر لبید تک کے اسالیب کے فروق کو وہ بہ طرزِ احسن جانتا ہے[2]

بعض کلام ایسا ہوتا ہے کہ اس میں معانی کم عبارت زیادہ ہوتی ہے۔ بعض میں عبارت کم اور معانی زیادہ پائے جاتے ہیں۔ بعض کلام میں معانی و الفاظ بالکل مناسبت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ بعض مواقع پر ایک جملہ کافی ہوجاتا ہے۔ اور بعض مواقع پر تفصیل کی ضرورت پیش آتی ہے[3] اس طرز کے جملے کبھی عمدہ ہوسکتے ہیں کبھی مذموم اور کبھی متوسط۔[4]

غزل کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ جب غزل عاشق کی زبان سے کہی جاتی ہے تو بر رونق ہوتی ہے اور جب وہ تکلف کے ساتھ موزوں کی جاتی ہے تو مذموم بن جاتی ہے[5]

کلام نفوسِ انسانی کے اندر پوشیدہ خیالات و آراء کے اظہار کا نام ہے۔ اس لئے ایسے الفاظ کا انتخاب مناسب ہے جو مطلب کو زیادہ واضح کرتے ہوں۔ ان میں غرابت وغیرہ نہ ہو تاکہ ٹھیک سے سمجھ میں آسکیں۔ البتہ عبارت عامی و سوقی نہ ہونی چاہیے[6] فنکار ایک مصور کی مانند ہے جو دوسروں کے لئے اپنے نفس کی تصویریں پیش کرتا ہے[7]

یہ تنقیدی افکار جو باقلانی کی کتاب میں ملتے ہیں وہ چوتھی صدی ہجری میں عربی

---

[1] اعجاز القرآن ص ۱۸۴ [2] ایضاً ص ۱۸۴-۱۸۵ [3] ایضاً ص ۱۸۱

[4] ایضاً ص ۱۸۱ تا ۱۸۲ [5] ایضاً ۱۸۱ [6] ایضاً ۱۷۸

[7] ایضاً ص ۱۸۱

تنقید کے ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس عظیم ناقد نے عربی تنقید میں تقابلی مطالعہ کا آغاز کیا۔ بعد میں قاضی جرجانی نے درحقیقت اسی انداز پر اپنی کتاب الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ ۔۔۔ لکھی جس میں تقابلی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ دوسری اہم تنقیدی خدمت باقلانی نے یہ انجام دی کہ ان کی کتاب نے یونانی اور عرب مکاتب فکر کو ایک دوسرے سے قریب لانے کا کام کیا۔ انھوں نے کسی مکتبی تعصب کو دخل نہیں دیا اور یونانی وعربی دونوں تنقیدی مکاتب فکر سے استفادہ کرکے قرآن مجید کی عظمت کو پیش کیا۔

باقلانی کی سب سے بڑی عظمت تو یہ ہے کہ انھوں نے عملی تنقید کو اپنی کتاب میں پیش کیا۔ عملی تنقید کی جاندار مثالوں سے اعجاز القرآن پر ہے۔ اس طرح درحقیقت باقلانی نے ادبی تنقید کو مختلف حیثیتوں سے آگے بڑھایا اسی بنا پر زغلول سلام نے اپنی کتاب "اثر القرآن فی سطور النقد الادبی" میں ان کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ مگر تعجب ہوتا ہے کہ محمد مندور نے النقد المنہجی میں ان کی عظمت کو نظر انداز کیا ہے حالانکہ چوتھی صدی ہجری کے ناقدوں میں باقلانی کی تنقیدی کاوش ایک منارۂ نور ہے جس سے عرب ناقدوں نے روشنئ فکر ونظر حاصل کی ہے۔

ایک گمنام شخصیت

حضرت حکیم انور خاں انور

واحد کاظمی

انور خاں انور ریاست گوالیر کے اپنے زمانے کے ایک بڑے طبیب اور مہاراجہ سندھیا کے خاص معالجوں میں سے ایک تھے۔ طب اور حکمت میں خاص قابلیت رکھنے کی وجہ سے انہیں افسر الاطبا کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔ علاج و معالجہ ہی ان کا پیشہ تھا۔ گھر میں ایک بیوی اور ایک نوجوان بیٹیا تھا۔ اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ بیوی بڑی ہی اطاعت شعار تھی۔ بیٹے جن کا نام اکبر تھا اپنے والد کے نقش قدم پر چلنے والے اچھے حکیم تھے۔

انور خاں کو اردو، ہندی، عربی اور فارسی زبان پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ وہ ان چاروں زبانوں میں نثر ہی میں نہیں نظم میں بھی اپنی تخلیقات پیش کر سکتے تھے اردو شاعری میں انہیں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ ان کے ہم عصر اردو اور فارسی کے شاعروں میں شاہ غمگین کے علاوہ وحید الدین خاں، لالہ جگل کشور اور منشی نذر محمد خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انور خاں نے سیکڑوں غزلیں، نظمیں، قطعات وغیرہ کے علاوہ تقریباً چار سو رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ شاعری کے علاوہ تصوف اور فلسفہ کے بھی وہ بڑے عالم تھے۔ تصوف سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ زندگی کے آخری دنوں میں وہ بالکل زاہد و عابد ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کی شخصیت مختلف علوم کا ایسا سرچشمہ تھی کہ لوگ آپ کے شاگردوں میں شامل ہونے کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔ آپ کے قریب ہو کر لوگ اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے اور سکون و طمانیت کی دولتِ بیش بہا حاصل کرتے تھے۔

ہندی ادب میں ان کی سب سے بڑی عطا ان کی چار سو کے لگ بھگ کنڈلیاں ہیں۔ یہ

کنڈلیاں انھوں نے اپنے ایک محبوب شاگرد عبدالقادر کے اصرار پر اور ان کی خدمت سے خوش ہو کر لکھی تھیں۔ یہ تمام کنڈلیاں ہندی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ اگرچہ ان کنڈلیوں کو فارسی رسم الخط میں قلم بند کیا گیا ہے لیکن ان کی زبان خالص ہندی ہے۔ ان کنڈلیوں کو فارسی رسم الخط میں قلم بند کرنے کی وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن ان کی اشاعت میں یہی چیز سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ کنڈلیوں کو قلم بند کرنے کا فخر ان کے فرزند اکبر خاں کو حاصل ہوا۔ یہ قلمی نسخہ مجلد نہایت حسین خط میں اچھی حالت میں شاہ غمگین اکیڈمی گوالیر میں محفوظ ہے۔ اس میں کنڈلیوں کے علاوہ اردو رباعیوں کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ کنڈلیوں کا زمانہ تصنیف انھوں نے سمبت ۱۲۰۰ بکرمی بیان کیا ہے۔

کنڈلیوں کے بارے میں مختصر الفاظ میں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ اس عالم شاعر نے بڑے حسن وخوبی کے ساتھ کوزے میں دریا کو بھر دیا ہے۔ ان کی اس تصنیف سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر صرف شاعر ہی نہیں بلکہ روحانیت کا بہت بڑا عالم بھی ہے۔ کسی کسی جگہ تو شاعر نے ہندوستانی تلمیحات کو اس طرح بنایا ہے کہ ہم حیران رہ جاتے ہیں۔ ہندوستانی روحانیت پر ان کی نظر گہری تھی۔ وید، پران وغیرہ کے ساتھ انھوں نے گیتا اور شاستروں کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ ان تمام باتوں کی تصدیق خود ان کی کنڈلیوں کے ذریعہ ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ "یوگ" اور یوگ سے متعلق مختلف اعمال واشغال سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ ان کی کنڈلیوں میں 'یوگ' سے متعلق اشغال کے ساتھ اٹھ، نترکوٹی اور ترمیا، وغیرہ اعمال کا ذکر بھی ملتا ہے، مادہ اور روح کی تعریف، ان کا باہمی تعلق، روح اور جسم کا باہمی تعلق ورشتہ، دل اور جسم کے افعال، روح کا تزکیہ، نفسانی ومادی خواہشات اور ان کا انضباط، برہم کی تعریف، اس کا وجود، خدا اور کائنات وغیرہ ....

سیکڑوں موضوعات کے ساتھ اخلاق اور کردار سے متعلق کنڈلیاں بھی کثیر تعداد میں ہیں۔

روحانیت کے علاوہ انور خاں ہندوستانی فلسفہ کو بھی اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لئے کسی کسی جگہ فلسفیانہ نقطۂ نظر کی جھلک بھی ان کے کلام میں ملتی ہے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد پر بہت زور دیتے تھے۔ وہ جس طرح اردو، عربی، فارسی، تصوف اور اسلامی فلسفہ کے عالم تھے۔ اسی طرح ہندوستانی روحانیت، ہندوستانی فلسفہ اور ہندی کے بھی قدرداں تھے۔ ان کے دل میں ہندو مسلم سب کے لئے جگہ تھی۔ برائی جہاں بھی نظر آئی اسے دور کرنے کی وہ حتی الامکان کوشش کرتے۔ وہ ہمیشہ اس کے لئے کوشاں رہے کہ لوگ اوہام پرستی کو چھوڑ کر صحیح راستہ پر چلنے لگیں۔ جہاں انھوں نے مسلم طبقے میں پھیلی ہوئی برائی، اوہام پرستی اور ریاکاری پر سخت تنقید کی ہے وہیں انھوں نے ہندو سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں اور اوہام پرستی پر بھی سخت تنقیدیں کی ہیں۔ وہ دونوں ہی طبقے کے بہی خواہ اور ہندی اور اردو دونوں ہی زبانوں کے خادم تھے۔ ایسی شخصیتیں اور مثالیں تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔ ان کے شاگردوں میں جہاں مسلم اور اردو زبان کے جاننے والے ملتے ہیں وہیں ہندی زبان کے جاننے والے ہندو بھی ان کے شاگردوں میں شامل تھے۔

انور خاں کی کنڈلیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک ایک کنڈلی جس موضوع پر لکھی گئی ہے وہ نہایت حسن اور خوبی کے ساتھ اس میں بیان ہوا ہے۔ اردو شاعری میں جو مقام رباعیات کا ہے ہندی میں وہی مقام کنڈلیوں کو حاصل ہے۔ کنڈلیوں کے ذریعہ بھی تقریباً ہم کو اسی طرح کا لطف حاصل ہوتا ہے، جو رباعیات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ انور خاں کے یہاں عام شاعروں کی طرح ہر کنڈلی صرف وعظ بن کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ ہر کنڈلی میں اتنی صداقت اور فطری انداز بیان پایا جاتا ہے کہ اس کا قاری کے دل پر لازماً اثر ہوتا ہے۔ کنڈلیوں کا مطالعہ کرتے وقت ان کی سطر سطر سے علم اور لطف وانبساط دونوں یکساں طور پر حاصل ہوتا ہے۔ انہیں پڑھنے کے بعد قاری لازماً کچھ سوچنے اور غور وفکر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر ان کی چند کنڈلیاں پیش کی جا رہی ہیں:-

آپی آپ بنائے کر، کایا کا یہ کوٹ
نینن سے آنکت رہے، پلکوں کی کر اوٹ
پلکوں کی کر اوٹ، رہیں نینوں کے اندر
من سے اس کو جان لے اس کو تو انور
بھیتر آپی بیٹھ کر، باہر مارے چوٹ
آپی آپ بنائے کر، کایا کا یہ کوٹ

اس جھوٹے سنسار نے بہت دکھائے چھل
اس میں سب روتے رہے، گئے ہاتھ کومل
گئے ہاتھ کومل، رہی سب من کی من میں
کال سے بستی میں بچے اور نہ بچے نہ بن میں
پیڑ سے اس سنسار کے کبھی نہ کھائے پھل
اس جھوٹے سنسار نے، بہت دکھائے چھل

کایا تو ایک سیپ ہے، من کو موتی جان
موتی کی جو جھلک ہے، اسے 'برمھ' پہچان
اسے 'برمھ' پہچان، جھلک موتی سے آئی
موتی، جھلک کے بیچ کب ہوئے جدائی
موتی کی جو آن ہے انور اُسی کو مان
کایا تو ایک سیپ ہے، من کو موتی جان

جس کا اس سنسار میں، کھوٹا ہوا سو بھاؤ
اس کھوٹے سے دور رہ، پاس نہ اس کے جاؤ
پاس نہ اس کے جاؤ، پیٹ کانٹوں سے بھر لو
بوجھا لکڑی کاٹ لاؤ اور سر پر دھر لو
انور جب لگ ہو سکے اس سے کرو بچاؤ
جس کا اس سنسار میں کھوٹا ہوا سو بھاؤ

سرگن کو چھوڑو نہیں، نرگن کو پہچان
جب نرگن تو جان لے، لگا اسی سے دھیان
لگا اسی سے دھیان، جان سرگن کو سیڑھی
بنا سہارے چڑھ سکے، اک قدم نہ کیڑھی
نرگن، سرگن ایک ہیں، انور کہا تو مان
سرگن کو چھوڑو نہیں، نرگن کو پہچان

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ انور کا ہندی سے لگاؤ صرف کنڈلیوں تک نہیں تھا ہندی کی مختلف اصناف میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ موسیقی سے بھی انھیں لگاؤ تھا۔ موسیقی میں وہ سروں کے ماہر تھے۔ انھوں نے علمی سُر سنگیت پر مبنی کئی راگ راگنیاں جیسے ٹھمری، دادرا، راگ کلیان، راگ ایمن وغیرہ اور بھجن، ساون، ہولی وغیرہ بھی لکھی ہے۔ موسیقی سے متعلق تخلیقات کا مجموعہ تلاش کیا جا رہا ہے اور مذکورہ تصنیف میں بھی کچھ اس طرح کی چیزیں ملی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے یہاں ان کے نمونے نہیں پیش کئے جا رہے ہیں۔

انور خاں کے مزار کے بارے میں یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ انھوں نے اپنا مقبرہ اپنی

وفات سے تقریباً ۱۷، ۲۰ سال قبل ہی تعمیر کرالیا تھا۔ مقبرہ سے متعلق ان کے ہمعصر اردو، فارسی کے شاعروں نے تاریخی قطعات کہے ہیں، جو اکثر فارسی میں ہیں۔ خود انور خاں نے بھی اس سلسلہ میں اردو میں شعر کہے ہیں۔ ان سے ہجری کے تین سنہ نکلتے ہیں۔ یعنی ۱۲۷۶ھ، ۱۲۷۷ھ، اور ۱۲۷۸ھ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقبرے کی تعمیر..... وغیرہ کا کام مسلسل دو سال تک ہوتا رہا۔ کچھ اشعار مقبرے کی بنیاد رکھے جاتے وقت کہے گئے ہیں، کچھ اس کی تکمیل کے موقعہ پر اس لئے ان میں دو سال کا فرق پایا جاتا ہے۔ انور خاں کی وفات رمضان ۱۲۷۸ھ میں ہوئی۔ وفات کے بعد ان کی خواہش کے مطابق انہیں اس مقبرے میں دفن کر دیا گیا جس کی تعمیر وہ اپنی زندگی میں ہی کرا گئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی رفیقِ حیات نے بھی ایک سال کے بعد ہی اس دارِ فانی کو خیرباد کہا۔

انور خاں کا باغ اور باغ میں تعمیر شدہ وہ حسین مقبرہ گوالیار میں گنوٹمنٹ روڈ پر واقع ہے لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ ایسی بڑی شخصیت کو ایک ادب نواز، علم دوست، اتحاد کے علمبردار اور اچھے شاعر کی حیثیت سے کوئی نہیں جانتا۔

ایران میں چند روز

(۴)

سعید احمد اکبر آبادی

دوسرا دن یعنی ۲۶ مارچ ایران میں قیام کا آخری دن تھا اور اسی کو کچھ خرید و فروخت اور کچھ ملاقاتوں کے لئے مخصوص رکھا تھا۔ اس لئے حسبِ قرارداد صبح ناشتہ کے بعد ہی معتمدی آگئیں اور میں ان کے ساتھ طہران یونیورسٹی گیا۔ یونیورسٹی تو بند تھی لیکن میری ایک عزیزہ طاہرہ صدیقی جو فارسی میں ایم اے ہیں ایران گورنمنٹ کے وظیفہ پر یہاں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہی ہیں ان سے ملنا ضروری تھا۔ اس لئے معتمدی مجھ کو سیدھا ہوسٹل میں لے کر آئیں۔

تہران یونیورسٹی میں قاعدہ ہے کہ تعطیلات کے زمانہ میں کوئی طالب علم ہوسٹل میں قیام نہیں کر سکتا لیکن بیرونی ممالک کے طلباء اور طالبات اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس بنا پر یونیورسٹی اور اس کے ہوسٹل ہر جگہ سناٹا اور خموشی کا عالم تھا۔ بس دو چار نوکر اِدھر اُدھر چلتے پھرتے اور کام کرتے نظر آتے تھے۔ بہرحال ہم ہوسٹل میں داخل ہوئے ہی تھے کہ دہلی یونیورسٹی کے مسٹر محمد اظہر جو یہاں طاہرہ کی طرح ایران گورنمنٹ کے وظیفہ پر پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں باہر برآمدے میں ہی ایک کرسی پر بیٹھے نظر آگئے۔ مجھ کو ان کے پہچاننے میں کچھ تامل ہوا لیکن انھوں نے فوراً پہچان لیا۔ بڑے تپاک اور اشتیاق سے ملے۔ انھوں نے ہی طاہرہ کو اطلاع کر دی تو وہ بھی دو تین منٹ میں آگئیں۔ اس ہوسٹل میں اور اس کے علاوہ بعض دوسرے ہوسٹلوں میں چند اور لڑکیاں میری واقف کار تھیں۔ طاہرہ نے ان سب کو فون کر دیا اور پانچ چھ منٹ کے اندر اندر چھ سات لڑکیاں اور پہنچ گئیں۔ ان میں روشن آرا، نزہت، شمیم اور ایک ترک لڑکی

صائمہ، میری بچیوں مسعودہ[۵۱] اور ریحانہ[۵۲] کے ساتھ کی کلکتہ یا علی گڈھ کی تعلیم یافتہ اور ان کی سہیلیاں ہیں ان کے ساتھ دو تین لڑکیاں اور تھیں جن سے میں پہلے سے واقف نہیں تھا۔ غرض کہ تھوڑی سی ہی دیر میں بڑا اچھا مجمع ہو گیا۔ ان سب بچیوں کو بھی ایسی خوشی ہوئی کہ گویا ان ہی کے خاندان کا کوئی بزرگ آگیا ہے۔ طاہرہ نے کہا: ہم نے چند روز ہوئے آپ کو مشہد یونیورسٹی میں مقالہ پڑھتے ہوئے ٹیلی وژن پر دیکھا تھا اور اسی سے آپ کی آمد کا علم ہوا تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ طہران کب پہنچ رہے ہیں اور یہاں آئیں گے تو کہاں ٹھہریں گے۔ اس لئے سخت پریشانی تھی کہ دیکھئے ملاقات ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ ہم بات چیت کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں ذرا فاصلے پر ایک سن رسیدہ بزرگ کمرہ سے باہر نکل کر ایک طرف کو جاتے ہوئے نظر آئے۔ میاں اظہر نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ مشہور مستشرق ایووناف (١٧٥٨٥٧) ہیں۔ میں ان کے نام اور کام سے واقف تھا۔ فوراً لپک کر ان کی طرف بڑھا۔ اظہر نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ موصوف اصلاً و نسلاً روسی ہیں لیکن شروع میں ہی برطانیہ کی رعایا بن گئے تھے۔ فارسی زبان اور ادب کے نامور محقق ہیں۔ اس کے علاوہ عربی کے عالم اور لاطینی، یونانی اور سنسکرت سے بھی خوب واقف ہیں۔ عرصہ تک ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کا خاص تحقیقی کام اسماعیلی مذہب اور اس کی شاخوں اور شعبوں پر ہے۔ اب اِدھر کم و بیش دس برس سے تہران یونیورسٹی میں مقیم ہیں۔ اس وقت ان کی عمر اسی برس سے کیا کم ہو گی۔ کمر میں خمیدگی پیدا ہو گئی ہے اور کمزور بہت ہو گئے ہیں۔ ایسی مشہور نامور شخصیت سے یہ چار پانچ منٹ کی ملاقات ہی میرے لئے راحت تھی۔ افسوس ہے کہ ہندوستان میں واپس آنے کے چار مہینے کے بعد یعنی جولائی ۱۹۷۰ء میں ان کی وفات کی خبر بھی سن لی۔

مسٹر ایوونناف سے ملاقات کر کے واپس آیا ہی تھا کہ دیکھا میز پر نہایت مکلف ناشتہ کافی

---

[۵۱] زوجۂ مسٹر ابوالمحمود سعید منیجنگ ڈائرکٹر جلینا لٹریچر لمیٹڈ۔ مشرقی پاکستان۔

[۵۲] اہلیہ ڈاکٹر شیخ اسلم پروفیسر شعبۂ تاریخ۔ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور۔

اور چائے دونوں کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ تعجب بھی ہوا کہ یہ سب اس قدر جلد کیسے ہو گیا لیکن طاہرہ بی بی نے کہا: ہمارے لئے ہاں باورچی خانہ کا تمام سامان برقی ہے اور چیزیں ہر قسم کی اسٹور میں رہتی ہیں اس لئے بہت سے لوگوں کی پرتکلف دعوت کا انتظام منٹوں میں ہو سکتا ہے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں! ناشتہ اور گفتگو سے فراغت کے بعد میں نے کہا کہ چونکہ آج ہی واپسی ہے اس لئے کچھ خرید و فروخت کرنا اور بازار جانا ہے تو طاہرہ اور شمیم بھی ساتھ ہو گئیں۔ ایک ٹیکسی میں یہ دونوں اور معتمدی اور میں ہم چاروں فروش گاہ فردوسی آئے اور دو تین گھنٹے اس میں گشت کرنے کے بعد طاہرہ بی بی اور معتمدی کی رہنمائی میں چند چیزیں خریدیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ایران میں نہایت عمدہ قسم کا بڑا اور بھنا ہوا پستہ ہمارے سکہ کے حساب سے سات روپے کیلو اور خالص زعفران سولہ روپے تولہ ملتی ہے۔ اب ان کا مقابلہ اپنے ملک کی قیمتوں سے کیجئے اور سیکولرزم اور جمہوریت اور سوشلزم اور عوامی و فلاحی حکومت جیسے دلفریب نعروں کے نام کی مالا جپئے: چیزیں اس قدر سستی اور پھر مجال ہے کہ کوئی شخص کھانے پینے کی چیزوں میں کسی قسم کی کوئی ملاوٹ کر سکے۔ پستہ اور زعفران کے علاوہ یہاں خاص چیزیں دو اور ہیں ایک فیروزہ اور ساتھ ہی عقیق اور یاقوت۔ اور دوسرا پلاسٹک کا ڈنر سیٹ یہ ڈنر سیٹ نہایت نازک حسین اور ساتھ ہی مضبوط ہوتا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ ہم لوگوں کو زر تبادلہ (EXCHANGE) ہی کتنا ملتا ہے۔ اس لئے فیروزہ کو مستثنیٰ کر کے طبیعت کی وسعت کے مطابق تھوڑی بہت یہ سب اور کچھ اور چیزیں خریدیں۔ معتمدی اور طاہرہ بی بی اپنا اپنا پرس کھول کر اصرار کرتی رہیں کہ جتنی ضرورت ہو روپیہ ہم سے لے لیجئے۔ لیکن میں نہ مانا اور ان کی پیش کش قبول نہ کی۔ اب بازار میں پھرتے پھرتے تکان ہو گیا۔ اور وقت بھی کافی ہو گیا تھا اس لئے طاہرہ اور شمیم مغرب کے بعد میرے ہوٹل میں آنے کا وعدہ کر کے ایک ٹیکسی میں اپنے ہاسٹل روانہ ہوئیں اور میں اور معتمدی سامان لے کر ایک اور ٹیکسی میں ہوٹل پہنچے۔

اب تک میں عزیزہ معتمدی کے گھر جا کر ان کی والدہ محترمہ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا تھا۔ اس لئے میں نے ہوٹل پہنچ کر آ نعزیزہ سے کہا کہ وہ سہ پہر میں چار بجے کے قریب آ جائیں اور مجھے

اپنے گھر لے چلیں۔ چنانچہ حسب قرارداد ٹھیک چار بجے وہ ہوٹل پہنچ گئیں اور میں ان کے ساتھ ٹیکسی میں
روانہ ہوا۔ اب سب سے زیادہ دلچسپ اور سننے کے قابل بات یہ ہے کہ میں نے معتمدی سے کہا کہ مجھ کو
ان کی والدہ صاحبہ کے لئے ایران کے دستور کے مطابق پھولوں کا ایک بہت اچھا گلدستہ خریدنا ہے
اس لئے مکان سے پہلے پھولوں کی جہاں اچھی اور بڑی دکان ہو ہمیں اتر جانا چاہئے۔ انھوں نے
کہا آپ فکر نہ کیجئے۔ میں آپ کو ایک عمدہ اور قیمتی تحفہ خرید کرا دوں گی۔" چنانچہ مکان سے دس بارہ قدم
پہلے ہم ٹیکسی سے اتر گئے اور معتمدی مجھ کو لے کر کپڑے کی ایک بڑی دکان میں گھس گئیں اور مختلف ڈیزائن
اور رنگوں کے کپڑے دیکھنے کے بعد ایک اچھا باوضع کپڑا پسند کر کے اس میں سے دس گز کپڑا طلب کیا
جس کی قیمت چالیس روپے تھی۔ اب میں نے ہر چند اصرار کیا کہ قیمت میں ادا کروں گا لیکن معتمدی ایک
نہ مانیں اور قیمت کی ادائیگی انھوں نے ہی کی۔ جب مکان کا دروازہ آیا تو انھوں نے کپڑا میرے
ہاتھ میں دے دیا کہ میں اپنی طرف سے والدہ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں
کہ آنسہ عزیزہ نے ٹیکسی کا کرایہ تو ایک مرتبہ بھی مجھ کو کہیں ادا نہیں کرنے دیا تھا۔ یہ کپڑے کا معاملہ سمند ناز
پر ایک اور تازیانہ ہوا۔

اب میں مکان میں داخل ہوا تو معتمدی کی والدہ محترمہ نے مسکراتے ہوئے اور اپنی زبان
میں ترحیب کے کلمات کہتے ہوئے دروازہ پر استقبال کیا اور مجھے لے کر ڈرائنگ روم میں آئیں۔
مکان اگرچہ بڑا نہیں ہے لیکن نہایت صاف ستھرا اور ایرانی ذوق کے مطابق آراستہ و پیراستہ،
قیمتی قیمتی قالین، فرش کا کیا ذکر۔ دیواروں تک پر ٹنگے ہوئے قالین پر صوفہ سٹ اعلیٰ قسم کا۔ اسکے
ایک طرف میز پر تاج محل کا ایک بڑا ماڈل جو معتمدی آگرہ سے خود لائی تھیں مع روشنی کے۔ دوسری جانب
کونہ میں رنگ برنگ کی خوبصورت مچھلیوں کا بکس۔ ادھر ادھر کتابوں کی ہلکی پھلکی خوب صورت الماریاں،
ایک سمت میں قسم قسم کے کھلونوں سے بھری ہوئی شیشہ کی الماری۔ دیوار پر حافظ۔ خیام اور خود
عزیزہ معتمدی کے اشعار کے کتبے آویزاں۔ ایک گوشہ میں ٹیلی وژن۔ پھولوں کے گملے دروازوں پر
منقش اور خوب صورت پردے۔ سردی کا موسم تھا اس لئے ہیٹر بھی موجود۔ والدہ محترمہ کی عمر

ساٹھ کے پیٹے میں ہوں گی لیکن ایران کے نسوانی حسن و شرافت اور نیکی و پاکیزگی کا اعلیٰ نمونہ، ابھی عصر کی نماز سے فارغ ہو کر مصلے پر سے اٹھ کر آئی تھیں اس لئے تسبیح ہاتھ میں اور انگلیاں مصروف سبحہ گردانی تھیں یہاں اس وقت ان کے ایک عزیز بھی موجود تھے جو قاری تھے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بعد آنحترمہ نے ان سے قرأت کی فرمائش کی اور انھوں نے سورۂ رحمٰن کی تلاوت کی۔ تین چار برس ہوئے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے اس لئے بیوگی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ میں یہاں کم و بیش ایک گھنٹہ بیٹھا ہوں گا بس برابر یہ محسوس ہوتا رہا کہ اپنی حقیقی بہن کے پاس بیٹھا ہوں جب رخصت ہونے لگا تو میری اہلیہ اور بچیوں کے لئے تحفہ تحائف کا ایک بڑا سا بنڈل میرے ساتھ کر دیا۔

یہاں سے رخصت ہو کر میں اور معتمدی ہوٹل آئے۔ مغرب کی نماز سے فراغت کے بعد میں ہوٹل کے لانج میں بیٹھا تھا کہ ایران کے مشہور فاضل اور محقق پروفیسر محمد تقی دانش پژوہ جو تہران یونیورسٹی کی لائبریری کے مخطوطات کی کیٹلاگ تیار کر رہے ہیں، آ گئے۔ وہ دراصل ڈاکٹر صلاح الدین سے ملنے آئے تھے لیکن مجھ کو بھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہو گیا۔ خاموش اور کم سخن مگر بڑے فاضل شخص ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد حسب وعدہ طاہرہ اور شمیم پہنچ گئیں۔ میں ان کو اور معتمدی کو لے کر اپنے کمرہ میں آیا اور یہ تینوں میرا رخت سفر باندھنے اور اسے پیک کرنے میں لگ گئیں۔ کتابوں اور کاغذات کا ایک انبار جمع ہو گیا تھا، اور دوسرے سامان کے ساتھ ان کا جانا دشوار تھا۔ اس لئے خالص علمی اور تحقیقی کتابیں جو میرے مذاق کی تھیں وہ رکھ لیں باقی سب کتابیں ان تینوں پر تقسیم کر دیں۔ ہاسٹل کے قواعد و ضوابط کے ماتحت طاہرہ اور شمیم مغرب کے بعد زیادہ دیر تک باہر رہ نہیں سکتی تھیں اس لئے میں نے ان کو خدا حافظ کہا اور رخصت کر دیا۔ ہم کو گیارہ بجے پرواز گاہ تہران کے لئے ہوٹل سے روانہ ہونا تھا اس لئے میں نے عزیزہ معتمدی سے بھی کہا کہ وہ گھر چلی جائیں لیکن وہ نہ مانیں۔ ان کا اصرار تھا کہ مجھ کو رخصت کر کے جائیں گی۔ اس بحث اور تکرار میں دس بج گئے۔ رات زیادہ ہو گئی تھی اس لئے مجھے تشویش ہوئی میں نے پھر اصرار کیا اور بعض دوستوں نے بھی سمجھایا۔ آخر خدا خدا کر کے معتمدی راضی ہوئیں اور مجھ سے رخصت ہو کر ٹیکسی میں گھر چلی گئیں۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ سعدی ایران کی معروف ادیبہ اور شاعرہ ہیں ۔ ان کے مقالات اور اشعار وہاں کے ادبی رسائل و مجلات میں شائع ہوتے رہتے ہیں اب آپ بھی ان کے کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے ، کہتی ہیں :

غزل

من رفتہ ام ز دست ترا بخت یار باد	شادان گلِ وجود تو بر شاخسار باد
در گلشنِ حیات مرا برگ و بار نیست	اے نخل بارورا کہ ترا برگ و بار باد
من لالہ ام کہ قسمت من داغ دادہ اند	گو لالہ را بدشتِ جگر داغدار باد
چیزم نیست تا کہ نثارم بپائے دوست	صدہا ہزار گوہر اشکم نثار باد
غمگین مشو از اینکہ چو شب روز من گذشت	روز و شبت خجستہ صبح بہار باد

گیارہ بجے ہیں اور اقبال صاحب کرنل ابوالقاسم صدری کے ہمراہ ان کی کار میں ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوئے ، جہاز دو ڈھائی گھنٹہ لیٹ تھا ، شب کے آخری حصہ میں اڑا اور ۴½ گھنٹہ کی پرواز کے بعد پالم کے ہوائی اڈہ پر پہنچا دیا ۔ آج تاریخ ۲۷ مارچ تھی اور گھڑی میں آٹھ بجے کا عمل تھا ۔ اس طرح یہ سفر ختم ہوا اور اس کی داستان بھی ۔

ایک عام تاثر | آخر میں اس قدر عرض کرنا ضروری ہے کہ اوّل تو ایران میں قیام مختصر ہی رہا اور جتنے دن رہا بھی ان میں مصروفیت رہی ۔ پھر اسی زمانہ میں نوروز کی تعطیلات کے باعث یونیورسٹیاں ، دوسرے تعلیمی ادارے ، حکومت کے دفاتر وغیرہ سب ہی بند تھے ۔ اس بنا پر ملک کے اقتصادی ، تعلیمی اور سماجی حالات کو تفصیل سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا ۔ البتہ ایک مسافر کی حیثیت سے جو کچھ دیکھا اور مختلف حضرات سے گفتگو کر کے جو معلومات حاصل ہوئیں اور وہاں کے اخبارات میں جو چیزیں نظر سے گذریں ان کی روشنی میں یہ بات بے تکلف کہی جا سکتی ہے کہ ایران کی موجودہ حکومت نے عملاً اس عام فکر و خیال کی پرزور تردید کر دی ہے کہ بس جمہوریت ہی ملک کی ترقی ، عوام کی فلاح و بہبود اور قوم کی رفاہیت و خوش حالی اور امن و امان کی کفیل اور ضامن ہے ۔ کیوں کہ حکومت کی عنان شخصِ واحد کے ہاتھ

جس ہو یا عوام کی نمائندہ ایک جماعت اور پارٹی کے ہاتھ میں۔ بہر حال دونوں ہوتے ہیں انسان ہی۔ اور جس طرح ایک شخص اچھا یا برا ہو سکتا ہے اسی طرح ایک پارٹی پر کبھی اچھے اور برے لوگوں کا غلبہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ اگر کسی حکمران پارٹی پر برے لوگوں کا غلبہ ہو جائے تو وہ ملک کے لئے ایک برے شخص واحد کی حکومت سے کہیں زیادہ تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ بہر حال موجودہ شہنشاہ ایران آریہ مہر کے عہد حکومت میں ایران نے ہر اعتبار سے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ گذشتہ دس برس میں قومی آمدنی میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ لوگوں کا معیار زندگی کتنا بلند ہو گیا ہے؟ اس کا اندازہ اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ پورے ملک کی آبادی دو کروڑ سے بھی کم ہے لیکن اس کے باوجود صرف ایک شہر تہران میں تین لاکھ کے قریب کاریں ہیں اور وہ بھی اعلیٰ اور عمدہ قسم کی۔ شہنشاہ کو سب سے زیادہ توجہ تعلیم کی طرف ہے۔ اس بنا پر ہر صوبہ میں کم از کم ایک مکمل یونیورسٹی ہے اور ہر یونیورسٹی میں ایک شعبۂ دینیات جس کو وہاں الٰہیات کہتے ہیں ایسا ہی ترقی یافتہ ہے جیسے علوم و فنون اور سائنس و ٹکنالوجی کے شعبے۔ طلباء کے لئے کثرت سے وظائف اور ان کی راحت و آسائش کے اعلیٰ انتظامات کے علاوہ اساتذہ اور تحقیق و تصنیف و تالیف کے کاموں کی حوصلہ افزائی کا یہ عالم ہے کہ وہاں پروفیسر کی تنخواہ پانچ ہزار تومان (ایک تومان ہمارے روپے سے کچھ زیادہ ہوتا ہے) سے لے کر چھ ہزار تومان تک ہوتی ہے۔ ریڈر اور لکچرر کی تنخواہوں کو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک پروفیسر کو پانچ ہزار تومان سالانہ خرید کتب کے لئے ملتے ہیں اور ایک کتاب لکھنے پر پانچ ہزار تومان الگ۔ یہی سبب ہے کہ صرف ایک تہران یونیورسٹی کی طرف سے کم و بیش ایک سو کتابیں سالانہ شائع ہونے کا اوسط ہے۔ پھر کتابیں بھی کس اہتمام سے شائع ہو رہی ہیں اور کیسی کیسی بلند پایہ اور محققانہ کہ سبحان اللہ۔ صلِّ علیٰ۔ دیکھئے اور دیکھتے رہئے اور پڑھئے تو دل اور دماغ دونوں روشن، پروفیسروں کے لئے مراعات اور ان کی نگہداشت کی حد یہ ہے کہ جب ایک پروفیسر مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوتا ہے تو اس کو جو پنشن ملتی ہے وہ اس کی اصل تنخواہ سے بھی زائد ہوتی ہے۔ یعنی چھ ہزار پانچ سو تومان ماہانہ۔ یہی وجوہ ہیں جن کے باعث ایران کا اعلیٰ س

اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قابل شخص ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح نہ امریکہ اور کنڈا کی راہ لیتا ہے اور نہ مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ کے کسی ملک میں پہنچ جانے کی تمنا کرتا ہے۔ بلکہ اپنے ملک میں رہ کر وطن اور ابنائے وطن کی خدمت کو اپنا فرض جانتا ہے۔

ڈسپلن اور قانون کی سخت گیری کا یہ عالم ہے کہ ایک مرتبہ وہاں ایک اخبار میں پڑھا کہ کسی مقام پر چار آدمیوں نے مل کر کسی ایک غیر ملکی شخص کو لوٹ لیا۔ دو مجرم پکڑے گئے۔ مقدمہ چلا اور دونوں کو سزائے موت ہوگئی۔ ایک دن اخبار میں یہ خبر نظر سے گذری کہ مختلف مقامات پر بارہ آدمی اس جرم میں گرفتار کئے گئے کہ وہ پاجامہ (جو لباس شب خوابی کا جزء ہے) پہنے ہوئے مکان سے باہر سڑک پر آگئے تھے۔ اور ان لوگوں کو جرمانہ کی سزا دی گئی۔ قانون کی اس سختی کے باعث وہاں مقدمہ کے فیصلہ میں زیادہ دن نہیں لگتے اور حکام میں رشوت ستانی مفقود ہے۔ اگر ہم غور کریں اور سوچیں سمجھیں تو اس میں بہت کچھ عبرت اور نصیحت کا سامان موجود ہے۔

(ختم شد)

حیاتِ عبدالحیؒ

مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب حسنیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنو) کی سوانح حیات، علمی کمالات، دینی خدمات اور ان کی عربی اور اردو تصنیفات پر مفصل تبصرہ مع ضمیمہ مختصر حالات مولانا مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء)

مولفہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں صاحب ندوی مدظلہ العالی۔ کتابت و طباعت اعلیٰ، کاغذ عمدہ سفید سائز متوسط ۲۰×۲۶/۸ قیمت غیر مجلد دس روپے مجلد گیارہ روپے۔

پتہ:- ندوۃ المصنفین، اردو بازار جامع مسجد دہلی

ہندو تہذیب اور مسلمان

از جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب استاذ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

شطرنج | یہ لفظ فارسی ہے۔ شطرنج ایک قسم کا مشہور کھیل ہے جو چونسٹھ خانوں کی بساط پر بتیس گوٹوں سے کھیلا جاتا ہے سنسکرت زبان میں اس کھیل کا نام چتورنگ (चतुरंग) تھا کثرت استعمال سے شطرنج ہو گیا۔ بہار عجم میں یہ لفظ ترنگ، بمعنی "صورت آدمی" استعمال کیا گیا ہے۔ چوں کہ اس کھیل کے اکثر مہروں کے نام انسانی ناموں پر ہوتے ہیں اس لئے مجازاً اس کھیل کو سترنگ بھی کہتے ہیں۔ بہار عجم میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ لفظ ہندی کا ہے جس کا تلفظ چترانگ ہے۔ چتر بمعنی چار اور انگ کے معنی عضو کے ہیں اور مجازاً "رکن" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا چترانگ، اس فوجی دستے کو کہتے ہیں جو چار ارکان میں منقسم ہو۔ چونکہ اس کھیل میں چار ارکان ہوتے ہیں سوای شاہ و فرزین کہ "فیل و اسپ و رخ و پیادہ است"۔

چتورنگ ہندوستان کی ایجاد ہے[1]۔ اور ہمیشہ سے یہاں کے باشندوں کا بہت ہی ایک عام مشغلہ رہا ہے۔ البیرونی نے لکھا ہے "وہ لوگ، چار آدمی ایک وقت میں ایک پانسے کے جوڑے سے کھیلتے ہیں[2]"، سلاطین دہلی کے زمانے میں یہ کھیل ہر طبقے کے مسلمانوں میں مروج

---

[1] آب کوثر/ ۲۰۷، میکڈینل نے اس کھیل کی ابتدا ہندوستان سے بتائی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کھیل ہندوستان سے ایران پہنچا۔ LIFE AND CONDITIONS CH P. 198. F.N. 4 نو سپہر/ ۱۶۹ بیاض میرات النوادر ص۔ ۱۰ الف

[2] کتاب الہند (ا۔ت) ۱/ ۲۴۴-۲۴۶

تھا۔[۱] عہدِ مغلیہ میں بادشاہ، امراء اور عوام الناس بلا امتیاز اس کھیل میں بڑی مسرت اور دل کشی محسوس کرتے تھے[۲] اکبر بادشاہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے فتح پور سیکری میں فرش پر شطرنج کی بساط بنوائی تھی اور گوٹوں کی جگہ پر غلام لڑکیوں کو کھڑا کرکے یہ کھیل کھیلا کرتا تھا۔[۳] بالخصوص مغلیہ امراء اس کھیل میں گہری دل چسپی لیتے تھے۔ اور منوچی جسے ان کے محلوں میں جانے کا اکثر و بیشتر موقع ملتا رہتا تھا، رقمطراز ہیں کہ اس کھیل سے وہ لوگ حسب منشا، حکومت کرنے، تعیینات اور تبادلے کرنے تفویض کرنے اور پھر واپس لے لینے، اپنے منصوبے کی تکمیل کرتے اور اپنے وقار کو برقرار رکھنے کے جذبات کی تسکین کرتے ہیں۔[۳]

اس کھیل کو بیک وقت چار آدمی کھیل سکتے تھے۔ اکبر بادشاہ کو چوپڑ اور شطرنج دونوں کھیلوں کے کھیلنے میں مہارت کلی حاصل تھی[۴] شاہانِ مغلیہ نے شطرنج بازی کے بندوبست کے لئے ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا تھا[۵] شاہ عالم ثانی اس کھیل سے بڑا شغف رکھتا تھا اور اپنے حرم کی مستورات کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتا تھا[۶]

---

[۱] اعجاز خسروی ۲/ص ۲۹۱-۲۹۴، ۴/ص ۳۰۴

[۲] منڈیلسلو (انگریزی) ص ۶۶ نیز THE VENOT AND CARERIE PP. 67-68.

[۳] منوچی (انگریزی)، ۲/ص ۴۲۰، معاصر شواہد کے لئے دیکھئے۔ منتخب التواریخ (فارسی) ۲/۲۵، ۲۱۴، ۲/ ۲۹۸، ۳۳۹

[۴] آئین اکبری (ا۔ت)، ج ۱-ح ۱، ص ۴۶۴، ۴۷۳

[۵] تاریخ محمد شاہی کے مصنف نے نادر شاہ کے حملے کے بعد اس شعبے کی زبوں حالی کا بڑا دردناک منظر پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۷۲، الف - ۱۷۲ ب

[۶] ۔ وقائع عالم شاہی "درون محل باکل و شرب پرداختند و با بانوان عفت کیش شطرنج نشاط باختند" / ۱۳۶

اٹھارہویں صدی کے کچھ مسلم صوفی شطرنج بازی کے فن میں پوری قدرت رکھتے تھے اور اس فن میں ان کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ شاہ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادی کے مرید اور خلیفہ شاہ نظام الدین اورنگ آبادی شطرنج بازی کے ماہرین میں سے تھے۔ دور دور سے شطرنج باز ان سے مقابلے کے لئے آتے تھے۔ خواجہ کامگار کا بیان ہے۔

"در منصوبہ شطرنج یقسمی مہارت بود.... اکثر شطرنج باز باما بازی میکردند و تا چہار پنج روز بازی قائم می ماند آخر مات کردم۔ چنانچہ این حروف در تمام صوبہ فتوح شہرت گرفتہ، از ہر طرف شطرنج بازاں بالاف پندار ی کہ در سر در شہ می آمدند" [۱]

مولانا فضل حق خیر آبادی کو شطرنج کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ حکیم مومن خاں مومن کے ساتھ اکثر ان کی بازیاں ہوا کرتی تھیں [۲] اس عہد کے شعراء کے کلام میں شطرنج کے موضوع پر اکثر اشعار ملتے ہیں ان کا علیحدہ باب میں ذکر کیا جائے گا۔ یہاں نظیر اکبر آبادی کی ایک رباعی پیش کی جاتی ہے جو انھوں نے شطرنج بازی کی تعریف میں کہی ہے۔

دو گل ہستند در منصوبہ بازی عجب ہر مہرہ دارد سرفرازی
بساط از طرح صد عشرت یگانہ رخ فرحت عیاں در خانہ خانہ [۳]

چوپڑ، چوسر بازی یا پچیسی	چوپڑ، چوسر یا پچیسی قدیم ایک ہندوستانی کھیل تھا جس بات پر عالموں

---

[۱] احسن الشمائل (ق) ۱۱ (الف) - ۱۲ ب

[۲] غدر کے چند علما (مفتی انتظام اللہ شہابی) - / ص ۳۳

[۳] کلیات نظیر اکبر آبادی (نول کشور ۱۹۵۱ء) ص ۹۴۶، معاصر شواہد کے لئے دیکھئے دیوان حسرت / ۱۰۰ ب، دیوان مصحفی اول تا ہشتم، ملفوظات شاہ عبد العزیز / ۳۳ دریائے لطافت (فارسی) ص ۱۴۳، کلیات انشا / ۲۱۱

میں اتفاق پایا جاتا ہے[1]۔ ابوالفضل بھی اسی بات کی تصدیق کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "اہل ہند قدیم زمانے سے اس کھیل کے دلدادہ اور شیدائی ہیں[2]"۔ آئین اکبری میں اس کھیل کی تفصیل ملتی ہے۔ چوسر میں سولہ مہرے ہوتے تھے۔ ان مہروں کی شکل یکساں ہوتی تھی۔ ہر چار مہرے ایک ہی رنگ کے ہوتے تھے تمام مہرے ایک ہی طرح کی چالیں چلتے تھے۔

چوسر پانسوں سے کھیلی جاتی تھی۔ پانسے تعداد میں تین اور شکل میں شش پہلو ہوتے تھے۔ پانسوں کے چار طولانی پہلوؤں پر ایک، دو، پانچ اور چھ نقطوں کے نشانات ہوتے تھے۔

بساط کی شکل دو مستطیل کی ہوتی تھی جو ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر قطع کرتی تھی بساط ہر چہار جانب سے برابر ہوتی تھی اور ہر ضلع میں تین قطاریں اور ہر قطار میں آٹھ خانے ہوتے تھے درمیان میں ایک چھوٹا سا مربع چھوڑ دیا جاتا تھا۔

ان چار آدمیوں میں سے ہر ایک کے پاس چار مہرے ہوتے تھے اور ہر کھلاڑی اپنے سامنے والے ضلع میں مُہروں کو بٹھاتا تھا؛ اس طرح کہ دو مہرے درمیانی قطار کے ساتویں اور آٹھویں خانے میں اور دو مہرے دست راست کی قطار کے خانے ساتویں اور آٹھویں میں رکھتے تھے۔

مہرہ اسی طرح داہنی جانب چالیں چلتا اور تمام بساط کی بیرونی قطاروں کو طے کرتا ہوا اپنے ضلع کی بائیں قطار میں آتا تھا اور اس قطار کے بھی تمام خانوں کو طے کر کے اپنے ضلع کی درمیانی قطار

---

[1] البیرونی کا بیان ہے: "دو کھیلنے والے چوسر کھیلتے ہیں اور پانسہ دونوں کے درمیان تیسرا شخص پھینکتا ہے۔ کتاب الہند (ا۔ت) ۲۴۳/۱۔ بلاقی داس نے لکھا ہے "چوپڑ کہ معروف بہ چوپر است ایجاد ہندوستانی، موجدانی راجہ بل کہ راجہ نرد (کذا) بود و تختہ نرد ایجاد از ولایت است۔ بطریق تحفہ از ولایت نزد راجہاں ہند رسیدہ" بیاض مرات النوادر/ ۱۸۰ الف

[2] آئین اکبری (ا۔ت) ج ۱، ج ۱، ص ۲۶۳

میں داخل ہوتا تھا۔ اس حالت میں مہرے کو پختہ (پکی گوٹ) کہتے تھے۔

درمیانی قطار کے کسی خانے میں پہنچنے کے بعد کھلاڑی کے لئے ضروری تھا کہ اب ایسا پانسہ پھینکے کہ پختہ مہرہ بقیہ تمام خانوں کو طے کر کے درمیانی مربع میں پہنچ جائے اور اسی حالت کو پہنچ کر وہ مہرہ رسیدہ کہلاتا تھا۔

مہرہ پختہ ہو یا رسیدہ، ہر صورت میں کھلاڑی کو اختیار تھا کہ اس مہرے سے کھیل کو دوبارہ شروع کرے۔ ایسی حالت میں عجیب خوش آیند چالیں چلی جاتی تھیں، جو دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں جب جب تک کہ ایک کھلاڑی اپنے دو مہروں کو ایک ہی خانے میں رکھتا تھا حریف اس کے مہرے کو پیٹ نہیں سکتا تھا۔

اگر کھلاڑی چھ کے دو پانسے پھینکتا تھا تو اس کے دونوں پیوستہ مہرے بارہ بارہ خانے آگے بڑھتے تھے۔ لیکن اگر کھلاڑی خود چاہے تو مہروں کو صرف چھ چھ خانے بھی آگے بڑھا سکتا تھا۔

پانچ کے دو پانسے پھینکنے میں بھی اسی قاعدے پر عمل درآمد ہوتا تھا۔ اگر تین پانسے چھ پانچ اور ایک کے پڑتے تھے تو ان کے مجموعے کو بارہ خام کہتے تھے۔ ایسی صورت میں پیوستہ دو مہرے تو جو ایک ہی خانے میں ہوتے تھے، تو چھ خانے آگے بڑھتے تھے اور تنہا ایک مہرہ بارہ گھر چلتا تھا۔

اگر تین پانسے چھ کے پڑتے تھے اور تین مہرے یکجا ایک خانے میں ہوتے تھے تو ہر مہرہ بارہ گھر آگے بڑھتا تھا۔ اگر پانسے تین یا دو تین ایک کے پڑتے تھے تو بھی یہی قاعدہ برتا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ خاص موقعوں کے لئے دیگر قواعد اور تھے۔ اگر کھلاڑی اپنے چاروں مہروں کو درمیانی مربع میں پہنچا دیتا تھا تو اپنی چال کے وقت اپنے ساتھی کے لئے پانسے پھینکتا تھا۔ قدیم زمانے میں یہ قاعدہ تھا کہ مہرہ آخر میں قطار کے آٹھویں خانے کو طے کر کے جب مربع میں پہنچ جاتا تھا۔ اس وقت مربع سے نکل کر اپنے کسی حریف پختہ گوٹ کو پیٹتا اور خام مہرے کی طرح از سر نو چالیں شروع کرتا تھا لیکن

اکبر بادشاہ نے یہ قاعدہ اضافہ فرمایا تھا کہ مہرہ آخریں قطار کے آٹھویں خانے سے بھی اسی طرح جدید کھیل شروع کرسکتا تھا۔

اگر ایک جوڑے کے پانسوں کی تعداد اور دوسری جوڑے کے پانسوں کے برابر ہو ____ تو اکبر بادشاہ اس بازی کو قائم قرار دیتے تھے۔ قدیم زمانے میں اس قسم کا قاعدہ نہ تھا اور بازی اس طرح قائم نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اگر کسی کھلاڑی کے چاروں مہرے پختہ ہوتے اور اس پر بھی وہ شرط ہار جاتا تھا تو دوسرے کھلاڑی ایسے شخص سے شرط کی دوگنی رقم وصول کرتے تھے۔

اگر کوئی کھلاڑی دوران بازی میں کسی ضرورت کی وجہ سے کھیل چھوڑتا اور اپنی بجائے کسی دوسرے شخص کو مقرر کرتا تھا تو بازی کی ہار جیت کا وہی شخص اول ذمہ دار سمجھا جاتا تھا جس نے کھیل کی ابتداء کی تھی لیکن جیت کی صورت میں قائم مقام کو دو فی صدی رقم دی جاتی تھی اور ہار میں یہ شخص ایک فی صدی رقم ادا کرتا تھا۔

اگر کسی شخص کے ہاتھ سے کوئی مہرہ گر جائے یا یہ کہ کوئی شخص دیر تک غیر حاضر یا غیر متوجہ رہے تو ان صورتوں میں ایسے اشخاص پر ایک روپیہ جرمانہ کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کھلاڑی کو چال بتاتا یا مہرے کو اصل چال سے آگے بڑھاتا یا پانسے کو دوبارہ پھینکتا تھا تو ایسے شخص سے ایک اشرفی بطور جرمانہ وصول کی جاتی تھی۔

اس کھیل سے امراء کی وابستگی کے بارے میں ابوالفضل نے لکھا ہے: "بیشتر امراء کی ایک کثیر تعداد اس کھیل میں شریک ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات دو سو سے زائد اشخاص کا مجمع ہو جاتا ہے اور ہر شخص پر لازم تھا کہ بغیر سولہ بازیوں کے پورا کئے ہوئے اپنے مکان نہ جائے، بعض مرتبہ سولہ بازیوں کے اختتام میں تین ماہ تک گذر جاتے تھے۔"

ابوالفضل کے بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کھیل کے دوران میں شراب نوشی کا شغل بھی جاری رہتا تھا۔ مصنف مذکور نے لکھا ہے "جو شخص تھک جاتا یا اس کی طبیعت اکتا جاتی تو وہ ایک جام پی کر تازہ دم ہو جاتا تھا۔"

اس کھیل کے کھیلنے کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے ابوالفضل لکھتا ہے "بظاہر تو اس لہو و لعب سے نشاط انگیزی مقصود ہے لیکن قبلۂ عالم کا مقصد حصول مسرت سے کہیں بلند و بالا ہے۔ حضرت مختلف اشخاص کے محاسن اور ان کے جوہر طبیعت کا اندازہ فرماتے اور مجمع کو خبر دینگی کی تسلیم دیتے ہیں"[1]

جہانگیر بادشاہ کے عہد میں امیر خانخانان شطرنج کا کامل کھلاڑی تھا[2]۔ سترہویں صدی میں چوسر دربار میں خاص طور پر کھیلی جانے لگی۔ اورنگ زیب کی بڑی بیٹی، زیب النساء کو اس کھیل سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ اپنا زیادہ تر وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ چوسر کھیلنے میں صرف کرتی تھی[3]۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے مسلمانوں میں یہ کھیل عام طور پر دلچسپی کا باعث تھا بادشاہ اور ان کے امراء کے علاوہ عوام اس بازی سے بڑا شغف رکھتے تھے۔ محمد شاہ بادشاہ عشاء کی نماز کے بعد روزانہ چوپڑ کھیلا کرتا تھا۔ اکثر اس کے ساتھ چار کھلاڑی ہوتے تھے اور دو دو آدمیوں کی جوڑیں ہوتی تھیں[4]۔

نواب شجاع الدولہ کو اس کھیل سے بڑی دلچسپی و انہماک تھا۔ یہاں تک کہ اس موقع پر بھی جب وہ انگریزوں سے مقابلے کے لئے بکسر کے میدان میں خیمہ زن تھا، اس نازک موقع پر بھی وہ کھیل میں منہمک ہو گیا اور جنگ کی تیاریوں کی طرف سے اتنی غفلت برتی کہ انجام کار شکست کا منھ دیکھنا پڑا[5]۔ لکھنؤ اور فیض آباد کے عوام و خواص، مرد اور عورتوں میں بھی اس شغل سے

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ آئین اکبری (ا۔ت) ج ۱، ح ۱، ص ۴۶۳-۴۶۶

[2] منوچی ۱۱/۶۰-۴۶۱-۴۷

[3] SARKAR: STUDIES IN MUGHAL INDIA P.82

[4] سعید و اقبال ۲۴ ب [5] تاریخ احمد شاہی / ۹/۴ ب

دل چسپی پائی جاتی تھی [1]

اس کھیل کی وضاحت کرتے ہوئے سودا نے ایک پہیلی کہی ہے۔

چار وسا کی سولہ رانی   تین پروکھ کے ہاتھ بکانی
مرنا جینا وا کے ہاتھ   کبھی نہ سوئی پی کے ساتھ [2]

باقی

---

[1] کلیات انشاء / ۱۹۱، ۲۰۴، ۲۱۰، ۲۱۱، OBSERV

[2] کلیات سودا ۲/ص ۲۹، نیز ملاحظہ ہو۔ دیوان ظفر ۱/ص ۶۰، ۲۸۹

تبصرے

نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر جلد ہشتم از مولانا حکیم سید عبدالحئی

تقطیع کلاں ضخامت ۵۲۹ صفحات۔ ٹائپ روشن۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ: دائرۃ المعارف، حیدر آباد دکن۔

ہندوستان صدیوں سے اسلامی تہذیب وثقافت کا گہوارہ رہا ہے۔ اس ملک کے سلاطین و امراء کی علم نوازی ومعارف پروری نے مشرقِ وسطیٰ اور ایران وترکستان کے اربابِ علم وفضل کے خاندانوں کو یہاں لا بسایا اور ان حضرات کی علمی ودینی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس خاک سے بڑے بڑے نامور علما، مشائخ اور اصحابِ کمال پیدا ہوئے جن کے فیوض وبرکات کی تابانی سے عرب وعجم کا کوئی خطہ محروم نہیں رہا...۔ تذکرہ وتاریخ کی کتابوں میں ان حضرات کے حالات اور ان کے کارناموں کا بیان جستہ جستہ اور پراگندہ طور پر ملتا ہے لیکن مولانا حکیم سید عبدالحئی (اللہ تعالیٰ ان کی قبر ٹھنڈی رکھے) پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے سالہا سال کی محنت شاقہ اور تلاش وجستجو کے بعد برصغیر ہند وپاک کے ہزاروں اکابر علم وادب واصحابِ شریعت وطریقت کا ایک جامع تذکرہ عربی زبان میں مرتب کیا۔ اس تذکرہ کی سات ضخیم جلدیں جو دائرۃ المعارف حیدر آباد کی طرف سے شائع ہو چکی تھیں۔ اور جلد ہشتم ابھی زیر قلم تھی کہ مصنف کا مرغِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا لیکن "من مات الیٰ خلف ما مات" کے بحکم مرحوم کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ انھوں نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسا فاضل اور جامع کمالات فرزند پایا تھا جس سے زیادہ موزوں تر کوئی دوسرا شخص اس اہم کام کی تکمیل کے لئے دستیاب ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ موصوف نے اس کی تکمیل کی اور اس شان سے کی کہ زبان وبیان، اسلوب تحریر اور فکر ورائے کے اعتبار سے پدر بزرگوار اور فرزند ارجمند کی تحریر میں کسی قسم کا کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا۔ ذالک

فضل اللہ یوتیہ من یشاء" مصنف کی وفات کے وقت اس جلد کا مسودہ پانچ سو انسٹھ تراجم پر مشتمل تھا جو مکمل تھے اور ان کے علاوہ تین سو پچاس تراجم ایسے تھے جن کو مصنف لکھنا چاہتے تھے۔ مگر ابھی لکھے ہی نہیں گئے تھے۔ یا لکھے تو گئے تھے لیکن تشنہ تھے کیوں کہ ان اصحاب تراجم کا انتقال مصنف کی وفات کے بعد ہوا تھا۔ اور مصنف کے عہد میں ان کے کارنامے اتنے وسیع اور عظیم نہیں تھے جتنے کہ بعد میں ہوئے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے محنت شاقہ برداشت کر کے ایسے تمام تراجم کی تکمیل کی ہے لیکن اپنی طرف سے کسی ایک ترجمہ کا اضافہ نہیں کیا ہے۔ اس کے لئے الگ ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ جس کو بعد میں اصل کتاب کا ذیل بنا کر شائع کرنے کا وعدہ مقدمہ میں کیا گیا ہے۔ تراجم میں سنین کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ مولانا علی میاں نے جن تراجم کی تکمیل کی ہے۔ حتی الوسع ان کے سنین بھی فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ سوا سو کے قریب مترجمین کے سنین ولادت و وفات کا انہیں علم نہیں ہو سکا۔ لیکن امید ہے کہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن تک اس میں بھی بہت کچھ کامیابی حاصل ہو سکے گی۔ جیسا کہ خود مولانا علی میاں نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے۔ چونکہ یہ جلد بڑی حد تک فاضل مصنف کے معاصرین کے حالات و تراجم پر مشتمل ہے۔ اور معاصرین کے متعلق کسی قسم کی کوئی رائے قائم کرنے میں ایک شخص کے اپنے ذاتی رجحانات اعمال و عواطف اور اس کے ذریعہ معلومات کو بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ اس بنا پر ظاہر ہے ہر شخص کو مصنف کی ہر رائے سے اتفاق نہیں ہو سکتا۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کتاب فی نفسہ نہایت وقیع اور ایک اہم علمی کارنامہ ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی ثقافتی اور علمی و دینی تاریخ کا کوئی طالب علم اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ فاضل مصنف اور ان کے فرزند ارجمند دونوں کو اس اجر جزیل عطا فرمائے۔

حیات عبد الحئی۔ از مولانا سید ابوالحسن ندوی۔ تقطیع کلاں۔ ضخامت ۴۵۰ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت مجلد گیارہ روپے۔ پتہ:۔ ندوۃ المصنفین، اردو بازار دہلی۔ ۶۔

مولانا حکیم سید عبدالحئی الحسینی رحمتہ اللہ علیہ جنھوں نے ہزاروں علماء فضلاء مشائخ طریقت

اور اکابر شعر و ادب کے تذکرہ میں ضخیم مجلدات سپرد قلم کردیں۔ ضروری تھا کہ خود ان کا جامع اور مفصل تذکرہ بھی مرتب کیا جاتا اور ظاہر ہے اس کام کے لئے ان کے فرزند رشید مولانا علی میاں جو اپنے ظاہری اور باطنی کمالات و اوصاف کے باعث "الولد سرٌ لابیہ" کا مصداق اتم ہیں اور دوسرا کون موزوں ہوسکتا تھا۔ چنانچہ مولانا نے یہ تذکرہ لکھا اور حق یہ ہے کہ تذکرہ نگاری کا حق ادا کردیا۔ کتاب دس ابواب پر تقسیم ہے جن میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے خاندانی حالات، ولادت، تعلیم و تربیت، علمی و عملی اور ظاہری و معنوی اوصاف و کمالات، تصنیفات و تالیفات، مولانا کے اساتذہ و مشائخ اور شرکائے کار، اخلاق، عادات و معمولات ان سب چیزوں کو نہایت دلپذیر اور اثر آفریں اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔

کتاب میں علی گڑھ کا اجمالاً اور چونکہ ندوہ سے تعلق ذمہ دارانہ اور براہ راست تھا اس لئے اس کا تذکرہ مفصلاً بھی آگیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب صرف ایک شخصی تذکرہ نہیں بلکہ اس عہد کے مسلمانوں کی دینی اور تعلیمی سرگرمیوں کی تاریخ بھی ہے۔ اس سلسلہ میں خوشی کی بات ہے کہ سرسید اور مولانا شبلی کے تذکرہ میں فاضل مولف کا قلم محتاط اور متوازن رہا ہے اور انھوں نے کسی کی حق تلفی نہیں ہونے دی ہے۔ آخر کے پچاس صفحات مولانا کے برادر بزرگ ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے حالات و سوانح حیات کے لئے وقف ہیں جو بجائے خود بڑے ولولہ انگیز اور بصیرت افروز ہیں۔ غرض کہ پوری کتاب بڑی دل چسپ، موثر اور معلومات افزا ہے۔ اس کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب کا باعث ہوگا۔ البتہ پوری کتاب میں "والد صاحب" یا "ابا جان" کہنے کے بجائے "مولانا سید عبدالحئی" لکھنا تبصرہ نگار کے ذوق پر گراں گذرتا ہے۔ کیوں کہ اس سے بیگانہ کی بو آتی ہے اور وہ بے تکلفی باقی نہیں رہتی جو تذکرہ نگار کو صاحب تذکرہ کے ساتھ نہایت ہی قریبی تعلق کی بنا پر حاصل ہے۔ یہ بے تکلفی تبصرہ نگاری اور داستان گوئی کی جان ہوتی ہے۔

فتاوی دار العلوم دیوبند جلد ہفتم مرتبہ مولانا محمد ظفیر الدین صاحب تقطیع

کلاں ۔ضخامت ۵۲۸ صفحات کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت گیارہ روپے ۔ پتہ : دارالعلوم دیوبند ضلع سہارن پور۔

دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم مولانا عزیزالرحمن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے فتاوی کی چھ جلدیں جو صلوٰۃ ۔ وزکوٰۃ اور صوم و حج کے مسائل پر مشتمل ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی طرف سے شائع ہو کر مقبول عوام و خواص ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب اس سلسلۂ طلائی کی ساتویں کڑی ہے جو نکاح کے ابواب و مسائل پر مشتمل ہے اور اس قدر جامع ، مفصل اور مبسوط ہے کہ نکاح کی حلت و حرمت فسخ و بطلان ۔ جواز و عدم جواز کا کوئی معمولی سے معمولی ایک جزیہ بھی اس کے احاطہ سے باہر نہیں رہا ہوگا آج کل معاشرہ کے فساد اور دینی مسائل سے بے خبری کے باعث مسلمان گھرانوں میں آئے دن زنا شوئی تعلقات کے سلسلہ میں چند در چند پیچیدہ مسائل پیش آتے رہتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی حرکت ناشائستہ سے نکاح ہی فسخ ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی دونوں ساتھ رہتے ہیں۔ اس بنا پر سابقہ جلدوں کی طرح یہ جلد بھی ہر مسلمان گھرانہ میں ہونی چاہئے۔ اور چونکہ فاضل مرتب نے محنت شاقہ برداشت کر کے ان فتاوی کی حاشیہ میں تخریج بھی کر دی یا توضیحی نوٹ لکھے ہیں اس بنا پر عربی مدارس کے اساتذہ اور طلبا بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ

طابع مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے الجمعیۃ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

برہان

جلد ۶۶	محرم الحرام ۱۳۹۱ھ مطابق مارچ ۱۹۷۱ء	شمارہ ۳

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

النبأ العظیم

(۱۷)

چنانچہ اسلام فقط چند رسوم اور عبادات ومعاملات کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک تہذیب، ایک سماجی نظام اور دستور معاشرت بھی ہے۔ اور جس طرح پھل اپنے ذائقہ اور درخت اپنی صورت سے پہچانا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح ایک مسلمان اپنے طور وطریق اور طرز معاشرت سے پہچان لیا جاسکتا ہے۔ لیکن تاریخ اقوام عالم کی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی قوم کی معاشرت اور اس کے سماجیات میں مکمل انفرادیت اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک اس کا خلاملا اور ارتباط دوسری قوموں کے ساتھ نہیں ہوتا۔ جب ارتباط اور دوسری قوموں کے ساتھ میل جول بڑھتا ہے تو اب باہمی جذب وانجذاب اور تاثیر وتاثر کا عمل شروع ہوتا ہے۔ ایک قوم کی تہذیبی زندگی میں — اور اگر اس کی تہذیب اور مذہب میں گہرا ربط ہو تو اس کی مذہبی زندگی میں بھی — یہ مرحلہ بہت نازک اور بعض اوقات خطرناک اور مہلک ہوتا ہے کیوں کہ مختلف قسم کے داخلی اور خارجی عوامل ومؤثرات ہوتے ہیں جو اس قوم کی تہذیبی انفرادیت اور تمدنی خصوصیات وامتیازات کے لئے ایک چیلنج کا حکم رکھتے ہیں۔ قومی زندگی کے اس موڑ پر وہ قوم بڑی خوش نصیب ہوتی ہے جو دوسروں کا اثر کم سے کم قبول کرتی اور اپنے سے متاثر زیادہ سے زیادہ کرتی ہے۔ جو قوم اس کا حوصلہ رکھتی اور ایسا کرسکتی ہے وہی اس عہد کی ترقی یافتہ اور اعلیٰ قوم ہوتی ہے۔

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ اسے دنیا میں پھیلنا اور مختلف تہذیب وتمدن رکھنے والی

قوموں کو اپنے زیر سایہ لینا تھا۔ یا کم از کم مسلمانوں کی سوسائٹی محدود۔ بند (CLOSED) اور علیحدگی پسند (ISOLATED) نہیں ہو سکتی تھی۔ انہیں لامحالہ دوسری قوموں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنا تھا۔ اس بنا پر اس قسم کے مواقع کے لئے اس کی تعلیمات بالکل صاف اور واضح ہیں۔

ایک طرف حکمت کو مومن کی متاع گمشدہ قرار دے کر وہ جہاں کہیں بھی اسے حاصل کرنے کی اور اسی طرح علم خواہ کتنے ہی دور و دراز مقام پر ہو اس کی تحصیل کی ترغیب دی گئی ہے اور دوسری جانب اس کا عمل "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر رہا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو اجنبی زبانیں سیکھنے کا حکم دیا اور خود بعض چیزیں اہل ایران کی اختیار فرمائیں۔ حضرت عمر کے زمانے میں جب فتوحات کی وسعت ہوئی تو غیر قوموں کے ساتھ مسلمانوں کے اختلاط و ارتباط کا دائرہ اور وسیع ہوا اور غیر ملکی اثرات کا رنگ اور زیادہ گہرا ہونے لگا اسی کا تاثر تھا جس کی وجہ سے ایک مرتبہ خلیفہ دوم نے فرمایا تھا "اے کاش ہمارے اور ایران کے درمیان آگ کی ایک دیوار حائل ہوتی"۔ بنی امیہ کے عہد میں عدالت کا دفتری نظم و نسق اور فوجوں کی تقسیم اور ان کی تنظیم کے قواعد و ضوابط زیادہ تر بازنطینی ایرانی اور ایک حد تک یونانی اثرات کا نتیجہ تھے۔ لیکن چونکہ بنو امیہ کے عہد تک عربی عصبیت قائم رہی اس بنا پر تہذیب و تمدن کا عام خاکہ عجمی اثرات سے پاک تھا اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ بڑی حد تک اس عہد میں "خذ ما صفا" پر عمل ہوتا رہا۔

لیکن بنو عباس کی حکومت کے قائم ہوتے ہی یہ بند ٹوٹ پڑا۔ اور عجمی اثرات کے سیلاب نے اسلامی تہذیب کی دیوار میں افراط و تفریط کے رخنے پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ یہ اثرات ملے جلے تھے اور ان کا ہیولیٰ مختلف قوموں کی تہذیبی اور تمدنی خصوصیات کے باہم امتزاج سے تیار ہوا تھا، لیکن ان میں سب سے زیادہ گہرا رنگ ایران کا تھا۔ حد یہ ہے کہ حرم شاہی میں، وزراء، امراء اور اعیانِ حکومت کے محلات میں نوروز اور ایرانیوں کے دوسرے، تیر تہوار بالکل ایرانی رسم و رواج کے مطابق باقاعدگی کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ ان چیزوں نے اسلامی تہذیب کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟ اس کی تصویر اس زمانہ کے ادبی سرمایہ۔ شعر و شاعری اور تاریخ کی کتابوں

کے آئینہ میں صاف نظر آتی ہے۔ راقم الحروف کی پرانی کتاب "مسلمانوں کا عروج و زوال" میں بھی
اس کا ایک عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایرانیوں کا ایک عام مقولہ مشہور ہے کہ عربوں
نے ہمارے ملک اور جسم کو فتح کیا تو کیا ہوا ؟ ہم نے ان کا دل و دماغ اور ان کی روح کو جیت لیا۔ یہ
بات اس زمانہ کی ہے جب کہ مسلمانوں کی سیاسی سطوت اور شوکت وصولت کا ڈنکا چہار دانگ
عالم میں بجتا تھا۔ اور جب دنیا کی کوئی طاقت مشکل سے ان کی حریف ہو سکتی تھی۔ اب خود اپنے ملک
کو دیکھئے، یہاں آٹھ سو برس کے لگ بھگ مسلمانوں نے حکومت و سلطنت کا پرچم لہرایا اور اس
سلسلے میں بے شبہ انھوں نے عدل و انصاف۔ معاشرتی اصلاح و تعمیر اور علم و فن میں ترقی اور اسکی
حوصلہ افزائی کی ایسی شاندار روایات قائم کی ہیں جو کسی قوم کے لئے سرمایۂ افتخار و نازش ہو سکتی
ہیں لیکن ساتھ ہی اس المناک حقیقت کا اعتراف ناگزیر ہے کہ اس ملک کی پرانی تہذیب اور اس کے
مذہبی افکار و خیالات اور تہذیبی عوائد و رسوم نے مسلمان فاتحین کو اس درجہ متاثر کیا کہ مغلیہ سلطنت
کا گل سر سبد اکبر اعظم "زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا تیرا!" کا مصداق بن گیا۔ اکبر کا عمل
صرف ایک انفرادی عمل اور شخص واحد کی اپج نہیں ہے بلکہ اس عہد کے مسلمانوں کی ایک تہذیبی علامت
ہے۔ دو ڈھائی برس سے زیادہ سے برہان میں ایک نہایت محققانہ اور معلومات افزا مضمون۔
"ہندو تہذیب اور مسلمان" کے عنوان سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کتنے لوگ
اس کو دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں۔ بہر حال یہ مقالہ مسلمانوں کے لئے ایک مرقع عبرت ہے اس سے
اندازہ ہوگا کہ بحیثیت مجموعی مسلمانوں نے ہندو تہذیب کے جو اثرات قبول کئے ہیں وہ کس درجہ
وسیع۔ عمیق اور دور رس ہیں اور انھوں نے ان کے حجازی چہرہ کو کس درجہ مسخ اور متغیر و
مستبدل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کی قبروں کو ٹھنڈا رکھے جنھوں نے اس صورت حال کے
خلاف جہاد عظیم کیا اور سوسائٹی کی اصلاح کی۔ لیکن آج بھی شہروں میں نسبتاً کم اور دیہاتوں اور
قصبات میں زیادہ ایسے مسلمان آباد ہیں جو اب تک ہندو تہذیب۔ کے ان ہمہ گیر اثرات سے اپنے
آپ کو آزاد نہیں کرا سکے۔ حالانکہ زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب

کے عام ہو جانے کے باعث اب خود ہندوؤں میں ایک بڑا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو قدیم ہندو تہذیب کے شادی و بیاہ اور مرنے جینے کی ناپسندیدہ رسومات کے خلاف سخت احتجاج کر رہا ہے۔

یقین کیجئے۔ میں نے بارہا بڑے دکھ اور افسوس کے ساتھ اس پر غور کیا ہے کہ مغربی ممالک میں انگریز۔ اور فرانسیسی یہ دو قومیں ہیں جو کلچر کے اعتبار سے دنیا کی سب سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ قومیں سمجھی جاتی ہیں۔ کم و بیش دو سو برس سے ان قوموں نے ایشیا اور افریقہ کی.... مختلف المذاہب اقوام و امم کو اپنے کلچر سے متاثر کرنا شروع کیا ہے اور آج عالم یہ ہے کہ ان کی تہذیب اور ان کے کلچر نے دنیا کے سب انسانوں کے دل و دماغ پر اپنا تسلط جما رکھا ہے اور یہ تسلط اور اس کلچر کی گرفت اس درجہ شدید ہے کہ شاعر مشرق اقبال کی طرح جو لوگ

فریاد ز افرنگ و دلاویزی افرنگ فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ

کا نوحہ پڑھتے ہیں اور وہ بھی کسی نہ کسی درجہ میں اس تہذیب کا صید زبوں نظر آتے ہیں لیکن خود انگریز۔ اور فرانسیسی قوم کو دیکھئے تو دو سو برس سے مشرقی اقوام کے ساتھ اختلاط و ارتباط رکھنے کے باوجود انھوں نے کسی مشرقی قوم کی تہذیب کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ گویا اس قسم کے مواقع کے لئے باہمی جذب و انجذاب کا جو فطری قانون ہے ان قوموں نے اس کو بھی اپنے اوپر اثر انداز نہیں ہونے دیا ہے۔ ایک طرف بتکدۂ یورپ کے برہمن افرنگ کی یہ پختہ زناری دیکھیے اور دوسری جانب میکدہ توحید کے جام برداروں کی یہ سہل انگاری ملاحظہ فرمایئے کہ ابھی پوری ایک صدی بھی نہ گذری تھی کہ ان کی اصل تہذیب اور ثقافت کے روئے روشن و جبین شفاف پر دریوزہ گری اغیار کی گرد جمنے لگی۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا، میں نے اس سوال پر بہت غور کیا ہے اور آخر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کے اسباب متعدد ہیں مثلاً اسلامی فتوحات کی کثرت و وسعت اور فتوحات کے باعث دولت و ثروت کی افراط وغیرہ لیکن ان سب سے زیادہ اہم اور موثر چیز اسلامی مملکت میں مختلف ملکوں کی باندیوں اور غلاموں... کی ریل پیل ہے انھوں نے

عربوں کی اندرونِ خانہ زندگی میں دخیل ہو کر اور اپنے بعض ظاہری اور باطنی اوصاف و کمالات سے ان کے دل و دماغ کو مسحور کر کے ان کو بہت جلد اپنی قومی اور ملکی تہذیب کے شیشہ میں اتار لیا۔ اس کے برخلاف انگریزوں اور فرانسیسیوں کا اختلاط و ارتباط مشرقی اقوام کے ساتھ اگرچہ بہت کچھ رہا ہے لیکن انھوں نے ایک چیز کی پابندی اور اس کا التزام کیا ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے اس کی اجازت دی ہے کہ مشرق کے مردان کی عورتوں سے شادی کریں لیکن وہ اس کے روادار نہیں ہوئے کہ ان کے مرد مشرقی خواتین کے ساتھ زناشوئی کے تعلقات پیدا کریں۔ ہمارے یہاں ایک مسلمان کے لئے کتابیہ عورت سے نکاح کرنا جائز ہے لیکن ایک مسلمان لڑکی کتابی مرد سے نکاح نہیں کرسکتی۔ اس کے برخلاف شریعت یہود میں ایک یہودی لڑکی غیر مذہب کے مرد سے نکاح کرسکتی ہے لیکن مرد بیرونی عورت سے زناشوئی تعلق قائم نہیں کرسکتا۔ علمائے یہود.. اس حکم کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکی کسی غیر مذہب کے گھر میں پہنچ جائے گی تو اولاد پر تو اس کا خاص اثر ہوگا ہی گھر کے دوسرے افراد بھی اس کے زیر اثر ہوں گے۔ کیوں کہ ایک گھر کے افراد پر عورت کا جو اثر ہوتا ہے۔ مرد کا نہیں ہوتا۔ اسلام میں اہل کتاب خواتین سے نکاح کرنا بے شبہ جائز اور روا ہے لیکن اگر کسی مباح کا استعمال سوچے سمجھے بغیر، محض حظ نفس کی خاطر اور کثرت سے کیا جائے تو جلد یا بدیر اس کا انجام اچھا نہیں ہوتا اور بعض اوقات اس کے نتائج بڑے خطرناک اور دوررس ہوتے ہیں۔ یہی وہ موقع ہوتا ہے جب کہ ایک قوم کا فرمان روا یا اس کا رہنما اس طرح کے معاملات میں دخل دینا اور قوم کے لئے ایک راہ عمل متعین کرتا ہے۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ سے بڑھ کر شریعت کا نباض اور اسلام کے مزاج اور طبیعت کا راز داں اور کون ہوگا؟ انہیں وجوہ کے پیش نظر آپ نے کتابیہ عورتوں سے نکاح کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ کوتاہ نظر سمجھتے ہیں کہ آپ کا یہ عمل اور اسی طرح کے بعض دوسرے احکام قرآن کے حکم کے خلاف اور شریعت میں مداخلت ہیں۔ حالانکہ بات صرف اس قدر ہے کہ قرآن میں جن مباحات کا ذکر ہے حضرت عمر جانتے تھے کہ ان کا موقع محل کیا ہے؟ ان کو مباح کیوں رکھا گیا ہے؟ اور ان کا استعمال کب مفید یا ضروری

ز..... اور کب نامناسب یا نقصان رساں ہوتا ہے!

پس یہی معاملہ استرقاق کے ساتھ پیش آیا۔ جیسا کہ راقم الحروف نے اپنی کتاب الرق فی الاسلام میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ استرقاق اسلام میں بے شبہ مباح تھا لیکن مسلمانوں کو اور خصوصاً سلاطین و خلفا اور علمار کو سمجھنا چاہئے تھا کہ اس جواز کا کم اور شریعت کی اصل اسپرٹ کیا ہے اس بے توجہی اور مصلحت ناشناسی کا انجام کس درجہ ہولناک اور تباہ کن ہوا ہے؛ اس کا تصور کر کے بھی جگر خون اور کلیجہ پاش پاش ہوتا ہے۔ عورت اور شراب دونوں لازم و ملزوم ہیں چنانچہ حکومت کے ایوانوں پر موالی کا اقتدار بڑھا اور معاشرہ میں عورت کو نفوذ و اثر حاصل ہوا تو بنت العنب بھی اس کے جلو میں آئی۔ عہد بنی عباس کا لٹریچر اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ نثر کا سرمایہ جو ادب کی فضول کہانیوں سے اور شعرا کے دواوین خمریات اور اس کے متعلقات کے ذکر و اذکار سے پر ہیں آ ھا شعر آ ھا شعر آ ھا۔

اب تک یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ ایک تہذیب کا واسطہ اور معاملہ جب کسی ایک دوسری تہذیب سے پڑتا اور پیش آتا ہے تو اس وقت کی اک ذرا سی غفلت بعض اوقات عظیم خسارہ اور نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ چنانچہ پہلی صدی ہجری کے اواخر میں ہی اسلام کو تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے جو عظیم حادثہ پیش آیا اور جس کی تلافی آج تک نہیں ہو سکی ہے وہ اسی غفلت اور سہل انگاری کا نتیجہ تھا۔ اب آیئے اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ سماجی حالات و معاملات کا جائزہ لیں اور ان پر گفتگو کریں۔

یوں تو دوسری قوموں کی طرح دنیا کے سب ہی مسلمان اس وقت مغربی تہذیب کے زیر اثر ہیں لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب اور ہندو تہذیب دونوں کی زد پر ہیں۔ سماجی اعتبار سے مسلمانوں کی طبقاتی تقسیم اس طرح کی جا سکتی ہے:

(۱) وہ طبقہ جو صرف مغربی تہذیب سے متاثر ہے۔

(۲) وہ طبقہ جو صرف ہندو تہذیب سے متاثر ہے۔

(۳) وہ طبقہ جو مغربی تہذیب سے زیادہ اور ہندو تہذیب سے کم متاثر ہے۔

(۴) وہ طبقہ جو ہندو تہذیب سے زیادہ اور مغربی تہذیب سے کم متاثر ہے۔

مذکورہ بالا طبقات کے علاوہ ایک طبقہ ان مسلمانوں کا بھی ہے (اور خدا خوش رکھے تبلیغی جماعت کہ اس نے دیندار مسلمانوں کو بھی ایک طبقہ بنا دیا) جو دیندار کہلاتا ہے اور جس پر بظاہر نہ مغربی تہذیب کی کوئی علامت ہے اور نہ ہندو تہذیب کا کوئی نشان۔ یہ طبقہ بظاہر محفوظ نظر آتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ سماجی اعتبار سے یہ طبقہ جہالت، تنگ نظری اور خود فریبی کا شکار ہے۔ اس کے ذہن میں مذہب یا دین کا جو تصور ہے وہ صرف چند عبادات و رسوم تک محدود ہے۔ مباحات کے استعمال میں یہ بے باک بھی ہے اور جری بھی۔ ان میں جو لوگ قلیل المعاش ہیں وہ اپنی کھال میں اور جو مالدار ہیں اپنے مال میں مست ہیں۔ اسلام میں مہر کی انتہائی رقم متعین نہیں ہے تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لخت جگر حضرت فاطمہ کا مہر مقرر کر کے جو اسوہ پیش فرمایا تھا اس سے آنکھ بند کر کے یہ لوگ اپنی اور شوہر کی حیثیت سے بہت زیادہ ہزاروں لاکھوں روپیہ مہر اپنی بیٹیوں کے لئے بندھواتے ہیں۔ ملک میں مسلمانوں کی حالت خواہ کچھ ہو یہ اپنے بیٹے یا بیٹی کی جب کوئی تقریب کریں گے تو ان کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ کر دینا ضروری ہے ورنہ امارت اور دولت کا مظاہرہ کس طرح ہوگا!

برہان جنوری سنہ ۸۱ء کے سلسلہ میں معذرت

جنوری سنہ ۸۱ء کا برہان غلطی سے ڈی نمبر کینسل ہو جانے کے باعث وقت پر ارسال نہ ہو سکا۔ ۹ مارچ سنہ ۸۱ء کو نیوز پیپر کے رجسٹریشن نمبر سے ڈبل محصول پر ارسال کر دیا گیا ہے امید ہے مل گیا ہوگا ـــــ میں آخر نومبر سے مسلسل علیل تھا اور یہ سلسلہ آخر فروری تک جاری رہا اس لئے دوڑ دھوپ بھی نہ کر سکا اس کوتاہی کے لئے معذرت خواہ ہوں

محمد ظفر احمد

مولانا ابوالکلام آزاد اور تحریک نظم جماعت
(۲)

جناب ابوسلمان صاحب شاہجہانپوری

مولانا آزادؒ نے ملیح آبادی کو جو شاندار خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ کوئی معمولی اعزاز نہیں۔ مولاناؒ نے اپنے معاصر علمائے دین اور اکابر سیاست میں اتنے شاندار الفاظ میں کسی کی سیرت و خدمات کا اعتراف نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے اور اپنے معاصر کے معاملے کو ہمیشہ تاریخ کے حوالے کیا لیکن ملیح آبادی سے ان کی دلی محبت اور تعلق نے یہ گوارہ نہ کیا کہ ان کا مقدمہ تاریخ کے فیصلے کے لئے چھوڑ دیں بلکہ ان کی بہترین سیرت، بلند کردار اور عظیم الشان خدمات کے متعلق اپنی شہادت قلم بند کر گئے، تاکہ تاریخ کی عدالت میں جب ان کا مقدمہ پیش ہو تو مورخ کو صحیح فیصلہ تک پہنچنے میں دشواری نہ ہو۔

ملیح آبادی کی گرفتاری کے بعد مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی نے چند پرچے پیغام کے نکالے لیکن جب مولانا آزاد بھی گرفتار ہو گئے تو اس کا جاری رکھنا مشکل ہو گیا اور پیغام بند ہو گیا۔ ملیح آبادی کو اس مقدمہ میں دو سال کی قید کی سزا سنائی گئی۔ البتہ رہائی ایک سال کے بعد ہی مل گئی۔ رہائی کے بعد "الجامعہ" کے نام سے عربی کا ایک پرچہ نکالا جو مولانا آزادؒ کی نگرانی میں اپریل ۱۹۲۳ء سے جون ۱۹۲۴ء تک جاری رہا۔ جولائی ۱۹۲۷ء میں الہلال کا دور ثانی شروع ہوتا ہے۔ اس کی تمام ذمہ داری ملیح آبادی پر تھی۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں الہلال بند ہوا۔ اس کے ساتھ ہی مولانا کی رفاقت کا آٹھ سالہ دور بھی ختم ہو گیا۔ ابھی تک وہ مولانا کے ساتھ رہتے تھے اب انھوں نے علیحدہ رہائش کا انتظام کر کے مصر و قسطنطنیہ کے بعض اخبارات کی نامہ نگاری اور تالیف و ترجمہ کا شغل اختیار کیا۔ پھر کلکتہ ہی سے

اپنا اخبار نکالا اور خوب چلایا۔

ملک کی آزادی کے بعد مولانا آزادؒ ہندوستان کے وزیر تعلیم بنے تو انھوں نے ملیح آبادی کو بھی (۱۹۴۹ء کے اواخر میں) دہلی بلالیا۔ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کا عربی سہ ماہی رسالہ ثقافۃ الہند ان کی ادارت میں جاری ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے عربی شعبے کے مشیر اور پھر مدیر مقرر ہوئے۔

ملیح آبادی کو مولانا سے بڑی محبت تھی۔ مولانا کے انتقال کے بعد ان کا دل بھی دنیا سے اچاٹ ہوگیا صحت ۱۹۵۴ء سے خراب تھی کینسر کی ابتدا ہوچکی تھی۔ کئی مرتبہ مرض ابھر چکا تھا اور علاج سے عارضی افاقہ ہوگیا تھا مولانا کی وفات کے بعد مرض عود کر آیا صحت روز بروز گرتی چلی گئی۔ بالآخر ۲۴ جون ۱۹۵۹ء کو وہ بھی جوار رحمت میں چلے گئے۔

مولوی شجاعت علی

مولوی شجاعت علی علوی بک ڈپو (نظیر آباد لکھنؤ) کے مالک اور ظفر الملک مولوی اسحاق ایڈیٹر الناظر (لکھنؤ) کے بڑے بھائی تھے۔ بڑے جری اور بڑے حق گو تھے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے ہاتھ پر انھوں نے بیعت کی تھی۔ بیعت سے پہلے کا ملیح آبادی نے ان کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ قیصر باغ کی بارہ دری میں مولانا آزاد تقریر کر رہے تھے۔ اچانک مولانا ایک بات پر اٹک گئے اور ایک ہی بات کو بار بار دہرانے لگے۔ سامعین میں سے مولوی شجاعت علی نے چلا کر کہا تھا: ایک ہی بات کب تک رٹی جائے گی؟ اٹک گئے ہو تو آگے بڑھاؤ۔ بعد میں یہ مولانا کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ گویا عقیدت نہیں عشق ہوگیا تھا۔ اس واقعہ کا مولانا آزاد کی زبانی بھی سن لیجیے۔ مولانا ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ مولانا (آزاد) سے اس (مذکورہ بالا) واقعہ کا تذکرہ ہوا، تو ہنس کر کہنے لگے انہی حضرت نے اسی قیصر باغ کی بارہ دری میں ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کو بھی تقریر میں ٹوکا تھا۔ ڈپٹی صاحب بہت بڑے مقرر ہی نہ تھے بہت بڑے پھکڑ بھی تھے اپنی تقریر میں لکھنؤ والوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔ شجاعت علی بگڑ گئے اور چلا اٹھے۔ باہر نکلو گے تو مزہ چکھا دوں گا!" اس وقت شجاعت علی نوجوان تھے اور مرحوم ڈپٹی صاحب

رنگین مزاج، "میاں صاحبزادے" کہہ کر فرمانا شروع کیا "آخاہ آپ ہیں بڑے چکنے چکنے گال ہیں! خاص لکھنؤ کا تحفہ ہے۔ بھلا اکھڑ دلی میں ایسا چوزہ کہاں نصیب! میاں ذرا قریب تو آؤ، ایک ہی چٹخارا ....." آخر شفاعت علی صاحب ساری شیخی بھول گئے۔ مولانا ملیح آبادی نے "ذکر آزاد" میں (ص ۲۴-۲۸) ان کا دلچسپ تذکرہ کیا ہے، اعادے کی ضرورت نہیں۔ مدت ہوئی ان کا انتقال ہو گیا۔

سردار محمد خاں

بیعت کرنے والوں میں ایک صاحب ملیح آباد کے رہنے والے اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے رشتہ دار سردار محمد خاں بھی تھے۔

مولانا آزاد کو یہ صاحب بہت پسند تھے۔ بڑے کلے ٹھلے کے آدمی تھے۔ اولوالعزم اور جری تھے اور طاقت ور بھی۔ پنجہ کش تو ایسے کہ ہندوستان بھر میں ان کی ٹکر کا پنجہ کش کوئی نہ تھا۔ مدتوں اخباروں میں پانچ سو روپے کے انعام کے ساتھ چیلنج نکلتا رہا مگر کبھی کوئی آدمی ان سے جیت نہ پا سکا۔ مولانا آزادؒ سے انہیں بڑی عقیدت تھی مولاناؒ بھی انہیں بہت پسند کرتے تھے۔ جب ملیح آبادی نے ان کے انتقال کی خبر سنائی تو مولاناؒ نے بہت افسوس کیا اور کہا "بہادر اور اولوالعزم آدمی تھا"۔

منے خاں

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے ہاتھ پر جن اصحاب نے بیعت کی ان میں تیسرے صاحب جن کا نام معلوم ہو سکا ہے منے خاں تھے۔ ان کا تذکرہ مولانا ریاست علی ندوی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> "مولوی گنج اور گولا گنج کے کچھ جوشیلے مسلمانوں نے بھی بیعت کی جن میں منے خان صاحب بھی تھے۔ منے خاں صاحب جو آگے چل کر خاکسار یا احرار تحریک کے لکھنؤ میں لیڈر بھی تھے۔ مولانا ملیح آبادی کے گہرے معتقدین میں سے تھے اور ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔"

اس کے سوا اور کہیں ان کے حالات نظر سے نہیں گزرے۔

مولانا سجاد بہاری

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہار کے مشہور عالم دین اور تحریک خلافت کے رہنماؤں میں سے تھے۔ مولانا آزاد سے انہیں بڑی عقیدت تھی۔ مولانا نے انہیں اپنے محبین و مخلصین میں شمار کیا ہے، اور ان کے اخلاق و محبت کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا آزادؒ سے تعلقات تو پہلے سے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں انہیں صوبہ بہار میں نظم جماعت کے قیام اور طبقہ علما میں مسئلے کی ضرورت و اہمیت کا احساس پیدا کرنے کے لئے مجاز و مختار بنایا تھا۔ مولانا سجاد مرحوم تحریک نظم جماعت کے اہم کارکنوں میں سے اور ان خوش نصیبوں میں سے تھے جن کی مساعی سے کم از کم ایک صوبے میں نظم جماعت اور امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آگیا۔

مولانا سجاد مرحوم نے ایک مدت تک گیا کے مدرسہ انوارالاسلام میں مدرس اول کی حیثیت سے درس و تدریس اور نظم و انتظام مدرسہ کی بہترین خدمات انجام دیں۔ قومی و ملی کاموں میں بڑی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ ان کی زندگی میں شاید ہی ایسا کوئی سال آیا ہو جب وہ جمعیۃ علماء صوبہ بہار کے ناظم نہ رہے ہوں۔ صوبہ بہار میں نظم جماعت کے قیام کے بعد وہ مدت العمر نائب امیر شریعت مقرر ہوتے رہے۔

مولانا سجاد مرحوم بڑی سوجھ بوجھ کے شخص تھے۔ وہ کسی ایک دائرے میں محدود رہ کر کام کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مختلف الخیال لوگوں کو متحد کرنے کا ان میں خاص ملکہ تھا۔ مرحوم ساری زندگی مذہب و سیاست کے مختلف میدانوں میں سرگرم کار اور بلاتفریق مذہب و ملت لوگوں کی خدمت میں مصروف رہے اور انہیں صلاحیتوں اور خوبیوں نے انہیں ہر طبقۂ خیال کے لوگوں کا ممدوح بنا دیا تھا۔

مولانا سجاد مرحوم نے جب مولانا آزادؒ کے ماذون و ماموں کی حیثیت سے نظم جماعت کا کام شروع کیا تو علما کے حلقے میں کام کا نتیجہ تو صوبہ بہار میں نظم جماعت اور امارت شرعیہ کے قیام کی صورت میں نکلا اور دنیا نے ان کے مساعی کے ثمرات دیکھ لئے لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ انھوں نے ۱۹۱۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی کے موقع پر اس کے پلیٹ فارم

سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے مسئلہ شیخ الاسلامی کی نسبت مندرجہ ذیل دو تجاویز پیش کرائے اور انہیں منظور کرانے کی کوشش کی تھی:

(۱) آل انڈیا مسلم لیگ تمام اسلامی احکام و اعمال کے انصرام کے لئے تقرر شیخ الاسلام فی الہند کو نہایت ضروری خیال کرتی ہے اور اس پر یقین کامل رکھتی ہے کہ بغیر مشیخت اسلامیہ (سیاسی و ملی) حقوق اور مذہبی احکام کی حفاظت غیر ممکن ہے۔

(۲) آل انڈیا مسلم لیگ گورنمنٹ سے پرزور لفظوں میں یہ درخواست کرتی ہے کہ مسلمانوں کی بے مثال وفاداری و اطاعت شعاری پر کامل اعتماد رکھتے ہوئے مسلمانان ہند کے مذہبی احکام کی حفاظت کے لئے بااختیار مشیختِ اسلامیہ فی الہند عطا فرمائے۔

اگرچہ مولانا سجاد مرحوم اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے۔ مسلم لیگ اپنے پلیٹ فارم سے اس تجویز کو منظور کرکے اپنی قیادت کو خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی تھی لیکن مرحوم کے پُر اخلاص مساعی اور قیام شریعت اسلامیہ کے لئے ان کی بے چینیوں کا ایک انمٹ نقش تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو گیا جو ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہے گا۔

مولانا سجاد مرحوم اخلاص و بے نفسی کا مجسمہ تھے۔ ان کی کسر نفسی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ۱۹۲۲ء میں جمعیۃ علمائے بنگال کی سالانہ کانفرنس کی صدارت کے لئے کارپردازان جمعیۃ اور منتظمین جلسہ کے بے حد اصرار پر چاٹگام تشریف لے گئے لیکن جمعیۃ کے ایک کارکن نے غلطی سے مولانا فاخر الہ آبادی کو بھی جلسے کی صدارت کی دعوت دے دی تھی اس لئے وہ بھی پہنچ گئے ہر چند کہ منتظمین جلسہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن مولانا سجاد مرحوم اپنے استحقاق و حق سے دستبردار ہو گئے اور مولانا فاخر کو جلسہ کا صدر بنا دیا۔

ہندوستان کے سیاست داں علماء میں مولانا سجاد بہاری ہی کامیاب اور حقیقت پسند

عالم تھے۔ سیاسی سوجھ بوجھ میں بے مثال تھے اور تنظیمی و عملی صلاحیتوں میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، سول نافرمانی اور بہت سی قومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا مگر کبھی گرفتار نہیں ہوئے۔ صوبہ بہار میں مسلم مفاد کے لئے ہمیشہ سینہ سپر رہے۔ دینی مسلک کے لحاظ سے علمائے دیوبند کے پیرو اور سیاست میں جمعیۃ علمائے ہند کے مسلک کے پابند تھے۔

مولانا محی الدین قصوری (لاہور)

مولانا محی الدین قصور کے ایک اہل حدیث خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد مولانا عبدالقادر قصوری برصغیر ہند و پاک کے مشہور دینی و سیاسی رہنما تھے۔ مولانائے موصوف نے بھی گراں قدر دینی، سیاسی، تعلیمی اور اصلاحی خدمات انجام دی ہیں اور تحریک استخلاصِ وطن کے سلسلہ میں متعدد بار نظر بندی، گرفتاری اور قید و بند کے مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔

مولانا آزاد سے انہیں بڑی عقیدت ہے۔ مولانا کو بھی ان سے بڑا تعلق خاطر ہے۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں جب مولاناؒ رانچی میں نظر بند تھے ان کی گرفتاری کی خبر سنی تو بے قرار ہو گئے لکھتے ہیں:-

"ان تمام ایام جلاوطنی میں یہ پہلا دن ہے کہ اس واقعے کے سننے سے دل کو مضطر اور دماغ کو پراگندہ پاتا ہوں ..... عزیز موصوف بلکہ ان کا پورا خاندان اپنے خصائص ایمانی و جوش اسلامی وایثار للہیہ و فی اللہ کے اعتبار سے عہد سلف کے واقعات زندہ کرنے والا ہے۔ اور علی الخصوص اس عزیز کے طلب صادق و استعداد کامل سے تو اپنی چند در چند امیدیں وابستہ تھیں۔"

(تذکرہ)

۱۹۴۱ء میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں:-

"یہ (مولانا محی الدین قصوری) اور ان کا پورا خاندان بیس برس سے

نیشنل سروس میں ہر طرح کی قربانیاں کرتا رہا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں ....
جن چند خاص خاص آدمیوں نے میری پکار پر لبیک کہا تھا ان میں یہ اور ان کا خاندان بھی ہے۔ یہی وجہ کہ مجھے اس درجہ ان کا خیال ہے۔" (افادات آزاد، مرتبہ ابوسلمان شاہ جہانپوری)

"تبرکات آزاد" (مرتبہ مولانا غلام رسول مہر) میں مولانائے موصوف کے نام مولانا کے خطوط مولاناؒ کے تعلق خاطر کا بہت بڑا ثبوت ہیں۔ ایک مدت تک کلکتہ میں مولاناؒ کے بہت قریب رہے۔ ۸؍دسمبر سے ۱۰؍فروری ۱۹۱۶ء تک کلکتہ سے ایک روزنامہ اقدام کے نام سے مولاناؒ کے زیر ہدایت نکالا۔ جو کبھی روزانہ اور کبھی دوسرے تیسرے روز نکلتا تھا۔ اس کے کل تریپن پرچے نکلے جو مولانا غلام رسول مہر کی عنایت سے راقم السطور کی نظر سے گذرے ہیں۔ پھر ۱۹۲۰ء کے بعد دہلی میں مولانا کی شراکت میں پریس لگایا لیکن یہ کام منفعت بخش ثابت نہیں ہوا اس لئے بند کرنا پڑا۔

مولانا محی الدین قصوری مولاناؒ سے بیعت اور پنجاب میں یہ اور ان کے چچا مولانا عبداللہ قصوری تحریک نظم جماعت کے روح رواں اور بیعت و تعلیم و ارشاد کے مجاز و ماذون تھے۔

مولانا قصوری نے دینی و ملی مسائل پر نہایت بیش قیمت مضامین لکھے ہیں اور کئی کتب و رسائل کے مصنف ہیں۔

اس وقت ان کی عمر چھہتر برس سے زیادہ ہی ہوگی۔ نہایت متقی پرہیزگار، بلند اخلاق و پاکیزہ سیرت اور متواضع بزرگ ہیں۔

شیخ قمرالدین مرحوم

شیخ قمرالدین مرحوم لاہور کے مشہور تاجر و ناشر کتب اور مکتبہ تعمیر انسانیت کے مالک تھے۔ ان کے والد حافظ تاج الدین مرحوم عالم دین بھی تھے۔ اکابر و علمائے دیوبند سے انہیں بڑی عقیدت تھی۔ شیخ صاحب مرحوم بھی اسی مسلک کے پیرو تھے۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے وہ بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ اور بڑی پابندی کے ساتھ حضرت علیہ الرحمہ کے درس

قرآن حکیم میں شرکت فرماتے تھے۔

شیخ صاحب کی رسمی و روایتی تعلیم زیادہ نہیں تھی۔ لیکن ان کی طبع سلیم اور اعمال صالح تھے۔ مولانا لاہوری علیہ الرحمہ کے درس قرآن حکیم نے ان کی طبع سلیم کو مجلی کر دیا تھا۔ ان کے مزاج اور ذوق کو دین کے سانچے میں ڈھال دیا تھا اور دین کا شغف پیدا کر دیا تھا۔

شیخ صاحب مرحوم مولانا ابوالکلام آزادؒ سے بہت متاثر اور ان کے علم و فضل اور دینی، اور ادبی خدمات کے معترف و مداح تھے۔

۱۹۲۰ء میں جب مولاناؒ نے قیام نظم جماعت کی تحریک شروع کی اور مسلمانوں کو اس کی دعوت دی تو شیخ صاحب نے بھی اس دعوت حق پر لبیک کہا اور مولاناؒ کے دست حق پرست پر بیعت کر لی۔ یہ سعادت انہیں ۲۳ر اگست ۱۹۲۰ء بروز شنبہ کو لاہور کے مشہور بیرسٹر اور قومی کارکن میاں عبدالعزیز کے مکان پر حاصل ہوئی تھی۔

مولانا آزاد سے تعلق خاطر اور عقیدت و ارادت نے شیخ صاحب مرحوم کی طبیعت میں بھی عزیمت و استقامت کی ایک شان پیدا کر دی تھی۔ راقم السطور ان سے جون ۱۹۶۳ء میں ملا تھا۔ ان کی صحت اس وقت بھی اچھی نہیں تھی۔ آخری ڈیڑھ دو سال تو وہ مستقل طور پر بیمار رہے۔ مرحوم نے بتایا تھا کہ ان کے نام مولانا کے متعدد خطوط تھے لیکن ضائع ہو گئے ایک خط محفوظ رہ گیا تھا اور ازراہ محبت انھوں نے اس کی نقل کی اجازت دے دی تھی۔ یہ خط مولانا کے زیر ترتیب مجموعہ مکاتیب میں شامل ہے قیام پاکستان کے بعد اگرچہ ان کا گرد و پیش بالکل بدل گیا تھا کچھ کاروباری مجبوریاں بھی تھیں، لیکن مولانا آزادؒ کے علم و فضل، اخلاق و سیرت اور خدمات دینی و علمی کے جو نقوش ان کے لوح قلب و دماغ پر ثبت تھے وہ مٹ نہیں سکے۔

۴ر اپریل ۱۹۶۸ء کو شیخ صاحب نے لاہور میں پیام اجل کو لبیک کہا اور رحلت فرمائے عالم جاودانی ہوئے۔ شیخ صاحب بڑے نیک، شریف النفس، سلیم الطبع، منکسر المزاج اور متقی پرہیزگار بزرگ تھے۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

برصغیر کے مشہور ادیب، صحافی اور بلند پایہ شاعر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم بھی مولانا آزاد کے مرید ہیں۔ صوفی صاحب ۱۸۹۹ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے ان کا تعلق ایک کشمیری خاندان سے ہے۔ جو ایک مدت سے کاروبار کے سلسلے میں امرتسر میں سکونت پذیر تھا۔ ابتدا سے اعلیٰ ثانوی درجات تک تعلیم امرتسر میں حاصل کی۔ آنرز کا امتحان ایف سی کالج، لاہور سے پاس کیا۔ والد غلام رسول مرحوم کا اصرار تھا کہ کاروبار شروع کیا جائے لیکن وہ تعلیم کے شوق میں اسلامیہ کالج میں داخل ہو گئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے انھوں نے ایم۔اے۔ فارسی کا امتحان پاس کیا پھر ٹریننگ کالج سے بی ٹی کی تکمیل کی۔

ملازمت کی ابتدا گورنمنٹ کالج امرتسر سے ہوئی۔ جہاں آپ پہلے سینیر ٹیچر مقرر ہوئے کچھ عرصے کے بعد انسپکٹر آف اسکول کی حیثیت سے منتخب کر لئے گئے لیکن جلد ہی اس ملازمت کو چھوڑ کر لاہور آ گئے۔ اور گورنمنٹ ٹریننگ کالج میں استاد مقرر ہوئے۔ چار سال کے بعد گورنمنٹ کالج میں لکچرر مقرر ہوئے اور پچیس سال تک اسی کالج سے وابستہ رہے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد حکومت ایران نے انھیں خانہ فرہنگ ایران کا ڈائرکٹر مقرر کیا۔

صوفی صاحب کی ادبی اور صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۲۴ء میں نیرنگ خیال لاہور کے اجراء کے ساتھ ہوا۔ صوفی صاحب نے اس میں لکھا بھی اور ڈاکٹر تاثیر اور حفیظ جالندھری کے ساتھ اس کی ادارتی ذمہ داریوں میں بھی شریک رہے۔ مخزن جب دوبارہ نکالا گیا تو اسکے مدیر اعزازی صوفی تھے اور جب ۱۹۶۲ء میں ہفت روزہ لیل و نہار لاہور سے جاری ہوا تو آپ اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ لیل و نہار بند ہونے کے بعد ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہوئے اور اب تک اسی سے وابستہ ہیں۔

صوفی صاحب نے اخبارات و رسائل میں بہت لکھا اپنے نام سے بھی اور اپنی ملازمت کی مجبوری کی وجہ سے شہباز کاشمیری اور عرفان کاشمیری کے قلمی ناموں سے ملی مفاد کے موضوعات، اور

سیاسی، تعلیمی، سماجی مسائل پر سینکڑوں مضامین لکھے ہیں۔

صوفی صاحب کو متعدد زبانوں پر عبور حاصل ہے پنجابی اور اردو تو انھوں نے ماں کی گود میں اور ابتدائی تعلیمی و تفریحی ماحول میں سیکھیں اور اس طرح دونوں گویا ان کی مادری زبانیں ہیں۔ انگریزی کا بلند پایہ ادبی ذوق رکھتے ہیں اور تحریر و تقریر پر انہیں قدرت حاصل ہے، عربی سے بھی واقف ہیں لیکن فارسی زبان وادب پر ان کا عبور اور شعر وادب کا اعلیٰ ذوق اہل زبان کے لئے بھی باعث رشک ہے۔ صوفی صاحب فارسی کے بلند پایہ اور صاحب طرز ادیب ہیں۔

صوفی صاحب پنجابی اور اردو کے بلند پایہ شاعر ہیں اردو میں بچوں کے لئے انھوں نے خاص طور پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں جو نہایت کامیاب اور بہت مقبول ہیں۔ فن مصوری میں بھی علمی اور عملی طور پر دخل ہے۔ موسیقی کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ حکومت پاکستان نے ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں "ستارہ خدمت" کا اعزاز دیا ہے۔ اور حکومت ایران نے ان کے علم وفضل کے اعتراف میں انہیں "نشان فضیلت" کا اعزاز بخشا ہے۔

صوفی صاحب متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ جھولنے، بچوں کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ انجمن ان کے پنجابی، اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ حکمت قرآن، ان کی بلند پایہ تصنیف ہے ایک کتاب کا موضوع علامہ اقبال کی شخصیت وکلام ہے۔ بہت سے انگریزی ڈراموں کا ترجمہ بھی کیا ہے جو پنجابی اور اردو میں کئی مجموعوں میں چھپ چکے ہیں۔

صوفی صاحب نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا لیکن نظری طور پر ہندوستان کی مسلم سیاست اور مسلم تحریکات ان کے غور وفکر اور مطالعہ و تحریر کا موضوع رہی ہیں۔ قرآن حکیم کا مطالعہ اور اس پر غور وفکر ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ حکمت قرآن ان کے اسی مطالعے اور غور وفکر کا حاصل ہے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی و عمرانی نظریات اور فلسفے سے وہ خاص طور پر متاثر ہیں۔ مولانا عبداللہ غزنوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے انہیں خاص عقیدت ہے۔

۱۹۲۰ء میں رانچی کی نظر بندی سے رہائی کے بعد جب کہ تحریک خلافت اور تحریک ہجرت شباب پر تھی، مولانا آزاد امرتسر پہنچے اور ایک نہایت پرجوش تقریر کی۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسوں کی شورا شوری ختم ہو چکی تھی۔ مولانا آزاد کی اس تقریر نے لوگوں میں ایک جوش اور ہیجان پیدا کر دیا۔ مسلمان خاص طور پر اس سے متاثر ہوئے۔ ان میں بھی نوجوان طبقہ تھا جس نے مولانا کے افکار میں ایک ولولہ تازہ پایا۔ مولانا نصر اللہ خاں عزیز نے غالباً مولانا کی اس موقعے کی اسی تقریر کے متعلق لکھا ہے:

"امرتسر کے جلیانوالا باغ میں شام کے وقت مولانا تقریر کر رہے تھے، مجھے وجدان ہی سے نہیں آنکھوں سے اس طرح محسوس ہو رہا تھا گویا تقریر ایک نور کی چادر کی طرح تمام مجمع پر چھائی ہوئی ہے۔ یکایک قریب کی ایک مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی، خطیب تھوڑی دیر کے لئے رک گیا۔ میں نے اس طرح محسوس کیا گویا کسی نے چادر کو چاک کر کے مجمع کے سروں پر سے کھینچ لیا ہے۔ میں نے ہندوستان کے تمام مشہور و معروف مقرروں کی تقریریں سنی ہیں مگر یہ عجیب و غریب کیفیت کبھی محسوس نہیں کی۔"

صوفی صاحب اس زمانے میں تھرڈ ایر کے طالب علم تھے۔ مولانا کی تقریر سے متاثر ہوئے دوسرے روز ان سے ملنے پہنچ گئے۔ مولاناؒ کے پاس وقت کم اور ملاقات کے متمنی زیادہ لوگ تھے۔ پانچ منٹ سے زیادہ وقت کسی کو نہیں دے رہے تھے۔ صوفی صاحب تفصیلی ملاقات کے طالب تھے اور اپنے کچھ شکوک و شبہات رفع کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے دوسرے روز صبح فجر سے پہلے کا وقت طے ہوا۔ صوفی صاحب وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ صوفی صاحب سوال کرتے اور مولانا جواب دیتے رہے نماز فجر تک تمام شکوک و شبہات دور ہو چکے تھے۔ مولانا کے ساتھ نماز ادا کی اور مولانا کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

مولانا آزاد سے ان کے تعلقات صرف مرشد و مسترشد کے نہ تھے علمی بھی تھے۔ مولانا جب کبھی

لاہور تشریف لاتے تو صوفی صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوتے لیکن عام طور پر ان کی ملاقات کا وقت وہی ہوتا جو ان کی پہلی ملاقات کا تھا یعنی صبح سویرے، نماز فجر سے قبل کبھی اکیلے ہوتے کبھی کوئی دوست مثلاً سالک صاحب ساتھ ہوتے۔

صوفی صاحب مولانا رحمتہ اللہ علیہ کے فضل و کمال، ان کے تبحر علمی، ان کے کمالِ حافظہ، ان کی ذہانت، وسیع النظری، ان کی وضع داری اور ان کے محاسن اخلاق و سیرت کے معترف و مداح ہیں۔

مستری محمد صدیق

مستری محمد صدیق سلطان پور لودھیاں ریاست کپورتھلہ کے باشندے تھے۔ کاروبار کے سلسلے میں ایک عرصہ تک بنارس میں رہے۔ کچھ عرصہ کلکتہ اور دہلی میں مقیم رہے اور پھر اپنے آبائی وطن لوٹ آئے۔ ۱۹۴۵ء میں سلطان پور اور کپورتھلہ کے درمیان میں آدھی کھوئی کے مقام پر رہنے لگے اور خدمت خلق کو اپنا شعار بنا لیا وہ بلاتفریق مذہب و ملت ہر کسی کی خدمت کے لئے ہر وقت مستعد رہتے۔ ۱۹۴۷ء میں جن سنگھ کے کارکنوں نے ان پر ریوالور سے حملہ کر کے انہیں زخمی کر دیا۔ لوگ انہیں کپورتھلہ کے ہسپتال لے گئے۔ مشرقی پنجاب میں اس وقت فسادات کی آگ بھڑک رہی تھی، مسلمانوں کے جان و مال محفوظ نہ تھے۔ صحتیابی کے بعد مستری صاحب دہلی چلے گئے اور وہاں سے پاکستان آ گئے۔ پہلے لاہور میں قیام کیا۔ پھر کراچی آ گئے اور کچھ عرصہ قیام کر کے سندھ میں جنگ شاہی میں جا کر مقیم ہو گئے۔ بعد ازاں چودھری نیاز علی صاحب کی دعوت پر خوشاب چلے گئے اور سون سیکسر کے پہاڑوں میں ایک جگہ پسند کر کے مقیم ہو گئے۔ ۱۱ اگست ۱۹۵۲ء میں یہیں انتقال ہوا اور خوشاب میں تدفین ہوئی۔

مستری محمد صدیق صاحب بڑے مخلص اور بے مثل انسان تھے۔ ان کی زندگی خدمت خلق کے لئے وقف تھی۔ خدا ترسی اور انابت الی اللہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ انقلابی ذہن رکھنے والے درویش صفت بزرگ تھے۔ اپنے خیالات اور اپنی زندگی کے لحاظ سے وہ اس عہد کے حضرت ابوذر غفاری

تھے ہمیشہ ایسی سوسائٹی کی تلاش میں رہتے تھے جو دینی تصورات کے ڈھانچے میں ڈھلی ہوئی ہو۔ اسی سلسلے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ملے۔ جماعت اسلامی میں شامل ہوئے کچھ عرصہ جماعت اسلامی کے دارالاسلام پٹھان کوٹ میں بھی مقیم رہے تھے لیکن جس یوسف مقصود کی تلاش میں وہ یہاں پہنچے تھے وہ یہاں نہیں ملا۔

مستری صاحب کا تعلق ان السابقون الاولون میں سے تھا جنھوں نے سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزادؒ کی دعوت پر لبیک کہا اور اپنا سب کچھ لٹا کر حزب اللہ میں شامل ہونے کے لئے کلکتہ گئے اور مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس وقت سے لے کر آخر وقت تک انہیں مقاصد کے لئے کام کرتے رہے۔ مولانا آزاد کے افکار و خیالات سے وہ بہت متاثر تھے۔ ان کی مکتبی تعلیم زیادہ نہ تھی البتہ مولانا آزادؒ کی صحبت نے انہیں فکر اور انداز فکر کی دولت سے مالامال کر دیا تھا۔ دارالارشاد کلکتہ میں جن مخلصین صادقین نے مولاناؒ سے قرآن حکیم کے رموز و نکات اور شریعت کے اسرار و حکم سیکھے تھے۔ مستری صاحب انہیں خوش نصیبوں میں سے تھے۔ وہ مولانا کی روحانیت، علم و فضل، فکر و فہم اور صحت نظر کے بے حد معترف اور ان کے محاسن اخلاق و سیرت اور عزیمت کے بہت مداح تھے۔ حضرت مولانا بھی ان پر بہت اعتقاد کرتے تھے۔ ایک مدت تک مولاناؒ کے ساتھ رہے۔ بہت سی باتوں میں ان کا ذہن بالکل مولانا کے ذہنی سانچے کے مطابق ڈھل گیا تھا۔ ساری زندگی عسرت اور تنگ دستی میں گذری۔ لیکن اپنی قناعت و خودداری کی آن میں فرق نہ آنے دیا۔

مولانا آزادؒ سے ان کے قریبی مراسم تھے دونوں ایک دوسرے کا بڑا لحاظ و احترام کرتے تھے مولانا آزادؒ کسی سے وقت مقرر کئے بغیر نہ ملتے تھے لیکن مستری صاحب کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی وہ جب چاہتے چلے جاتے اور جس وقت چاہتے مل لیتے۔ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی نے ان کا قلمی چہرہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"میانہ قد، گداز بدن، لمبوتری سفید داڑھی، سر بھی سفید اور عموماً

نائی کی عنایت سے بے نیاز، بڑی بڑی رسیلی آنکھیں، گندمی رنگ، سفید کھدر کا کرتا اور اسی کا شرعی پاجامہ چمروجوتا، کبھی برہنہ سر اور کبھی عمامہ برسر۔"

اور ان کی سیرت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"خودداری میں ابوالکلام، سادگی میں حسرت موہانی، معاشی افکار میں پرتو ابوذر غفاری، انقلابی ذہن میں سبھاش چندر بوس، قناعت اور بے نیازی میں قلندر صفت، یاد خدا میں مست، علم لدنی کے حامل، تفسیر میں بحرِ مواج، گفتگو میں بشیشر ہوز کا سا انداز، نڈر، صاف گو، بے ریا، مخلص، مدلل اور معقول بات کو فوراً تسلیم کرلینے والے یہ ہیں مستری محمد صدیق۔"

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

محمد یونس خالدی (لکھنؤ)

مولانا آزادؒ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں محمد یونس خالدی صاحب آخری شخص ہیں جنہیں یہ سعادت حاصل ہوئی۔ انھیں بچپن ہی سے مولانا آزادؒ سے بڑی عقیدت ہے مولاناؒ ان کے ممدوح اور مرکزِ عقیدت بھی ہیں اور علمی موضوع بھی۔ مولاناؒ کی شخصیت اور افکار کا انھوں نے بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے، مولاناؒ کے دینی و سیاسی افکار سے اپنی فکر کا چراغ روشن کیا ہے اور عملی زندگی میں مولانا کی عزیمت و استقامت کو مشعل راہ بنایا ہے۔

محمد یونس خالدی صاحب ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو بارہ بنکی (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن لکھنؤ ہے۔

زمانہ طالب علمی سے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اس کے نتیجے میں سنت یوسفی تو ضرور ادا کرلی لیکن درسی تعلیم کی تکمیل نہیں ہوسکی البتہ مطالعہ کے شوق نے انہیں روایتی تعلیم کے حاصل سے محروم نہیں رکھا۔

خالدی صاحب ایک شگفتہ نگار ادیب اور بالغ نظر نقاد بھی ہیں۔ "مطالعہ میر سید علی غمگین" کے نام سے ان کی ایک ادبی، تنقیدی اور تحقیقی کاوش انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ "روح آزاد" کے نام سے مولانا آزاد کی شخصیت اور فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے مولانا آزادؒ پر بہت سے بلند پایہ مضامین لکھے ہیں جو اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور بھی کئی علمی و ادبی شخصیات اور دیگر موضوعات پر انھوں نے اپنے نتائجِ مطالعہ و تحقیق اور افکار کو مرتب کیا ہے۔ ایک مدت تک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے وابستہ رہے۔ کچھ دنوں قومی آواز لکھنؤ کے ادارے سے وابستہ رہے اور بھی کئی اداروں اور اشخاص کے تصنیفی اور تحقیقی کاموں میں معاون رہے ہیں۔

خالدی صاحب نہایت شریف، متواضع، خلیق، راسخ العقیدہ، نیک نفس اور حسن سیرت و عمل کے مالک ہیں۔

قدیم عربوں کے ہاں چمڑے کی تجارت

از جناب احمد خاں صاحب ایم اے ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد۔ پاکستان

جزیرۃ العرب پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو ایک نظر ہی سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ معمورۂ عالم کا یہ خطہ مشرق و مغرب کے سنگم پر واقع ہے، اور اس نقطہ پر ایشیا اور یورپ کے سارے ممالک کا اکٹھا ہو جانا بالکلیہ ناقابل قیاس نہیں ہے۔ چنانچہ قدیم زمانہ میں جزیرۃ العرب میں مشرق کی طرف سے ایران، ہند اور چین وغیرہ سے لوگ تجارت کے لئے جمع ہوتے تھے۔ ایسے ہی رومی حکومت کے لوگ بھی اس خطہ میں تجارتی سامان کا لین دین کرنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ اس سامان کی نقل و حرکت کے لئے دو راستے مقرر تھے۔ ایک سمندر سے دوسرا خشکی ہے۔ جو لوگ چین یا مشرق بعید سے اس غرض کے لئے چلتے وہ ہند اور ایران سے گزر کر آتے تھے۔ دوسری طرف رومی حکومت کے جو لوگ مغربی ممالک سے یہاں آتے تھے وہ ترکی شام وغیرہ سے گذر کر اس خطہ میں پہنچتے تھے افریقہ کے جنوب مشرقی حصہ کے لوگ بھی جزیرہ عرب سے تجارت کے لئے سمندر کی راہ سے آیا کرتے۔ چاروں طرف سے تجار کی بھرمار نے اس خطہ کو تاجروں کا خطہ بنا دیا تھا۔ یہاں کے لوگ تجارت کے میدان میں دور دور تک مشہور تھے۔ پہلی صدی عیسوی کے مشہور یونانی سیاح سٹرابون (STRABON) نے عربوں کے بارے میں ایک ضمنی جملہ کہا ہے جو اس وقت کی عربوں کی حالت پر صحیح دلالت کرتا ہے۔ وہ جملہ کچھ اس قسم کا ہے: "العرب تجار و سماسرۃ" [1]

---

[1] سعید الافغانی: اسواق العرب ط دمشق، ۱۹۳۷ء ص ۱۷۔

تدمر، سبا اور معینِ عرب کی قدیم حکومتوں کی تجارت اور امارت کے بارے میں تورات اور قرآن مجید میں ذکر آیا ہے۔ تجارت کے میدان میں سربراہی کس کس حکومت کے ہاتھ میں کس کس عرصہ میں رہی اس کے بارے میں ہم حتمی طور پر کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ البتہ اتنا ضرور علم ہے کہ اوائل چھٹی صدی عیسوی میں عربوں کی تجارت کا بہت بڑا حصہ قریشِ مکہ کے ہاتھ میں تھا۔ اس امر سے بجا طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اسلام سے پہلے مکہ کو اہم تجارتی مقام کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ یہاں پر لوگ اکنافِ عالم سے آتے تھے۔ عبد مناف کے چاروں بیٹوں نے تجارت کے میدان میں جو کردار ادا کیا ہے، اس کی مثال تاریخِ عرب میں ملنا بہت دشوار ہے۔ ان چاروں بھائیوں کا ذکر عربوں کی تجارت میں ایک خاص مقام کا حامل ہے جس کے بغیر یہ موضوع تشنہ رہے گا۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ جزیرۂ عرب میں پیداوار بہت کم ہوتی تھی۔ لوگوں کے ذریعہ معاش میں تجارت تقریباً سرِفہرست تھی۔ قدیم عہد سے لے کر ابتدائے اسلام تک تجارت ہی ایک اہم کام تھا جو عرب کے اکثر لوگ کیا کرتے تھے۔ قریشِ مکہ جو تجارتی شاہراہ کے مرکز میں واقع تھے، تجارت کے اجارہ دار تھے۔ ہاشم، عبد شمس، المطلب اور نوفل چاروں بھائیوں نے مختلف راستوں کے پرمٹ حاصل کر رکھے تھے۔ ہاشم بن عبد مناف، مکہ سے شام کی طرف سامانِ تجارت لے کر جاتے جس میں دیگر اشیاء کے علاوہ کھالیں بھی ہوتی تھیں۔ بہت سے دوسرے لوگ، ان صاحبان کے ایما پر کام کرتے تھے۔ ہاشم نے شام و روم کے ملوک سے باقاعدہ اجازت حاصل کر لی تھی جس کی بدولت اس کو اور اس کی ایما پر چلنے والے لوگوں کو ان علاقوں میں ہر قسم کی تجارت کی عام اجازت تھی۔ لوگ سامانِ تجارت میں کھالیں بھی رکھتے تھے جو مکہ اور طائف کی ایک خاص صنعت تھی[1]۔ ہاشم تجارت کی غرض سے ہی شام گئے ہوئے تھے کہ راستے میں "غزة" کے مقام پر انتقال

---

[1] تاریخ الطبری طالیڈن حصہ اول ص ۱۰۸۹؛ سیرت ابن ہشام طالیڈن ج ۱ ص ۸۷

کر گئے تھے[1]

ہاشم کے بھائی عبد شمس حبشہ کی جانب سفر کرتے تھے۔ انھوں نے اس حصے میں تجارت کی باقاعدہ اجازت لے رکھی تھی۔ ان کی امان میں اور لوگ بھی اس علاقہ میں تجارت کیا کرتے تھے حبشہ میں عربوں کا سامانِ تجارت کافی مقدار میں جاتا تھا۔ اور بہت مقبول تھا خاص طور پہ کھالوں کی مقبولیت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمان جب ہجرت اولیٰ میں حبشہ گئے تو قریش کے لوگوں نے ان کا پیچھا کیا۔ شاہِ حبشہ سے ان مسلمانوں کو اپنی قید میں لینے کے لئے انھوں نے شاہِ حبشہ کو سب سے پہلے تحفہ کے طور پر کھالیں ہی پیش کی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حبشہ میں مکی کھالوں کی شہرت خوب پھیل چکی تھی۔ اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس واقعہ سے قبل اور بعد میں بھی وسیع پیمانے پر اس قسم کی کھالیں حبشہ کو دساور کی جاتی تھیں۔ اس مقصد کے لئے کئی لوگوں نے عبد شمس سے اجازت لے رکھی ہو گی۔

ان کے تیسرے بھائی المطلب تجارت کی غرض سے یمن کی طرف جایا کرتے تھے۔ یہ بعید نہیں ہے کہ یہی صاحب وافر مقدار میں یمن میں واقع کھال کے مراکز سے عمدہ عمدہ کھالیں لے کر اپنے مرکز (HEAD OFFICE) مکہ میں جمع کر دیتے تھے۔ اور یہاں سے وہ اسٹاک باقی تین اطراف یعنی حبشہ، شام و روم اور عراق و فارس کی طرف نکلتا رہتا تھا۔ المطلب نے اس مقصد کی خاطر بارہا یمن کی طرف سفر کیا ہے۔ وہ تجارت کے لئے ہی یمن گئے ہوئے تھے کہ راستے میں "ردمان" کے مقام پر انتقال کر گئے۔ انھوں نے ملوک حمیر سے باقاعدہ اجازت لے رکھی تھی۔ جس کے تحت وہ اور ان کے اجازت یافتہ نمائندے اس علاقہ میں آجا سکتے تھے۔

نوفل نے عراق اور فارس کے ملوک سے اجازت طلب کر رکھی تھی۔ اس طرح وہ اپنی تجارت کو دور مشرق تک پھیلائے ہوئے تھے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۸۷

ان کے علاوہ چند اور لوگ بھی چمڑے کی تجارت کے سبب شہرت کے مالک تھے۔ ان میں ابوسفیان بن حرب انگور اور چمڑا بیچا کرتے تھے۔ اور ایوب السختیانی کا نام ہی صرف سختیان (ایک قسم کی کھال) کے بیچنے کی وجہ سے پڑ گیا تھا[1] دور جاہلی میں حضرت عمرو بن العاص تجارت کی غرض سے شام ہی نہیں بلکہ اس سے آگے مصر بھی جایا کرتے تھے۔ اگرچہ حضرت عمرو بن العاص کے مصر جانے والے راستے کا صحیح علم ہے تاہم خشکی اور تری دونوں راستوں پر سفر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اس بات سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ یمن کی کھالیں اس عہد میں تجارت کے سامان میں ایک شئے (ITEM) سمجھی جاتی تھیں۔ اسی وجہ سے حبشہ، شام و مصر فارس اور عراق میں ان کی مانگ تھی۔ کھالوں اور دوسرے سامان کی بڑھتی مانگ کی بنا پر ان ممالک کی طرف سال بھر کئی سفر کئے جاتے تھے۔ تجارت کا یہ سامان اندرون ملک بھی اسی قدر مطلوب تھا۔ مختلف اسواق میں اس سامان کی تجارت اس کی بڑھتی ہوئی مانگ کی طرف دلالت کرتی ہے۔ عرب کے اندر ان اسواق کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ ان کے قیام کے دن مقرر تھے جو ہر ایک تاجر اور مشتری کو معلوم ہوتے تھے۔ ان مقررہ ایام میں غرض مند لوگ ان مقررہ جگہوں پر جمع ہو کر اپنا لین دین کرتے تھے۔ ان اسواق کی تفاصیل مختلف کتب میں موجود ہیں، جو بڑی آسانی سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس عجلت میں ہم صرف ان تجارتی مقامات اور راستوں کا ذکر کریں گے جو صرف کھالوں کی تجارت کے ضمن میں نظر سے گذرے ہیں۔ سب سے پہلے ہم صرف ان مقامات و طرق کی طرف اشارہ کریں گے جو جزیرۂ عرب کے اندر واقع ہیں۔ اس کے بعد دوسرے حصہ میں تجارت کے اس دائرہ کو بین الاقوامی سطح تک دیکھیں گے۔

جزیرہ عرب میں قائم ہونے والے اسواق سے کافی حد تک پتہ چل جاتا ہے کہ عرب کس انداز

---

[1] ابن رستہ: الاعلاق النفیسہ، ط لیڈن ص ۲۱۵ - ۲۱۶

سے سفر کرتے تھے، کہاں کہاں جاتے تھے اور کس کس سامان کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ تقریباً بیس اسواق کا ذکر مختلف کتب میں موجود ہے، جو مختلف مقامات پر مختلف اوقات میں وقوع پذیر ہوتے تھے یہاں ہم نے ان اسواق کی ترتیب "اوقاتِ قیام" کے لحاظ سے رکھی ہے۔ سب سے پہلے دومتہ الجندل کے مقام پر قائم ہوتا تھا۔ اور سب سے آخر میں الحیرۃ میں۔ ترتیب یوں ہے:

دومتہ الجندل۔ مشقر۔ ہجر۔ عُمان۔ حُباشہ۔ صُحار۔ دُبیٰ۔ شحر۔ عدن۔ صنعاء۔ حضرموت۔ عُکاظ۔ مُجنّۃ۔ ذوالمجاز۔ نطاۃ خیبر۔ حجر۔ بصریٰ۔ دیر ایوب۔ اذرعات۔ الحیرۃ۔[1]

ان اسواق میں تقریباً ہر قسم کے سامان کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ مگر اس میں سے اہم کھجور، انگور، چمڑا، انواع واقسام کی چادریں اور مختلف مویشی ہوتے تھے[1] اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ چمڑے کی صنعت اور تجارت کا میدان عرب میں کس قدر وسیع تھا۔ بعض شہر اس میدان میں اس قدر مشہور تھے کہ وہاں پر سارا سال تاجر آتے رہتے اور چمڑا خرید کر اپنے شہروں کو لوٹ جاتے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت یافتہ یمن کا ایک شہر صَعدہ تھا اور نجد میں طائف۔ صعدہ میں چمڑے کی تجارت اور چمڑے کا کام خولان نامی قبیلہ کرتا تھا۔ وہاں پر بیشتر تاجر بصرہ سے آتے تھے، جنھوں نے اپنے سفر کے لئے یہ راستہ اختیار رکھا تھا: بصرہ سے منجشانیۃ۔ حُفیر۔ رحیل۔ شجی۔ خرجاء۔ حفر۔ ماویۃ۔ ذات العشر۔ ینسوعہ۔ سُمینہ۔ نباج۔ عوسجہ۔ قریتین۔ رامۃ۔ امرہ۔ طخفۃ۔ ضریۃ۔ جدیلۃ۔ فلجتہ۔ الدفینۃ۔ قُبا۔ مران۔ وجیرۃ۔ اوطاس۔ ذات عرق۔ بُستان بنی عامر۔ مکہ۔[2] مکہ پہنچ کر وہ عکاظ کے قریب ایک مقام "رکبۃ" میں جاتے تھے[3] اس کے بعد تاجر لوگ اس راہ پر سفر کرتے جو مکہ سے یمن کو جاتا ہے۔ وہ راستہ ان مقامات سے گذرتا تھا: مکہ سے

---

[1] اسواق العرب ص ۱۶۶۔

[2] ابن خرداذبہ: المسالک والممالک طبع لیڈن ص ۱۴۶ - ۱۴۷۔

[3] ابوالفرج قدامہ بن جعفر۔ کتاب الخراج طبع لیڈن ص ۱۸۹۔

شمر ابن المرتفع۔ قرن المنازل۔ الفتقُ۔ صفن۔ تُربَة۔ کری۔ رنیۃ۔ تُبالہ۔ مبیثۃ۔ صداء۔ بنات حرب یا نبات حرم۔ یکیم۔ کُتنۃ یا کُتبۃ۔ الثجۃ۔ سردم راح یا شردم راح۔ جُرش۔ المجرۃ۔ عرقۃ۔ صعدۃ[1]

انہی راستوں پر چمڑے کی فروخت کرتے ہوئے یہ لوگ بُصری تک جاتے تھے۔ یہ بعید نہیں ہے کہ وہاں سے کوئی اور سامان خرید کر۔۔۔ انہی راہوں میں واقع شہروں میں بیچتے ہوئے واپس صعدہ پہنچتے ہوں۔

اہل بصری کے علاوہ عُمان کی طرف سے بھی کچھ لوگ صعدہ پہنچتے تھے۔ ان میں غیر ملکی بھی ہوتے تھے[2] ان کے لئے دو راستے کھلے تھے ایک سمندر کی طرف سے اور دوسرا خشکی سے، جو مکہ کی طرف سے ہو کر آتا تھا۔ اس بات کا اندازہ لگانا بہت دشوار ہے کہ زیادہ لوگ سمندر کے ذریعے سے آتے تھے یا خشکی کی راہوں سے تاہم وقت اور حالات کو مدنظر رکھ کر تجار یہاں تک پہنچتے تھے معلوم یوں ہوتا ہے کہ خشکی کی راہ سے آنے والے تجّار صعدہ کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی جاتے اور وہاں سے ضروری سامان خرید کر اپنے وطن لے جاتے تھے۔ یمن میں داخل ہونے والے لوگ جُرش اور زَبِید بھی لے جاتے تھے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں کا چمڑا کافی شہرت کا مالک تھا۔

جُرش کے قریب ہی ایک مشہور و معروف شہر نجران واقع ہے۔ یہ ایک تجارتی مرکز تھا۔ یہاں پر پارچہ بافی کی مختلف اقسام کے علاوہ چمڑا بھی بنتا تھا۔ اسی لئے یہ چمڑے کی تجارت کا مرکز تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جو لوگ یہاں تجارت کی غرض سے آتے تھے ان میں سے اکثر قرب وجوار کے قبائل سے تعلق

---

[1] ابن خرداذبہ: المسالک والممالک ص ۱۳۵

[2] یاقوت حموی: معجم البلدان: صعدۃ۔

رکھتے تھے

نجد کا عظیم شہر طائف چمڑے کی صنعت کی وجہ سے بہت دور دور تک مشہور تھا۔ یہاں پر تقریباً ہر وقت چمڑے کی تجارت کا بازار گرم رہتا۔ مختلف اقوام کے لوگ چار دانگ عالم سے طائف پہنچتے اور چمڑا خرید کر اپنی منزلوں کو لوٹ جاتے۔ مکہ اور طائف کے درمیان اس وقت جو قبیلہ آباد تھا اس کی تقریباً تمام شاخیں طائف کے چمڑے سے مختلف مصنوعات بنا کر تمام عرب میں پھیلاتی رہتی تھیں [۱]

اس شہر کا محلِ وقوع کچھ اس طرح ہے کہ عرب کے ہر بڑے شہر سے وہاں تک نہایت ہی آسان راستے موجود تھے۔ سال بھر تجار آتے اور طائف سے چمڑے کے علاوہ دیگر اشیاء خرید کر دوسرے شہروں کا رخ کرتے تھے۔ مذکورہ بالا قبیلہ کے علاوہ دیگر تاجر بھی عکاظ اور دوسرے اسواقِ عرب میں یہاں کی مصنوعات لے جاتے تھے۔ چنانچہ یہاں سے یہ سامان تجارت عراق اور عدن تک پہنچتا تھا [۲] غرض جزیرۃ العرب کے ہر کونے میں یہاں کا چمڑا مہیا کیا جاتا تھا۔ اس سامان میں جو مختلف شہروں اور مقامات کی طرف طائف سے جاتا تھا اس میں چمڑا، چمڑے کے جوتے، گھوڑوں کی زینیں، چمڑے کے خیمے اور چمڑے کے بڑے بڑے حوض شامل تھے [۳]

زیر نظر دور میں استعمال ہونے والی جزیرۃ العرب کی ہر بندرگاہ بیرونی تاجروں کے لئے بہت بڑی تجارتی منڈی کا کام دیتی تھی، اس لیے کہ اندرون ملک کی تمام مصنوعات وہاں پہنچ

۱؎ اصطخری المسالک الممالک طبع لیڈن ص ۱۲۴

LAMMENS: LE CALIFAT DE YAZID I, BEIRUT, 1921, P. 344.

۲؎ LAMMENS: LATAIF, BEIRUT, 1922,

۳؎ LAMENS: TAIF : 116,

۴؎ LAMMENS: TAIF : 114-115,

جائیں اور وہاں سے وہ سامان درساور ہوتا تھا۔ باہر کے تاجر اندرونِ ملک میں داخلے کی بجائے وہاں سے خرید کر واپس ہونے میں بہت آسانی محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ طائف کے قریب کی بندرگاہ "جُدّة" اسی کام کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ اس طرح جُرش اور صعدہ کے لئے ان کی قریبی بندرگاہیں کام آتی تھیں۔ جزیرہ عرب کے جنوب میں واقع بندرگاہ "عدن" تو ہر قسم کے سامان کے لئے تجارتی مرکز تھی۔ تقریباً ہر قسم کا سامان جو پورے عرب میں بنتا تھا اس مقام سے سمندر کی راہ باہر جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عدن تمام جزیرۂ عرب سے جال کی طرح بچھے ہوئے راستوں سے ملحق تھا۔ ملک کے کسی کونے میں بنا ہوا سامان عدن تک تھوڑے سے وقت میں مختصر راہ سے پہنچ جاتا تھا۔ چونکہ اس منڈی میں مصنوعات کا مقابلہ رہتا تھا اس لئے یہاں تک پہنچنے والے سامان کی کوالٹی اچھی ہوتی تھی۔ اس لئے کہ گھٹیا کوالٹی کی فروخت مشکل تھی۔ یہ بات سب پر واضح ہے کہ عدن کی بندرگاہ سے چمڑے کی عمدہ مصنوعات ہی نہیں بلکہ خود چمڑا بھی باہر کے ممالک میں جاتا تھا۔ وہ کس کس ملک میں درساور ہوتا تھا۔ اس کے بارے میں تفصیلی بحث بعد میں ہوگی۔

جزیرہ نمائے عرب کے مشرقی حصہ میں صُحار ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جو بندرگاہ کا کام بھی دیتا تھا۔ وہاں پر تجار اکثر اکٹھا ہوتے تھے اور چمڑے کی مختلف مصنوعات کا لین دین کرتے تھے[1] ابن حوقل نے بتایا ہے کہ یہ قصبہ مال تجارت سے اس قدر بھرپور رہتا تھا کہ اس وقت بحر فارس کے کنارے کوئی دوسرا قصبہ اس کا مثیل نہ تھا۔ نہ آبادی کے لحاظ سے اور نہ دولت کی کثرت کے لحاظ سے[2] یہاں پر اندرون ملک کے علاوہ باہر کے لوگ بھی جوق در جوق تجارت کی غرض سے آتے۔ بیرونی تاجروں کی کشتیوں سے اس کی بندرگاہ بھری رہتی[3] بغرض تجارت عربوں کے قافلے پورا سال

---

[1] ابن المجاور: تاریخ المستبصر، لیڈن ص ۲۸۴　[2] ابن حوقل: صورة الارض طبع لیڈن ۱۹۳۰ء ص ۴۸

[3] ایضاً

چلتے رہتے اور راستے میں ہر شہر یا منڈی میں لین دین کا کاروبار کرتے۔ چونکہ ان منڈیوں (اسواق) کے علاوہ اور کوئی ایسا مقام نہ تھا جہاں پر لوگ خرید و فروخت کر سکتے ان منڈیوں کے قیام کے ایام میں غرض مند لوگ بہت بڑی تعداد میں جمع ہو جاتے تھے۔

(۲)

یہ ایک حقیقت ہے کہ جزیرہ نمائے عرب ایشیا اور یورپ کے سنگم پر واقع ہے۔ قدیم سے یہ علاقہ کے دونوں براعظموں کے تاجروں کی گذرگاہ رہا ہے۔ رومی تاجر اسی جزیرہ سے گذر کر مشرقِ وسطی میں قسمت آزمائی کے لئے جاتے تھے۔ چاہے ان کا راستہ سمندر سے ہوتا، اور چاہے وہ خشکی کی راہ سے تجارت کو جاتے مگر ہر دو صورتوں میں اس جزیرہ میں سے گذرنا پڑتا۔ اسی طرح مشرق بعید سے آنے والے تاجر ان ہی راستوں سے گذر کر اپنے امور سرانجام دیتے تھے۔ مسلک کی شاہراہ جزیرہ نمائے عرب ہی سے گذرتی تھی جس کا بہت بڑا مرکز "پیٹرا" (PETRA) تھا۔

عرب بذاتِ خود تجارت کے میدان میں بہت دور دور تک پہنچ چکے تھے۔ ان کی تجارت کا دائرہ شمال میں عراق، شام، ترکی اور مصر تک پھیلا ہوا تھا۔ حضرت ابو سفیانؓ ان دنوں تجارتی مشن پر تھے۔ جب قیصر روم نے بلا کر ان سے رسول کریم سے متعلق سوالات پوچھے تھے۔ عمرو بن العاصؓ دورِ جاہلیہ میں شام سے گذر کر مصر تک جاتے تھے۔ ان کے سامانِ تجارت میں عطر اور چمڑا اور اہم مصنوعات (PRODUCTS) تھیں۔ یہ چمڑا اور دوسرا سامان حضرت عمرو بن العاص یمن اور حبشہ سے حاصل کرتے اور پھر شام و مصر تک لے جاتے تھے۔ اس کے عوض میں ان ہی علاقوں سے کچھ سامان خریدتے اور یمن اور حبشہ میں فروخت کر دیتے تھے حضرت عمرو بن العاص کے سامان میں یمن اور حبشہ کا انگور اور انجیر بھی شامل ہوتے تھے جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے عربوں کی تجارت کا دائرہ قیصر روم کے علاقات تک وسیع

لہ ابو عمر محمد بن یوسف الکندی: کتاب الولاۃ و کتاب القضاۃ طبع لندن گب میموریل ص ۷۔

ہو چکا تھا، اس میں چمڑے کی تجارت کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔ عثمان بن حویرث نے اس تجارت کا پرمٹ حاصل کر رکھا تھا۔ "جمہرۃ نسب قریش" میں ہے: فلما قدم (عثمان بن الحویرث) علیہم (اہل مکہ)، قال: یا قوم إن قیصر قد علمتم أمانکم ببلادہ وما تصیبون من التجارۃ فی کنفہ وقد ملّکنی علیکم، وإنما أنا ابن عمکم وأحد کم وإنما آخذ الجراب من القرظ والعُکّۃ من السمن والإھاب فاجمع ذلک ثم ابعثہ إلیہ[1]

صُحار کے بارے میں اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ ایک تجارتی مرکز تھا۔ یہاں پر یمن سے بکثرت چمڑا جمع ہوتا اور خلیج فارس کے ممالک کے علاوہ ہند کے تاجر بھی یہاں سے چمڑا خرید کر لے جاتے، یہی وجہ ہے کہ یہ شہر بہت ہی دولت مند تھا۔[2]

یورپ و ایشیا دونوں براعظموں میں ایک یہودی قافلۂ تجارت چلا کرتا تھا۔ یہ منظم قافلہ جس میں بحیرۂ روم کے گرد و نواح کے تقریباً ہر قسم کے تاجر شامل ہوتے، جو مغرب اقصیٰ سے چل کر مشرق بعید تک جایا کرتے تھے اور پھر وہاں سے واپس اپنے گھروں کو لوٹتے۔ اس طویل سفر میں وہ جس مقام یا بندرگاہ سے گذرتے برابر خرید و فروخت کرتے چلے جاتے۔ عموماً ان کا راستہ سمندر سے ہوتا تھا۔ اس قافلے میں انھوں نے نہایت اہتمام سے عربی، فارسی، رومی، انگریزی اور دیگر متعلقہ زبانوں کے ماہرین ترجمان رکھے ہوئے تھے تاکہ متعلقہ علاقوں کے عوام سے معاملات کرنے میں کسی قسم کی دقت پیش نہ آئے۔ وہ مغرب سے غلام، چمڑا، سمور، دیباج اور تلواریں لے کر سفر کا آغاز کرتے اور بحیرۂ روم سے گذر کر ساحل کے ساتھ ساتھ عرب، سندھ، ہند اور چین تک چلے جاتے۔ وہاں سے واپسی پر خوشبو، عُود، کافور اور دارچینی خرید کر واپس لوٹتے[3] ایک

---

[1] ابن بکار: جمہرۃ نسب قریش طبع دار المعارف بمصر ص ۴۲۵

[2] ابن حوقل: صورۃ الأرض ص ۳۸

[3] ابن خرداذبہ: المسالک والممالک طبع لیڈن ص ۱۵۳

دوسرے مقام پر ابن خرداذبہ ہی نے بتایا ہے کہ یمن سے چین کی جانب جانے والے سامان میں کپڑا، ورس (رنگنے والی ایک بوٹی)، گدہے اور ٹٹو بھی شامل ہوتے تھے[۱]

یمامہ کا پایۂ تخت "قریہ" حضرموت کی بندرگاہ "قانہ" اور معین اور عدن سبائی تجارت کے مراکز تھے۔ وہ صوبہ گجرات (ہند) کے ساتھ منجملہ دیگر اشیاء کے چمڑے کی بھی تجارت کیا کرتے تھے[۲]

یہ چمڑا جب گجرات اور دوسرے ملحقہ علاقوں میں پہنچتا تو یہاں کے لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اس سے بہت عمدہ جوتے بناتے تھے۔ جو نہ صرف اس علاقے میں بلکہ سندھ کے علاوہ تمام عرب میں مشہور تھے۔ عرب لوگ ان جوتوں کو "نِعال" کنبایتیۃ کہا کرتے تھے[۳]

مہابھارت کا یہ واقعہ ایک عجیب وغریب بات کی طرف اشارہ کرتا ہے، ممکن ہے کسی وقت اس واقعہ کی حقیقت معلوم ہوجائے۔ یہ کہ کسی شخص نے یدھشٹرا کو جو اس وقت کے حاکم تھے، چند تحفے پیش کئے۔ ان میں چمڑا اور سوتی کپڑے تھے[۴] یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحائف عرب کے کسی شخص نے پیش کئے تھے کیوں کہ ہند کے ساتھ عربوں کے تعلقات بحری راستے سے ہزاروں سال قبل مسیح سے موجود ہیں۔ اور پھر جزیرہ نمائے عرب ان دونوں مصنوعات میں دور دور تک مشہور تھا چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ چمڑا اور کپڑے یمن سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بعید نہیں کہ تحفہ لانے والے کا مقصد ہند کے ساتھ تجارتی مراسم قائم کرنا ہو۔ اور وہ اس تحفے کی شکل میں اپنے یہاں کے نمونے (SAMPLES) لے کر آیا ہو۔ یہ بھی امکان ہے کہ اس کے بعد ہند میں یمنی چمڑے کی درآمد کا

---

[۱] ابن خرداذبہ: المسالک والممالک ط لیڈن ص ۱۵۳

[۲] ابوظفر ندوی: تاریخ گجرات ط دہلی ۱۹۵۸ء ج ۱ ص ۱۸۲۔

[۳] المقدسی: احسن التقاسیم ط لیڈن ص ۸۲، ۹۴۔ اور الجاحظ: البیان والتبیین قاہرہ تحقیق عبدالسلام ہارون ج ۱ ص ۱۶۲

[۴] SCHOTT, V.H. THE PERIPLUS OF THE ERYTHREAN SEE (TRADS), NEW YORK, 1912, P. 257

سلسلہ شروع ہو گیا ہو۔ اس لئے کہ ہندوستان میں تب کسی جانور کو ذبح کرنا بہت بُرا فعل سمجھا جاتا تھا اور پھر ان جانوروں سے چمڑے کا حصول تو اور بُرا ہو گا۔

چمڑے کی انڈسٹری اس عہد میں دیگر ممالک میں بھی قائم تھی۔ یورپ میں چند مقامات پر چمڑے کا کام اور کاروبار ہوتا تھا۔ مگر چین میں چرم سازی کا فن خاصہ ترقی یافتہ تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ممالک سے چمڑا دوسرے ممالک کو درآمد کیا کرتے تھے [1]

---

[1] PERIPLUS : P. 171.

بیان ملکیت وتفصیلات متعلقہ برہان دہلی

فارم چہارم قاعدہ ۸

۱۔ مقام اشاعت:۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی	۴۔ ناشر کا نام:۔ حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں
۲۔ وقفہ اشاعت:۔ ماہانہ	۵۔ ایڈیٹر کا نام:۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم اے
۳۔ طابع کا نام:۔ حکیم مولوی محمد ظفر احمد خاں	قومیت:۔ ہندوستانی
قومیت:۔ ہندوستانی	سکونت:۔ علی منزل۔ ڈگی روڈ۔ علی گڑھ
سکونت:۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی	۶۔ مالک:۔ ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۶

میں محمد ظفر احمد خاں ذریعہ ہذا اقرار کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق صحیح ہیں۔

دستخط:۔ محمد ظفر احمد خاں

مورخہ ۱۲ر مارچ ۱۹۷۱ء

لطائفِ اکبری۔ نادر قلمی ملفوظ

خواجہ علی اکبر مودودیؒ (م ۱۲۳۰ھ) کے احوال واقوال

جناب مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی، استاد دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے عشرۂ اول کے ایک بزرگ خواجہ سید علی اکبر مودودی رحمتہ اللہ علیہ جو حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے۔ اپنے عہد میں اودھ میں مرجع خاص وعام اور روحانی پیشوا تھے۔ ان کا عہد اودھ کے نواب وزیر حکمراں خاندان کے دو نامور حکمرانوں، شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کا عہد تھا جو تاریخی، ذہنی ادبی اور علمی اعتبار سے اودھ کا ایک اہم دور ہے خواجہ سید علی اکبر مودودیؒ کا آخری زمانہ جو کم و بیش ۳۵ - ۴۰ سال پر مشتمل ہے، اجودھیا (ضلع فیض آباد) میں گذرا، جہاں وہ بریلی سے آکر مقیم ہو گئے تھے۔ اصلاً وہ دہلی کے رہنے والے تھے، یہاں کئی پشت پہلے ان کے آباواجداد، آبائی وطن چشت سے منتقل ہو کر مقیم ہو گئے تھے، ان ہی خواجہ مودودیؒ کا یہ ملفوظ ہے جو ان کے نامور مرید، خلیفہ اور سگے خالہ زاد بھائی خواجہ سید ابو محمد حسن مودودیؒ متخلص بہ حسن نے (شاگرد جعفر علی حسرت لکھنوی و جرات لکھنوی) مرتب کیا ہے، اس وقت تک اس ضخیم ملفوظ کے صرف دو مخطوطوں کا سراغ مل سکا ہے۔ ایک نسخہ برادر محترم و معظم مولانا محمد میاں فرنگی محلی (جانشینِ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی رحمتہ اللہ علیہ) کے کتب خانے میں ہے جو اس مضمون کے سلسلے میں پیش نظر ہے دوسرا نسخہ خانقاہ کاظمیہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے کتب خانے میں موجود ہے۔

پیش نظر مخطوطہ، بڑے سائز (رجسٹر کے سائز) کے ۸۲۰ صفحات پر مشتمل ہے جسے جلد اول اور جلد ثانی میں نصف نصف تقسیم کر دیا گیا ہے، تحریر جلی قلم، اور مطلا مذہب پیشانی کے ساتھ۔ افسوس یہ ہے

کہ دونوں جلدیں کرم خوردگی کے قریب تر پہنچ چکی ہیں، یہ تو نہیں کہ مخطوطہ پڑھنے کے قابل نہ رہا ہو، بڑی حد تک محفوظ ہے لیکن کچھ صفحات ایسے ضرور ہیں جن کی عبارتیں بیچ بیچ سے کرم خوردہ ہوگئی ہیں، بس اسی حد تک کہ بعض الفاظ نصف یا کل کہیں کہیں سے غائب ہو گئے ہیں. اس طرح عبارت کا تسلسل جگہ جگہ مجروح ہوگیا ہے۔

اس مخطوطے کے آخر میں جو ترقیمہ ہے اس کی ضروری عبارت یہ ہے:۔

"۔۔۔۔ ربیع الثانی سن یک ہزار و دو صد و ہفتدہ (۱۲۱۷ھ)
ملفوظات حضرت پیر و مرشد ۔۔۔ حضرت شاہ علی اکبر
صاحب المودودی قدس اللہ سرہ در بلدۂ لکھنو در عہد
عالی گہر شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ، و وزارت
نواب سعادت علی خاں حسن احتشام بزیر فت
برائے پاس خاطر حاجی حرمین الشریفین حاجی شرف الدین خاں۔
کتابت (کذا) الحروف سید سبحان علی۔"　　تمام شد

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مبیضہ ہے اور کسی دوسرے نسخے سے نقل کیا گیا ہے۔ حاشیہ پر جگہ جگہ تصحیح بھی کی گئی ہے۔ ملفوظ کی زبان فارسی ہے۔ وہی فارسی زبان جو ہندوستان میں علمی تصانیف کی زبان رہی ہے یعنی عربی آمیز لیکن کاتب سید سبحان علی نے املا کی متعدد غلطیاں کی ہیں زیادہ عالم نہیں معلوم ہوتے ہیں۔

جامع ملفوظ خواجہ حسن، کی وفات کو عربی جنتری کے حساب سے پورے ڈیڑھ سو سال گذر چکے ہیں، اور اس مخطوطے کی کتابت کو ۱۴ سال کم دو سو برس، اس طرح جامع ملفوظات کی حیات میں ہی یہ مبیضہ تیار ہو چکا تھا، عجب نہیں کہ جامع ملفوظ خواجہ حسن کی نظر سے گذر چکا ہو۔

صاحب ملفوظ خواجہ سید علی اکبر مودودیؒ بڑے با اثر روحانی پیشوا گزرے ہیں اور جامع ملفوظ خواجہ حسن کے بارے میں تو تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ آدھا شہر لکھنؤ ان کا معتقد تھا، اور سارے

شہر میں "بڑے حضرت" کے نام سے ادبیاً یاد کئے جاتے تھے، خواجہ حسن لکھنؤ ہی میں رہے اور اسی شہر میں ان کا انتقال ہوا۔ پرانے لکھنؤ کے محلہ رستم نگر میں ان کا مزار موجود ہے، خواجہ حسن کی مقبولیت شاہ و گدا میں یکساں تھی۔ اودھ کے حکمران ان کا بے حد ادب کرتے تھے، خواجہ حسن کا قیام، اپنے پیر بھائی نواب محبت خاں محبتؔ (فرزند حافظ رحمت خاں شہید والی ملک روہیل) کے ساتھ لکھنؤ میں رہا۔ جہاں ان کے ایک اور پیر بھائی (ارادت میں) اور استاد (شاعری میں) شیخ قلندر بخش جرأت بھی رہتے تھے۔ جرأت نواب محبت خاں کی سرکار میں ملازم بھی تھے۔

یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کا ملفوظ، جو سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ امیر حسن علا سنجری کا لکھا ہوا ہے۔ جو "فوائد الفواد" کے نام سے تصوفی ادب کا ایک بیش بہا جزء ہے اور ذاتی طور پر مجھے اس ملفوظ سے بے حد لگاؤ ہے، زیر نظر ملفوظ کے لکھنے والے کا نام بھی حسنؔ ہے اور اس میں بھی کچھ ویسی ہی کشش محسوس ہوتی ہے، ماہرینِ تاریخ کے فیصلے کے مطابق ... ہندوستان کے تصوفی ادب کے غیر مستند انبار میں جہاں تک ملفوظات کا تعلق ہے "فوائد الفواد" پہلا ملفوظ ہے جو تاریخی صحت واستناد رکھتا ہے۔ زیر نظر ملفوظ "لطائف اکبری" بھی بلاشبہ مستند اور معتبر ملفوظ ہے بایں معنی کہ

ہر جزوے را از اجزائے ایں دُرِّ آب دار بطریقِ اصلاح از نظر کیمیا اثر جناب زبدۃ العرفا گزرانیدہ، پس آنچہ قابلِ اصلاح بود باصلاح آں پرداختند وآنچہ از قصورِ سمع بہ تحریف آمدہ بدست مبارک ترقیمش (کذا) ساختند الحمد للہ الموفق والمعین۔	اس دُرِّ آب دار (یعنی ملفوظ موسوم بہ لطائف اکبری) کا ایک، ایک جزء جناب زبدۃ العرفا کے (مراد صاحب ملفوظ خواجہ سید علی اکبر مودودی سے ہے) ملاحظے سے گذارا گیا ہے، جہاں جہاں اصلاح کی ضرورت تھی وہاں وہاں انھوں نے اصلاح فرمادی، اور جہاں کہیں سننے میں فرق کی وجہ سے کوئی کمی بیشی ہوگئی تھی وہاں اپنے دست خاص سے صحیح بات تحریر فرمادی (یا اس جگہ ترمیم کردی، اگر "ترقیمش" کے بجائے "ترمیمش" ہو) الحمد للہ

"ملفوظ" کی اصطلاح تصوفی ادب میں بہت متعارف ہے۔ شیخ یا پیر طریقت، مریدوں کے سامنے ارشاد و تلقین سے متعلق جو گفتگو کرتا، یا مریدین کے شکوک و وساوس کے سلسلے میں جو جوابات دیتا۔ ان کو قلم بند کرتے رہنے کی روایت بہت دنوں سے چلی آرہی ہے۔ اسی قلم بند اقوال کو "ملفوظ" کی مخصوص اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے اس کے لفظی معنی بھی "بولے ہوئے" ہی کے ہیں۔

تصوفی ادب میں اس خاص صنف کو خصوصی اہمیت اس وجہ سے حاصل ہے کہ اس کا معاملہ ایک طرح کی "خود نوشت" کا سا ہوتا ہے۔ مسائل تصوف پر جو تصانیف کی گئی ہیں وہ قابل قدر ہونے کے باوجود بہت محدود حلقے کی دل چسپی کی ہیں، انہیں "خاصہ کی چیز" کہنا چاہئے، لیکن ان ہی مسائل کو جب واقعات و واردات کے ضمن میں بیان کیا جاتا ہے، تو ماحول، عہد، افراد اور شخصی رجحان کے عناصر شامل ہو کر انہیں عام دل چسپی کی چیز بنا دیتے ہیں، یہ بیان مسائل بھی ہے، تاریخ بھی، اور شخصیات کا مستند تعارف بھی۔

تاریخی پہلو سے وہ ملفوظات زیادہ مستند سمجھے جاتے ہیں جو شیخ طریقت کی زندگی میں قلم بند ہو کر خود شیخ کے ملاحظے سے گذر چکے ہوں اور صاحب ملفوظ نے اس میں حذف و ترمیم سے کام لیا ہو۔ شیخ کی مجلس میں گفتگو کو سن کر بعینہٖ قلم بند کر لینا عملاً اسی وقت ممکن ہے جب قلم بند کرنے والا مختصر نویسی سے (جو اب باقاعدہ فن بن چکی ہے) واقف ہو۔ ورنہ گفتگو کا خلاصہ یا مفہوم ہی صحت کے ساتھ قلم بند ہو سکے گا۔ سوائے اس مستثنیٰ صورت کے کہ قلم بند کرنے والا فطری طور پر زود نویسی پر قدرت تامہ رکھتا ہو، مختصر نویسی کے فن کے بغیر جب بھی کسی طویل گفتگو کو قلم بند کیا جائے گا تو کمی بیشی اور رد و بدل کا ہو جانا لازمی ہے۔ کبھی تو لکھنے میں اور کبھی سماعت کی کوتاہی کی وجہ سے، کہ پوری بات سننے میں نہ آسکی۔ نیز اگر شیخ کی مجلس ہی میں لکھ لینے کی بجائے مجلس برخاست ہونے کے بعد یادداشت کی مدد سے گفتگو کو قلم بند کیا گیا تو حافظہ کے تفاوت کے ساتھ قلم بند تحریر کا درجۂ صحت و استناد بھی متفاوت ہوگا۔ اور اس صورت میں رد و بدل اور کمی بیشی کا امکان نسبتاً زیادہ ہو جاتا ہے، لیکن اگر یہ تحریر، صاحب ملفوظ کی نظر سے گذر گئی ہے تو کم از کم اصل مفہوم میں

رد و بدل کی درستی ہو جاتی ہے۔ بہر حال لطائف اکبری، اس پہلو سے ایک مستند ملفوظ ہے کہ وہ صاحبِ ملفوظ کی نظر اصلاح سے گذر چکا ہے۔

جامع ملفوظ نے اپنی قلم بند کی ہوئی تحریر کے تین حصے کئے ہیں اور ہر حصہ کو "لطیفہ" قرار دیا ہے۔ لطیفہ علم تصوّف کی ایک اصطلاح بھی ہے، لطیفۂ اوّل میں شیخ کے وہ ملفوظ درج کئے ہیں:۔

کہ دراں مصادر محافل حاضر بود	وہ ملفوظ جو جامع ملفوظ نے خود شیخ کی زبان سے سنے اور وہ خود ان محفلوں میں حاضر تھا۔

لطیفۂ دوم ان ملفوظات کو قرار دیا ہے:۔

در مسموعاتیکہ از زمرۂ یاران صادق الاقوال..... مسموع گشتہ	جو معتبر (صادق الاقوال) پیر بھائیوں یا دوسرے ثقہ حضرات سے سننے میں آئے۔

تیسرا حصہ جن چیزوں پر مشتمل ہے وہ اگرچہ ملفوظ (گفتگو) نہیں ہیں مگر شیخ ہی کے تحریری ارشادات ہیں:۔

رقوماتیکہ در اوراق منتشرہ مبدوہ از قلم حقائق رقم و عبارات جناب زبدۃ العرفاء دیدہ شد	وہ تحریریں جو شیخ کے قلم سے مختلف اور منتشر کاغذوں پر لکھی ملی ہیں اور جو خود ان کی عبارتیں ہیں۔

"یاران صادق الاقوال" سے جو کچھ سننے میں آیا ان کو قلم بند کرتے ہوئے راوی، کے نام کا حوالہ دینا چونکہ اصولاً ضروری ہونا چاہئے۔ اس لئے مرتب نے ابتدائے تصنیف میں چند نام گنا دیئے ہیں۔

مثل سید السادات اخوی نسبتی و طریقی مولوی سید مبارز علی المودودی و مولوی برکت اللہ جون پوری و نواب محبت اللہ	رشتے اور ارادت کے پہلو سے بھائی مولوی سید مبارز علی مودودی، مولوی برکت اللہ جون پوری، نواب محبت اللہ خاں بہادر بن حافظ الملک بہادر شہید

خان بہادر ابن حافظ الملک بہادر شہید و شیخ ابو الفتح و الہ یار خاں و محمد مصطفےٰ خاں و محمد عمر خاں و محمد مستجاب خاں و مرزا فاضل بیگ ابن مرزا وجیہہ و مرزا محمد معتمد فانی و عزیز القدر والشان فخر برادران خواجہ محمد حسین الکہباری، المودودی از اخوان طریقت و مولوی محمد نافع بن مولوی عبد العلی ابن ملا نظام الدین لکھنوی و امثال آں از ثقات۔

شیخ ابو الفتح، الہ یار خاں، محمد مصطفےٰ خاں، محمد عمر خاں، محمد مستجاب خاں مرزا فاضل بیگ ابن مرزا وجیہہ، مرزا محمد معتمد فانی، اور حقیقی چھوٹے بھائی خواجہ محمد حسین الکہباری مودودی، یہ سب پیر بھائی ہیں اور ا جو صادق الاقوال اور ثقہ ہیں مگر پیر بھائی نہیں ہیں) جیسے مولوی محمد نافع بن مولوی عبد العلی (بحر العلوم) بن ملا نظام الدین لکھنوی وغیرہ کے ایسے معتبر لوگ،

سماعی حصۂ ملفوظات (یعنی لطیفۂ دوم) کے زیادہ تر راوی چوں کہ یہی مذکورہ حضرات ہیں اس لئے مقدمہ میں ایک ہی جگہ سب راویوں کے نام درج کرنے کے بعد مرتب نے وضاحت کی ہے۔

در ہر محل بیانِ اسامی ایشاں چوں موجب طوالت کتاب بود باشارہ پرداخت مگر در بعضے مواضع کہ ناگزیر باشد دراں از ایراد نامِ شخص کہ ناقل باشد یا سائل در مسموع و ملفوظ و آں بر سبیل شاذ است،

ہر روایت کے ساتھ مذکورہ راویوں (میں سے ایک کا یا چند کا نام لانا چونکہ کتاب کی طوالت کا باعث تھا اس لیے راوی کے نام کے بجائے صرف اشارے پر اکتفا کرنا پڑی، البتہ بعض مواقع پر اس شخص کا نام لانا، جو مسموع یا ملفوظ کا ناقل ہے یا سائل ہے جس کے جواب میں صاحبِ ملفوظ نے بات کہی ہے، ناگزیر ہو گیا ہے مگر یہ بہت کم ہوا ہے۔

ملفوظ ہی کیا ہر قسم کی روایت کا یہی معاملہ ہے کہ راوی جس حد تک معتبر، سمجھ دار اور ذہین ہوتا ہے اسی اعتبار سے روایت کا درجۂ استناد مقرر ہوتا ہے، اس پہلو سے مذکورہ راویوں پر نظر ڈالنے سے بخوبی

اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ سب کم و بیش معروف شخصیتیں ہیں محض معروف ہی نہیں بلکہ اپنے ساتھ کچھ تاریخی اور علمی پس منظر بھی رکھتی ہیں، پھر مرتب بھی تاریخی حیثیت سے خاصی نامور شخصیت ہے اور صاحب ملفوظ بھی محض شیخ طریقت نہیں بلکہ علمی تاریخ میں ایک جگہ رکھتے ہیں۔

صاحب ملفوظ | نزہتہ الخواطر و بہجتہ المسامع والنواظر کے فاضل مؤلف نے جو صاحب ملفوظ سے رشتہ کا تعلق بھی رکھتے ہیں، صاحب ملفوظ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

الشیخ الفاضل العلامۃ علی اکبر بن اسد اللہ بن امر اللہ الحسنی الفیض آبادی، کان من نسل الشیخ قطب الدین مودود الجشتی رحمہ اللہ ولد ونشأ بدھلی واخذ عن عمہ وشیخہ السید محمد میر الحسنی الدھلوی المشہور بالشیخ بھلن ولازمہ مدۃ حیاتہ فلما مات عمہ المذکور بفرخ آباد ونقل جسدہ الی مدینۃ بریلی اقام بھا مدۃ ثم سافر الی الہ آباد سنۃ احدی وسبعین ومائۃ والف وعکف علی مطالعۃ کتب الشیخ محی الدین بن عربی ثم کتب الشیخ محب اللہ الالہ آبادی علی قبر الشیخ محب اللہ المذکور الواقع علی شاطئ نھر جمن مع اشتغالہ بالحق سبحانہ

شیخ فاضل علامہ علی اکبر بن اسد اللہ بن امر اللہ حسنی فیض آبادی، حضرت شیخ قطب الدین مودود چشتی رح کی اولاد میں تھے، دہلی میں پیدا ہوئے وہیں پلے بڑھے اپنے چچا اور مرشد سید محمد میر حسنی دہلوی سے جو شیخ بھلن کے عرف سے مشہور ہیں تحصیل علوم کی اور ان کی حیات... میں ان ہی کے ساتھ رہے۔ جب مرشد کا فرخ آباد میں انتقال ہو گیا اور ان کی نعش بریلی لائی گئی جہاں تدفین عمل میں آئی تو سید علی اکبر مودودی بھی بریلی چلے آئے، اس کے بعد ۱۱۷۱ھ میں الہ آباد کا سفر کیا اور وہاں قیام کر کے شیخ محی الدین بن عربی کی تصانیف کے مطالعے میں منہمک ہو گئے۔ شیخ ابن عربی کی تصانیف کے مطالعے کے بعد حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی کی تصانیف کا مطالعہ، شیخ الہ آبادی رح کے مزار پر جو دریائے جمنا کے کنارے ہے شروع کر دیا اور عبادت و ریاضت کا سلسلہ بھی ساتھ ہی ساتھ جاری رہا۔

صاحب ملفوظ شیخ علی اکبر مودودیؒ کے سلسلۂ بیعت کا شجرہ نقل کرنے کے بعد صاحب نزہتہ الخواطر لکھتے ہیں:۔

وھو من کبار المشائخ الجشتیہ فی الھند وانتقل من دھلی الی فیض آباد وسکن بھا وحصلت لہ الوجاھۃ العظیمۃ عند الامراء سیکومہ النواب آصف الدولہ وزیرہ حسن رضاخان ویتودد الیہ ویتلقی اشارۃ اتہ بالقبول

شیخ علی اکبر مودودی، ہندوستان کے بڑے چشتیہ مشائخ میں تھے، دہلی سے فیض آباد آکر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ان کا امرا اور حکام کی نظروں میں بڑا وقار تھا، نواب آصف الدولہ (وزیر الممالک) اور ان کے نائب حسن رضاخاں نہ صرف ان کی توقیر کرتے تھے بلکہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور ان کی باتوں کو بسر و چشم قبول کرتے تھے۔

اس سلسلے میں مؤلف نزہتہ الخواطر نے ایک تاریخی واقعہ کا ذکر بھی کیا ہے کہ:

وھو الذی اشار الی الوزیر ان یقیم الجماعۃ للصلوۃ وکانت الشیعۃ الامامیۃ الی ذلک العصر یصلون الصلوۃ المفروضۃ منفردین فاستجاب الوزیر من آصف الدولۃ وامر السید دلدار علی النصیر آبادی ان یتصدی لاقامۃ الجماعۃ فامتثل امرہ سنۃ احدی ومائتین والف،

ان ہی شیخ علی اکبر مودودی نے حسن رضاخاں (آصف الدولہ کے نائب یا وزیر) کو مشورہ دیا تھا کہ شیعوں کی نماز باجماعت کا اہتمام ہونا چاہئے، اس وقت تک شیعہ حضرات فرض نمازیں الگ الگ پڑھتے تھے، حسن رضاخاں نے اس معاملہ میں آصف الدولہ سے اجازت لے کر مولانا سید دلدار علی نصیر آبادی کو (جو بعد کو غفران مآب کے لقب سے مشہور ہوئے)، شیعوں کی نماز باجماعت کی امامت کے لئے مامور کیا، یہ ۱۲۰۱ھ کی بات ہے،

شیعوں کی نماز باجماعت کی ابتدا شیعہ روایتوں کے مطابق بھی ۱۲۰۱ھ سے ہوئی اور پہلے

امام مولانا سید دلدار علی ہی ہوئے تھے یہ بھی متواتر روایت ہے، یہ نئی تاریخی سند مؤلف نزہۃ الخواطر کے واسطے سے دستیاب ہوئی کہ یہ خواجہ علی اکبر مودودی تھے جو شیعوں کی نماز باجماعت کے محرک ہوئے تھے،

مؤلفِ نزہۃ الخواطر سید عبدالحی الحسن رائے بریلوی اس کے آگے لکھتے ہیں:۔

وکان الشیخ علی اکبر من ارباب الوجد والسماع والتوحید الوجودی، وکان یفضل علیا کرم اللہ وجہہ علی سائر الصحابۃ رضوان اللہ علیہم اجمعین صرح بہ فی وصایاہ لجد امی السید مہدی بن الحسن الھنسوی رأیتھا بخطہ

شیخ علی اکبر مودودی، حال قال، اور وحدت الوجود کے مسلک کے عامل تھے۔ نیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر فضیلت دیتے تھے اس کی تصریح ان کی ان وصیتوں میں ہے جو میری والدہ کے دادا کو جن کا نام سید مہدی بن الحسن الہنسوی تھا کی تھیں۔ میں نے خود یہ وصیت ان کے قلم کی تحریر کردہ دیکھی ہے۔

شیخ علی اکبر حال قال کے مسلک کے ہوتے ہوئے بھی صاحب تصانیف تھے، مؤلف نزہۃ نے ان کی چند تصانیف کا ذکر کیا ہے جن میں دو وحدت الوجود کے مسئلہ پر ہیں جن کے نام تنبیہ الغنی اور تسویۃ التسویہ ہیں۔ ایک اور کتاب کا نام "مکاشفات" ہے جو دو جلدوں میں ہے یہ مولانا جامی کی تصنیف نفحات الانس کا حاشیہ ہے۔

شیخ علی اکبر مودودیؒ کا انتقال حسب صراحت مؤلف نزہۃ الخواطر سنہ ۱۲۱۰ھ میں فیض آباد (اجودھیا) میں ہوا اور (وہیں) تدفین عمل میں آئی۔

صاحب ملفوظ کا سال وفات مؤلف نزہۃ الخواطر سے سید خواجہ سید علی اکبر مودودیؒ (صاحب ملفوظ) کے سال وفات کے تعین میں تسامح ہوا ہے۔ خواجہ صاحب کی وفات سنہ ۱۲۱۰ھ سے ایک سال قبل جمادی الاول ۱۲۰۹ھ میں ہوئی تھی جس کو خواجہ مودودی کے خلیفہ اور سجادہ نشین، مرتب ملفوظ خواجہ حسن نے "لطائف اکبری" میں لکھا ہے۔

خواجہ حسن (مرتب ملفوظ) کی رسم سجادہ نشینی ادا ہونے کی تاریخ ۱۷ جمادی الاول ۱۲۰۹ھ روز پنجشنبہ ہے۔

این قلیل البضاعتہ را بتاریخ ہفتدہم شہر جمادی الاولیٰ ۱۲۰۹ھ روز پنجشنبہ لباس باآساس جناب شیخ کامل و مکمل پوشانیدہ بر سجادہ حضور جلوہ گر ساختند	اس ناچیز (مرتب ملفوظ خواجہ حسن) کو ۱۷ جمادی الاول ۱۲۰۹ھ بروز پنجشنبہ جناب مرشد کامل و مکمل کا خرقہ پہنا کر حضور مرشد کی مسند پر سب لوگوں نے بٹھادیا (لطائف اکبری صفحہ ۲۵)

خواجہ علی اکبرؒ مودودی کی وفات کی ۔۔۔۔ صحیح تاریخ اس سے بھی ظاہر نہیں ہوئی اس لئے کہ ۱۷ جمادی الاول کو سجادہ نشینی کی رسم لکھنؤ میں آکر ادا کی گئی تھی اور وفات خواجہ علی اکبر مودودیؒ کی اجودھیا میں ہوئی تھی جہاں سے سب لوگ روانہ ہو کر فیض آباد آئے۔ وہاں سے لکھنؤ آئے۔ اس سفر میں اس زمانے میں جتنا وقت صرف ہوا ہوگا وہ کسی طرح ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ سے کم نہ ہوگا۔

لطائف اکبری میں تاریخ وفات صراحتاً نظر نہیں آئی۔ لیکن مرتب ملفوظ نے اپنے پیر بھائی "جامع علوم منقول و معقول مولوی اولوی محمد اسلم صاحب" کے ایک خواب کو نقل کیا ہے جس میں کہا گیا ہے

اذا غلب علی النوم لیلۃ الجمعۃ من الشھر المذکور لیلۃ الرابعۃ من وفاۃ جنابہ قدس اللہ سرہٗ	اسی مذکور مہینے (جمادی الاوّل) کی جمعہ کی رات کو جو خواجہ علی اکبر مودودی کی وفات کی چوتھی رات تھی جب مجھے نیند آئی۔

یعنی جمعہ کی رات کو جب مولوی محمد اسلم نے خواب دیکھا تو تین راتیں مرشد کی وفات کو گذر چکی تھیں، اس طرح خواجہ علی اکبر مودودیؒ کی وفات شب سہ شنبہ کو ہوئی ہوگی۔

اس خواب کے سلسلے میں مولوی محمد اسلم صاحب کا یہ قول بھی منقول ہے:

والیوم لقت ھذا الرویا عند الحسن فقال	آج میں نے یہ خواب خواجہ حسن سے بیان کیا تو انھوں نے

اکتب ھذا افلذ اکتبت والیوم الخمیس کہا کہ اس کو لکھ دو، اس لئے میں نے قلم بند کر دیا اور آج
وعشر من الشھر الجمادی الاولیٰ ۱۲۰۹ھ (تاریخ تحریر) جمعرات ۱۰ جمادی الاول ۱۲۰۹ھ
یعنی جمعرات کو جب یہ تحریر قلم بند ہوئی تو جمادی الاول کی دس تاریخ تھی اور اس سے قبل جمعہ کی
رات کو جب خواب نظر آیا تو جمادی الاول کی چوتھی تاریخ ہونا چاہئے۔ اور اس سے بھی تین راتیں قبل
یعنی پہلی جمادی الاول شب سہ شنبہ ۱۲۰۹ھ کو خواجہ سید علی اکبر مودودی کی وفات ہوئی اس طرح
وفات کی تاریخ دن مہینہ اور سال کا تعین ہو جاتا ہے اور صاحب نزہتہ الخواطر کی تحقیق سالِ وفات
کے سلسلے میں غلط ٹھہرتی ہے۔ ممکن ہے کہ تاریخ و یوم کی قیاسی تعیین کا حساب جس پر یہاں عمل کیا گیا
ہے سو فی صدی صحیح نہ بھی ہو تب بھی سال وفات بلاشبہ ۱۲۰۹ھ ہے نہ کہ ۱۲۱۰ھ جو صاحب نزہتہ
الخواطر نے قرار دیا ہے۔

نزہتہ الخواطر کے مؤلف نے صراحتاً لکھا ہے کہ خواجہ علی اکبر مودودیؒ صاحب تصانیف تھے انھوں
نے کئی کتابیں لکھی ہیں اور الشیخ الفاضل العلامتہ کے القاب سے انہیں یاد کیا ہے اور اشارتاً لکھا
ہے کہ انھوں نے تحصیل علوم، اپنے مرشد اور چچا سید محمد میر حسنی معروف بہ شیخ بھلن سے کی، اشارتاً
اس لئے کہ "اخذ عن عمہ و شیخہ" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ علوم ظاہری بھی اپنے شیخ سے
حاصل کئے یا صرف علوم باطنی ان سے حاصل کئے اور ظاہری علوم ان سے نہیں کسی اور سے حاصل
کئے۔ شیخ علی اکبر مودودیؒ کے اساتذہ کا ذکر کہیں نہیں ملتا ہے۔ لیکن جب وہ صاحبِ تصانیف تھے
تو صاحب علم بھی تھے اور ظاہر ہے کہ کسب علوم انھوں نے کہیں نہ کہیں ضرور کیا ہوگا۔ جب ہی تو
"الشیخ الفاضل العلامتہ" کے القاب کے مستحق ٹھہرے ہیں، لیکن جامع ملفوظ خواجہ حسن نے اس
بارے میں کچھ اور ہی اشارے کئے ہیں۔

تعلیم و تعلم | خود صاحب ملفوظ نے اپنی تعلیم کے سلسلے میں جو اجمالاً بیان دیا ہے جسے مرتب ملفوظ
خواجہ حسن نے ملفوظ میں قلم بند کر کے صاحب ملفوظ کے ملاحظے میں پیش بھی کیا تھا اس سے یہ اشارہ
ملتا ہے کہ خواجہ علی اکبر مودودیؒ کا علم کسبی نہیں بلکہ وہبی تھا اور انھوں نے کسی خاص استاد

کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا، محض چند ابتدائی کتابیں بچپن میں پڑھی تھیں وہ بھی فراموش ہوگئی تھیں

صاحب ملفوظ کا بیان ہے :-

از محمد آباد بر آمدم بعزم مکۂ مبارک، راہِ
الٰہ آباد گرفتم در منزل بودم مشغول تلاوتِ
قرآن شریف کہ حالے برمن مستولی شد کنتُ
بکیتُ بکاءً شدیداً کہ لغتۃً بجہد دور رفت
پس انچہ می خواندم معنیِ ہمہ را می فہمیدم و
تا آں حال جز از یک باب گلستاں و قدرے
از منطق الطیر یعنی تا حکایت شیخ صنعاں نخواندہ
بودم و آنہم از یاد رفتہ بود بنہجے کہ قوت
مطالعۂ عبارت فارسی نداشتم تا بفہمیدن
مقصود آں چہ رسد و از علم عربی جزم نہ بود
در ایام صغرِ سن بحث اوّل میزان الصرف
خواندہ بودم، پس چوں ایں معنی در خود یافتم
سجدات شکر الٰہی بجا آوردم و برہمیں حالِ
داخل الٰہ آباد شدم و دراں جا روزے چند
بودم شبے عزم مصمم شد کہ فردا ازیں بلدہ باید
برآمد بعد از نماز عشا بر بالین بودم چشم
بستہ دیدم کہ درویشے ایستادہ است بر من
می نگرد و تبسم می کند و می خواند
چوں طہارت نہ بود کعبہ و بتخانہ یکیست

محمد آباد (بنارس) سے مکۂ معظمہ کے قصد سے میں نے
الٰہ آباد کا راستہ اختیار کیا، راستہ میں ایک جگہ قرآن
شریف کی تلاوت میں مشغول تھا کہ ایک خاص کیفیت
میرے اوپر طاری ہوگئی اور میں خوب رویا اور بڑی
جد و جہد کے بعد وہ حالت رفع ہوئی پھر جو کچھ میں پڑھتا
تھا اس کا مطلب بھی سمجھتا جاتا تھا حالانکہ اس وقت
میری تعلیم گلستاں کے ایک باب اور منطق الطیر کی شیخ
صنعاں کی حکایت سے زیادہ نہیں ہوئی تھی اور یہ بھی
فراموش ہو چکی تھی اس حد تک کہ فارسی عبارت کے
پڑھنے کی صلاحیت بھی کھو چکا تھا اس عبارت کا مطلب
سمجھنے کا کیا ذکر، جہاں تک عربی کا معاملہ ہے تو اس سے
بالکل نابلد تھا بچپن میں میزان الصرف کی پہلی بحث (ماضی
مطلق کی گردان) صرف پڑھی تھی جب یہ کیفیت اپنے
میں پائی کہ قرآن شریف کا مطلب از خود سمجھ میں آرہا ہے
تو میں نے شکرانے کے سجدے کئے اور اسی حالت میں
الٰہ آباد پہنچا، کچھ روز وہاں قیام کرنے کے بعد ایک رات
مصمم ارادہ کر لیا کہ کل شہر سے روانہ ہو جاؤں گا (مکۂ معظمہ
کی طرف) عشا کی نماز کے بعد تکیہ پر سر رکھے آنکھیں بند
کئے تھا کہ خواب میں ایک درویش کو دیکھا جو کھڑا مجھے

بیدار گردیدم و در خود اثرے ازاں میل کہ سابق بر زیارت کعبۂ شریفہ داشتم احساس نہ کردم و بعنوان تحصیل طہارت مذکور مشغول گشتم (لطائف اکبری جلد دوم ص۷۶ قلمی)

مگ رہا ہے اور ہنس رہا ہے اور یہ مصرعہ پڑھ رہا ہے۔
"آلودگیوں سے پاک وصاف نہیں تو کعبہ اور بتخانہ جانا یکساں ہے"
جاگ پڑا اس کے بعد محسوس کیا کہ کعبہ شریف کی زیارت کا جو رجحان پہلے تھا وہ اب نہیں ہے، پھر اس طہارت اور پاکیزگی کے حاصل کرنے میں جس کا ذکر درویش کے کلام میں تھا، میں مشغول ہو گیا۔

"طہارت مذکورہ" کا اشارہ یہی بتا رہا ہے کہ فضائل روحانیہ کے حصول میں مشغول ہو گئے اور علوم ظاہری کے کسب کا موقعہ پھر ہاتھ نہیں آیا۔ اگر یہ اندازہ صحیح ہے تو حیرت انگیز ضرور ہے کہ میزان الصرف کی پہلی بحث گلستاں کا ایک باب اور منطق الطیر کے کچھ اجزاء پڑھ کر خواجہ علی اکبر مودودیؒ ایسے دقیق مسائل پر تصانیف کریں اور ملفوظ میں مندرج علمی مباحث پورے عبور و وثوق کے ساتھ چھیڑتے رہیں! سیر، تاریخ، علوم عقلیہ و نقلیہ اور تصوف میں ان کے وسیع مطالعے کا واضح ثبوت ان کے ملفوظ سے بخوبی مل جاتا ہے، وہ عربی کے صفحے صفحے لکھتے ہیں، علما سے نازک ترین مسائل پر بحث کرتے اور ان کو ساکت بھی کر دیتے ہیں۔

ملفوظ کے مرتب نے بھی یہی اندازہ کیا ہے کہ صاحبِ ملفوظ کو ظاہری تلمذ کسی سے نہ تھا اسی سلسلے میں وہ "جامع ملفوظ گوید" کے تحت ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ ایک عالم سے ایک روز خواجہ سید علی اکبر مودودیؒ کے علم وہبی و لدنی کا ذکر آیا، میں نے کہا،

بحسب ظاہر اتفاقِ تحصیل با آنجناب نشدہ الا بابے از گلستانِ سعدی و نبذے از منطق الطیر فرید الدین عطار رحمہما اللہ تعالیٰ تا حکایت شیخ صنعاں عالمے ازیں قصہ آگاہ است اما بالفعل آنجناب عبور بر علوم

ظاہری طور پر ان کو تحصیل علم کا اتفاق نہیں ہوا سوائے گلستانِ سعدی کے ایک باب اور خواجہ فرید الدین عطار کی کتاب منطق الطیر کے کچھ اجزاء کے یعنی شیخ صنعاں کی حکایت تک، اور یہ بات ساری دنیا کو معلوم ہے کہ خواجہ علی اکبر مودودیؒ نے محض اتنا ہی پڑھا تھا۔

متداوله وعبور برحقائق ومعارف حتیٰ که وقتے از اوقاتِ درویشانه بر توریت و انجیل و از دیگراں ادیان والسنه ہم دارند دیگرے رامعلوم ہرچه که از علما و فقرا وغیرہ ذالک از ہر مذہبے وملتے سوال می نمائند جوابِ شافی می یابد الغرض مبالغه دریں باب عبث است۔
(لطائف اکبری قلمی ص۶۰)

مگر اب صورت حال یہ ہے کہ علوم متداولہ پر ان کو عبور حاصل ہے اور حقائق و معارف پر بھی پوری دسترس ہے اور مخصوص کیفیات درویشی کے اوقات میں تو توریت اور انجیل اور دوسرے مذاہب اور دوسری زبانوں سے واقفیت تک کا ان سے اظہار ہوتا ہے دوسروں کو بھی یہ بات معلوم ہے کہ اہل علم اور اہل فقر میں سے خواہ وہ کسی مذہب وملت کے ہوں جس قسم کا سوال کوئی کرتا ہے اس کا اطمینان بخش جواب بھی پاتا ہے پس اس معاملے میں مزید گفتگو عبث ہے۔

مگر یہ صاحب علم مطمئن نہیں ہوئے ان کا کہنا یہ تھا کہ اولیاء اللہ میں سے کسی کو بھی لفظی علم غیب سے نہیں ملا ہے اگر ملا ہے تو صرف معناً ملا ہے، خواجہ حسن (مرتب ملفوظ) نے ایسے کئی اولیاء اللہ کا حوالہ دیا اور کتابوں میں دکھا بھی دیا کہ ان کو علم لفظی (ظاہری) بغیر تلمذ کے نصیب ہوا تھا۔ مگر ہر ایسے حوالے کے بارے میں وہ صاحب یہی کہتے کہ یہ تو علم معنی ہے نہ کہ علم لفظی، اپنی یاد کے مطابق جتنے نام، علم لدنی نصیب ہونے والوں کے تھے جامع ملفوظ نے ان صاحب کو جب سب سے منکر پایا تو اپنے پیر بھائی، نواب محبت خاں بہادر (فرزند نواب حافظ رحمت خاں بہادر والیٔ ملک روہیل) سے پوچھا کہ وہ کوئی ایسا نام بتائیں جس سے مخاطب بھی متفق ہو، نواب محبت خاں نے کہا سوائے پیر و مرشد کے جن کو تمام علوم درسی وغیر درسی حتیٰ کہ توریت وانجیل اور افغانی زبان تک کا علم لفظاً و معناً ہے اور کوئی نام یاد نہیں آرہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد نواب صاحب نے نفحات الانس کے حوالے سے ابو عبداللہ کا نام لیا جو "بابونی" کہلاتے تھے اور کردی الاصل تھے جن کا یہ مقولہ ہے "امسیت کردیاً واصبحت عربیاً" (رات تک میں کردی تھا اور صبح جو ہوئی تو عربی ہو چکا تھا) ان کردی صاحب کا واقعہ یوں ہے کہ یہ شیراز کے ایک مدرسے میں گئے جہاں طلباء آپس میں

علمی بحثیں کر رہے تھے۔ انھوں نے طلبا سے کچھ سوالات پوچھے جو ظاہر ہے کہ فضول قسم کے تھے اسلئے کہ یہ تو جاہل تھے، طلبا ہنسنے لگے، کردی صاحب نے طلبا سے کہا کہ مجھے بھی کچھ پڑھا دو۔ لڑکوں نے دل لگی میں کہا "اگر عالم بننا چاہتے ہو تو ایک کام کرو آج رات اپنے گھر میں چھت سے ایک رسی لٹکاؤ اور اس میں اپنے پاؤں باندھ کر الٹے لٹک جاؤ اور جس قدر ہو سکے" کرنیرہ عصقرہ "کے الفاظ کہے جاؤ تمام علم تمہیں حاصل ہو جائے گا،، کردی صاحب یہ نہ سمجھے کہ لڑکے مسخرہ پن کر رہے ہیں انھوں نے جیسا لڑکوں نے بنایا تھا ویسا ہی کیا حسنِ نیت اور یقین کی صداقت کا یہ ثمرہ ملا کہ وہ عالم اور ولی کے درجے میں راتوں رات پہنچ گئے۔ اب جو کوئی ان سے نازک مسائل دریافت کرتا یہ اس کو اطمینان بخش جواب دیتے اور جو کوئی ان سے بحث کرتا اس پر بحث میں غالب آجاتے۔

لطائف اکبری میں مندرج اس ساری تفصیل سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ سید علی اکبر مودودی کا علم تحصیلی نہ تھا اور اہل کشف کے لئے خواجۂ مودودی تحصیلی علم کی ضرورت بھی نہیں مانتے تھے، اس سلسلے میں ایک دل چسپ مکالمہ خواجۂ مودودی صاحبِ ملفوظ اور ملا محمد ولی فرنگی محلی (مشہور زمانہ ملا حسن فرنگی محلی کے حقیقی بھائی) کے درمیان ہوا تھا جس کی تفصیل لطائف اکبری میں پڑھنے کے لائق ہے اس گفتگو میں بھی صاحب ملفوظ خواجۂ مودودی نے تحصیل علم کے بارے میں اشارتاً وکنایتاً وہی کہا ہے جو ثابت کرتا ہے کہ انھوں نے کسی استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا۔ جامع ملفوظ خواجہ حسن لکھتے ہیں کہ:۔

خدمت فضیلت پناہ مولوی ولی سلمہ اللہ العلی کہ تلمیذ رشید و برادر زادۂ جناب استاذ العلماء مولانا نظام الدین اللکہنوی رحمہ اللہ تعالیٰ و بالفعل در مدرسۂ مولانا مرحوم مدرس قوی خدمت ایشاں ست برائے ملاقات جناب زبدۃ العرفا تشریف آوردند

فضیلت پناہ جناب مولوی ولی سلمہ اللہ العلی جو استاذ العلما ملا نظام الدین لکھنوی (فرنگی محلی) رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے شاگرد رشید اور بھتیجے ہیں اور آج کل ملا نظام الدینؒ کے مدرسے (واقع فرنگی محل) میں بڑے اہم مدرس ہیں زبدۃ العرفاء (خواجہ سید علی اکبر مودودیؒ) کی ملاقات کو تشریف لائے۔

(باقی)

؎ ملا محمد ولی فرنگی محلی ملا نظام الدین فرنگی محلی کے شاگرد رشید تھے مگر "برادر زادہ" (بھتیجے) نہیں تھے ملا ولی کے والد قاضی غلام محمد مصطفیٰ ملا نظام الدین کے سگے بھتیجے تھے یعنی ان کے سب سے بڑے بھائی ملا محمد اسعد بن ملا قطب الدین شہید سہالوی کے بیٹے تھے قاضی صاحب کے بیٹے ملا ولی اور ملا حسن تھے اس طرح ملا ولی ملا نظام الدین کے پوتے تھے) محمد رضا انصاری

ستوھویں قسط

تاریخ طبری کے مآخذ

نوشتہ: ڈاکٹر جواد علی، عراق اکاڈمی بغداد

ترجمہ: نثار احمد فاروقی۔ دہلی کالج دہلی

تاریخ روم الطبری نے تاریخ روم کو تاریخ فارس خیال کرکے اس میں اختصار سے کام لیا ہے چنانچہ ان کے بارے میں جو کچھ تاریخ ایران میں پایا اسے فصول میں یکجا کر دیا۔

مگر فصل جس کا عنوان ہے: "ذکر من ملک من الروم أرض الشام بعد رفع مسیح علیہ السلام الی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی خول النصاری"[1]، یہ بادشاہوں کے نام اور ہر بادشاہ کی مدت حکومت کی فہرست ہے۔ لیکن الطبری نے بادشاہوں کے زمانہ حکومت کو عیسوی سنہ سے ظاہر نہیں کیا ہے جو نصاریٰ کا معمول ہے، نہ اسے سکندر کے وقت سے شمار کیا ہے جیسا کہ بعض مورخین کرتے ہیں، نہ تقویم بصری، کی رو سے، جس کا آغاز اس کے روم میں داخلے سے ہوتا ہے جو ۶۰۱ء میلادی کا واقعہ ہے[2]۔

تاریخ روم کو بھی فارس کی تاریخ سمجھ کر اس میں اختصار کرنا اسلامی مورخوں میں الطبری ہی کی بدعت نہیں ہے بلکہ یہ عام طریقہ ہے جس پر ہر اس مورخ نے عمل کیا ہے جو عام تاریخ، یا تاریخ عجم یعنی ایران و روم کے بادشاہوں کا حال لکھنے بیٹھا ہے۔

اس کا سبب شاید یہ ہے کہ اہل فارس مسلمانوں میں گھل مل گئے تھے مگر کچھ لوگ اپنی پرانی قومیت اور پچھلی تاریخ پر فخر کرتے تھے اور انھوں نے کتب تاریخ کی شکل میں اس قدیم ورثے کو محفوظ رکھا

---

[1] الطبری ۲/۲۵ (طبع مطبعہ حسینیہ مصر) [2] زیدان: العرب الاسلام ۲۰۳/

پھر انہیں عربی زبان میں منتقل کر دیا۔ ادھر رومیوں اور مسلمانوں کا تصادم ہوا۔ ان دونوں کے مذہب اور عقائد میں صریح اختلافات تھے اس لئے یہ رومی اور وہ ایرانی ایک ہی موضوع بن گئے روم کے بادشاہ ملوک یونان اور ملوک رومیہ[1] ہیں جیسے طبری رومہ[2] لکھتا ہے۔ اسی طرح سب مورخ لکھتے ہیں۔ ان سے روم کے قیصر مراد ہوتے ہیں۔ نسابین نے یونان کو آدمی بنا ڈالا ہے جس سے سلسلہ نسب چلا اور اس کی اولاد میں بزنطی ہوا اور ان دونوں کی طرف روم کو نسبت ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ یہ "بنو رومی بن بزنطی بن یونان بن یافث بن نوح[3]" ہیں۔ نسابوں کی ایک جماعت نے انہیں عیصو بن اسحٰق پیغمبر[4] کی اولاد بتا دیا ہے۔ انھوں نے عیصو بن اسحٰق کا نام توراۃ میں پڑھا ہوگا یا کسی اہل کتاب سے سن لیا ہوگا۔ مگر انھوں نے غلطی کی ہے۔ اس کی طرف یونان اور روما کی نسبت میں تو شک نہیں مگر عیصو یا عیسو (ESAU) اور روم کی کوئی نسبت توراۃ میں درج نہیں ہے۔ عیسو[5] تو ادوم[6] ہے جس کی نسل ادومی کہلاتی ہے اور یہ جبل سعیر پر عرب کے مشرق میں آباد تھی جس جگہ یہ آباد ہوئے وہ ادوم کہلانے لگی۔ یہ علاقہ تخوم اور جنوبی کنعان پر مشتمل ہے بعد میں پھیل کر طور سینا اور عرب کے پتھریلے علاقے (العربیۃ الصخریہ) سے متصل ہو گیا۔ یہ وہ علاقہ ہے جسے ادومیوں سے نبطیوں نے چھین لیا اور اس میں بس گئے تو یہ ان کے نام سے منسوب ہو گیا[7]۔ مگر ادوم اور روم میں کوئی نسبی رشتہ یا قرابت نہیں ہے۔ ابن الکلبی سے ایک روایت بیان ہوئی

---

[1] البلدان ۴/۲۲۱ [2] دیکھو فہرست تاریخ طبری (مرتبہ دی غوے) /۱۹، نیز تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء مولفہ حمزہ بن الحسن الاصفہانی / ۴۶

[3] البلدان ۴/۲۲۷ [4] البلدان ۴/۲۳۷۔ اللسان ۱۵/۱۵۰

[5] اس لفظ کے معنی ہیں "اشارہ کرنے والا" یا "کھردرا" قاموس الکتاب المقدس ۲/۱۲۸ HASTINGS P 235

[6] ادوم کے معنی ہیں سرخ۔ یہ عیسیٰ بن اسحٰق کا لقب ہے۔ قاموس الکتاب المقدس ۱/۵۳

[7] قاموس الکتاب المقدس ۱/۵۳ HASTINGS P. 203

ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ روم العیص کی نسل سے ہیں جو عیصو کہلاتا ہے۔ یہ اسحٰق پیغمبر کا بیٹا ہے اس سے قسطنطنیہ کے رومی اور روم کے بادشاہ پیدا ہوئے[1]۔ ہمیں خبر نہیں کہ ابن الکلبی ان کا جوڑ کیسے ملاتا ہے اور اسے یہ نسب کس نے بتایا، غالباً ان لوگوں نے اہلِ کتاب کے مدعیان علم سے یہ روایات لی ہیں جنھوں نے ان راویوں کے لئے جہالت سے گھڑ لیا ہے یا جیسی اس وقت مشہور تھیں ان تک بجنسہ پہنچا دیا ہے۔ گمان دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں ہے۔ یہ ابن الکلبی کی اپنی گھڑنت ہے یا پھر ابن الکلبی جیسوں نے گھڑی ہے جو ایسی من گھڑت باتیں اس لئے شائع کرتے تھے کہ ان کی علمیت کا شہرہ ہو کہ ہر بات سے واقف ہیں اور قدیم تاریخ پر خوب نظر رکھتے ہیں!

میرا خیال ہے کہ نام رکھنے کی یہ توجیہہ عربوں میں روما کی عظمت کے زمانے میں آئی ہوگی جب رومی پادریوں نے اپنا نفوذ بڑے علاقے پر جما لیا جس میں یونانی مقبوضات بھی شامل تھے۔ تو اس وقت ان کے پیرووں کو رومیہ یا رومانیوں کا پیرو کہا جانے لگا۔ یاقوت الحموی نے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا چنانچہ وہ لکھتا ہے: "بعضوں کا کہنا ہے کہ ان کو روم اس لئے کہا گیا کہ یہ شہر رومیہ کی طرف اضافت ہے اور رومی زبان میں اس کا نام رومانس ہے، جب یہ لفظ عربی میں دخیل ہوا تو ان لوگوں کو رومی کہنے لگے[2]۔"

اس سے بھی پہلے المسعودی نے یہ خیال ظاہر کیا۔ اس نے رومیوں کے یونان پر غلبہ حاصل کرنے انہیں اپنے میں شامل کر لینے کی طرف یوں اشارہ کیا ہے: "ان کا نام تو رہ گیا، ان کا ذکر ختم ہو گیا

---

[1] البلدان ۴/۳۲۷۔ اس سلسلے میں دوسری روایات بھی ہیں مگر ان کی کوئی علمی حیثیت نہیں ہے۔ یہ روم کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں بیان ہوتی ہیں۔ التنبیہ والاشراف/۱۰۰

[2] البلدان ۴/۳۳۱۔ رومیہ ہی روم ہے جسے رومیۃ الکبریٰ کہا جاتا ہے اس کا ذکر کتب جغرافیہ میں ہے اسے رومنیس بادشاہ روم نے بنایا تھا۔ تاج العروس ۸/۳۲۱

اور سب مل کر روم ہی کی طرف منسوب ہو گئے ہیں[1]

مورخین نے یونان اور روم کی زبانوں میں بھی فرق کیا ہے۔ ابن ساعد الاندلسی (متوفی ۴۶۲ھ) کہتا ہے[2]: "اور پانچویں امت روم ہے۔ اس قوم کا بڑا ملک ہے، جاہ وجلال والے بادشاہ ہیں، ان کا علاقہ بلاد یونان کے پاس ہے اور ان کی زبان یونان کی زبان سے مختلف ہے۔ چنانچہ یونان کی زبان اغریقی ہے اور روم کی لاطینی۔"

یونان کی وجہ تسمیہ | توراۃ میں یاوان کا نام آیا ہے[3] یہ رافت الرابع کا بیٹا ہے جو یونانیوں کا ابو الآباء تھا۔ اس سے عام طور پر ایونیون (IAON, IONIAN) یعنی (GREEK)[4] مراد ہیں لفظ یاوان (JAVAN) یا (JAON) ہی سے، میرے قیاس کے مطابق، عربوں نے لفظ یونان بنایا ہے اور اس لفظ کا اطلاق ان تمام قبائل پر کرنے لگے جو ہیلاس وغیرہ میں رہتے تھے، اور اس شہنشاہیت کو کہنے لگے جس کا صدر مقام قسطنطنیہ تھا۔ اس لئے ان کے بادشاہوں کو بھی ملوک الیونانیین (یونانی ملوک) کہا گیا تاکہ انہیں ملوک رومیہ سے الگ پہچانا جائے جو روم کے پادری تھے[5]

الطبری نے یونانی، ملک یونان اور یونانی باشندوں کا تذکرہ روم کے بالمقابل کیا ہے[6] اس کا منشا وہ لوگ ہیں جنہیں آج ہم رومان کہتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ سب سے پہلے جس نے قلوبطرہ کے بعد شام پر حکومت کی وہ جایوس یولیوس تھا جو روم کا بادشاہ تھا۔ پھر اغطسس آیا جس نے ۵۶ سال حکومت کی۔ جب اس کی حکومت کو ۴۲ سال گذرے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت اور سکندر کے عروج میں تین سو تین سال کا وقفہ ہے[7] ان سے الطبری ان بادشاہوں کو

---

[1] التنبیہ والاشراف/ ۱۰۰ [2] طبقات الامم (طبع بیروت ۱۹۱۲ء) /۲۳ [3] التکوین: الاصحاح العاشر آیہ ۲۔ واخبار ایام الاول: الاصحاح الخامس۔ ۳ آیہ ۔ [4] قاموس الکتاب المقدس ۲/ ۵۵۷۔ [5] HASTINGS P427

[5] حمزۃ الاصفہانی: تاریخ سنی ملوک الارض والأنبیاء/ ۵ و ۴۵

[6] الطبری ۲/ ۹ [7] الطبری ۲/ ۱۰

مراد لیتا ہے جنہوں نے رومی بادشاہ قلو بطرہ کے بعد شام پر حکومت کی. یعنی اباطرہ رومان۔

الطبری نے تاریخ فارس کی فصلوں میں روم کے متعلق جو باتیں گڈمڈ کردی ہیں اور انہیں ایک ہی لڑی میں پروکر روایتِ واحدہ بنا دیا ہے اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اس معاملے میں اس نے تاریخ فارس کے مصادر پر زیادہ اعتماد کیا ہے یا ان مآخذ سے لیا ہے جو فارسی سے ترجمہ ہو کر آئے۔ اور تاریخ روم یا رومی زبان سے ترجمہ ہونے والی کتابوں سے کم اخذ کیا ہے۔ اس میں ایک خطرہ یہ رہتا ہے کہ اہل فارس رومیوں کے دشمن تھے اس لئے ان کی کتابیں یا فارسی سے ترجمہ ہونے والی کتابیں عصبیت کے اثر سے خالی نہیں ہو سکتیں۔ پھر یہ کہ جن مورخوں نے تاریخ فرس کی طرف توجہ دی یا انکی کتابوں کو فارسی سے ترجمہ کیا وہ سب فارسی الاصل تھے یا اس طبقے کے تھے جس کا میلان فارس کی طرف مشہور ہے اس لئے الطبری نے فارس اور روم کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے قبول کرنے میں ہمیں احتیاط کرنی چاہئے۔

کتابی روایات | بعض روایات کے آخر میں الطبری نے جو عبارتیں یا استدراک درج کیا ہے جیسے: "و أما الروم وکثیر من اہل الانساب"...[1] یا یہ قول: "فیما ذکر الروم"...[2] یا: "فی قول النصاریٰ و اہل الکتب"...[3] وغیرہ۔ یہ طبری نے کتابوں سے اخذ کئے ہیں۔ اس کی عادت ہے کہ لکھی ہوئی کتابوں کے نام چھوڑ جاتا ہے اور صرف ایسے جملوں پر اکتفا کرتا ہے جو اوپر درج ہوئے۔ یہی اس نے تاریخ فرس میں اور دوسرے مقامات پر کیا ہے۔ یہ عبارتیں اس نے کتابوں اور دستاویزوں سے نقل کی ہیں اور رجال پر بھروسہ نہیں کیا اس لئے سند بھی چھوڑ گیا۔

جن مآخذ سے الطبری نے تاریخ روم نقل کی ہے ہمیں لازماً ان کتابوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو روم سے متعلق عربی میں لکھی گئی ہیں یا تاریخ و اخبار کی وہ کتابیں جو یونانی اور لاطینی زبانوں سے ترجمہ ہوئیں۔ یہ خود ایک تحقیق کا موضوع ہے۔ عربی مراجع ابھی تک بہت کم ملتے ہیں اس سلسلے

---

[1] الطبری ۹/۲ [2] الطبری ۱۰/۲ [3] الطبری ۲/۲۵-۵۶

کی بیشتر کتابیں یا تراجم ضائع ہو گئے پھر کتابوں ہیں ان کے نام تک نہیں ملتے اس سے ہم ان کے باب میں بالکل ہی ناواقف ہیں۔

ابن الندیم نے ان کتابوں کا ذکر کیا ہے جو تاریخ یا کہانیوں کے موضوع پر اہل روم نے[1] لکھیں اور وہ عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ ان کتابوں کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصص وحکایات میں تھیں اور ممکن ہے کہ قصہ گویوں، اخباریوں اور ناقلوں کی وضع کردہ ہوں۔ اس کا بیان ہے کہ ان مین ایک کتاب سمس ودمن، کلیلہ ودمنہ کی طرح پر تھی۔ وہ کہتا ہے: "یہ بہت ہی خشک اور اکتا دینے والی کتاب ہے اور شائد کسی کی گھڑنت ہے" کتاب تاریخ الروم کے مولف یا مترجم کا نام ابن ندیم نے نہیں لکھا۔ حمزہ اصفہانی نے یونانیوں کے اخبار میں ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جسے موصل کے پادری حبیب بن بہریز نے تالیف کیا تھا یا یونانی سے ترجمہ کیا تھا۔ اس سے اس نے یونانی بادشاہوں کے سنین اور تاریخیں اخذ کی ہیں[2] یہ حبیب وہی ہے جس نے المامون کے لئے کئی کتابوں کی شرح لکھی تھی[3]

پادریوں کی تصانیف | بعض اور پادریوں نے بھی تاریخ کی کتابیں لکھیں اور ان میں لاطینی ویونانی تصانیف پر اعتماد کیا پھر ان مولفات سے بعد کے مورخین نے اخذ کیا۔

المسعودی (متوفی ۳۴۵ھ یا ۳۴۶ھ) نے کچھ اہل کنیسہ کے نام لکھے ہیں جنھوں نے تاریخ کے موضوع پر کتابیں لکھیں اور اس میں تاریخ روم ویونان سے بحث کی۔[4] ان میں سے بعض سے وہ ملا تھا اور بعض کو اپنے سفروں میں دیکھا تھا مثلاً، سعید بن البطریق جو ابن الفراش کے نام سے مشہور ہے۔ یا بطریرک کرسی مارقس جو اسکندریہ میں تھا۔ اس سے فسطاط (مصر) میں ملاقات ہوئی۔ اس کی ایک کتاب تاریخ عام کے موضوع پر ہے جس میں الراضی باللہ کی خلافت کے زمانے تک کا حال آگیا ہے۔ اسی طرح محبوب بن قسطنطین المنبجی آثناوس راہب مصری، یہ بھی ایک تاریخ

---

[1] الفہرست / ۳۲۵ [2] حمزہ / ۵۵-۵۶ [3] الفہرست / ۳۴۱ [4] التنبیہ والاشراف / ۱۳۲

کی کتاب کا مولف ہے جس میں ملوک روم اور دوسری امتوں کے حالات و واقعات آدم سے لیکر قسطنطین بن ہیلانی تک ہیں۔ اسی طرح یعقوب بن زکریا الکسکری الکاتب اور ابوزکریا ونحا نصرانی وغیرہ۔

اس نے تاریخ کی ایک اچھی کتاب کا حوالہ دیا ہے جسے قنیس المارونی نے لکھا تھا اس میں آفرینش، انبیاء، کتب، امم اور ملوک روم اوران کے اخبار ہیں یہ المکتفی کی خلافت پر ختم ہوتی ہے اس کتاب کی المسعودی نے تعریف کی ہے[1]۔

المسعودی کہتا ہے کہ جن کتابوں میں ملوک روم اوران کے اخبار ملتے ہیں ان کے نسخوں میں اختلاف ہے اور بادشاہوں کے نام اور مدت حکومت کا تعین کرنے میں وہ متفق نہیں ہیں۔ ان میں اکثر رومی زبان میں ہیں۔ یہ نصاری کی ملکی کتابوں میں موجود ہیں[2]۔ حمزہ نے بھی اس اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حمزہ نے تاریخ یونان و روم پر جو کچھ لکھا ہے اس کے سلسلے میں چار ماخذ سے مدد لی ہے۔ ایک تو کتاب اخبار الیونانیین جسے حبیب بن بہریز کی تصنیف یا ترجمہ بتایا ہے دوسری تاریخ کی کتاب جو بغداد کے قاضی وکیع نے لکھی تھی۔ وکیع کہتا ہے کہ اس نے روم کی تاریخ ایک ایسی کتاب سے اخذ کی ہے جسے رومی بادشاہوں میں سے ایک نے لکھا ہے اور بعض مترجموں نے اسے رومی زبان سے عربی میں منتقل کیا تھا اس میں قسطنطین کے ابتدائی زمانے سے سنہ ۳۰۱ھ تک کے حالات املاء سے لکھے گئے جسے ایک رومی شخص نے لکھوایا جو رومی زبان لکھنا پڑھنا جانتا تھا[3]۔ اور بڑی دقت سے عربی زبان بول سکتا تھا۔ احمد بن عبدالعزیز الدلف کا ایک فراش تھا اس کے بیٹے یحیٰی نے ان دونوں کے درمیان ترجمان کا کام انجام دیا اس نے رومی خط[4] میں لکھی ہوئی ایک کتاب اپنے باپ سے سن سن کر عربی میں منتقل کر دی۔

ابو معشر البلخی | تیسری تالیف ابو معشر کی کتاب الالوف ہے[5]۔ یہ جعفر بن محمد بلخی (متوفی ۲۷۲ھ)

---

[1] التنبیہ / ۱۳۲ [2] المروج ۲۶۹/۱ [3] حمزہ / ۴۸ [4] ایضاً [5] حمزہ / ۴۷

ہے جو علم افلاک اور نجوم میں شہرت رکھتا تھا۔[1] اسے یورپ والے ABUMASAR کہتے ہیں۔[2] ابن الندیم نے
کتاب الالوف کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ اسّی مقالات پر مشتمل تھی۔[3] ابن صاعد الاندلسی نے بھی اس کی طرف
اشارہ کیا ہے اور مولف کے بارے میں کہا ہے: "یہ فارس والوں کے حالات اور سارے عجم کی خبروں کا سب سے زیادہ جاننے
والا تھا"[4] بروکلمان کہتا ہے کہ نیشنل لائبریری پیرس میں کتاب الادوار والالوف کا ایک خطی نسخہ موجود ہے۔[5] سوتر
SUTER نے بھی کتاب الالوف فی بیوت العبادات[6] کا حوالہ دیا ہے۔ جس کا ذکر البیرونی (متوفی ۴۴۰ھ) کے ہاں
ملتا ہے۔[7] ابو معشر کی دوسری کتابیں بھی ہیں جن میں سے کچھ لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئیں۔ ان میں ایک کتاب المدخل الکبیر
الی علم احکام النجوم ہے اس کے خطی نسخے دنیا کی مشہور لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں۔[8] اسے جان ہسپلینسس
JOHN HISPAIENSIS نے ترجمہ کیا تھا۔ اسی طرح ہرمانس سکندس HERMANUS SECUNDUS اور دالماتا
نے بھی ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ آگبرگ شہر (AUGSBERG) میں ۱۴۸۹ء میں چھپا تھا۔[9] کتاب القرانات بھی آگسبرگ ہی میں اسی سال
شائع ہوئی تھی۔[10] مقدم الذکر آخری بار ۱۵۱۵ء میں شہر بندقیہ VENICE میں چھپا۔

الطبری نے ابو معشر کا نام نہیں لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس کی کتابوں سے کچھ نقل نہیں کیا کیونکہ حمزہ نے جو کچھ
لکھا ہے وہ الطبری سے مختلف ہے اس سے ظاہر ہے کہ طبری نے ان ماخذ سے حاصل کیا ہے جن سے حمزہ نے نہیں کیا ورنہ یہ اختلاف پیدا نہ ہوتا۔

ان دونوں مورخوں کے اقوال سے اور دوسرے تاریخ نگاروں کے بیانات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ
مسلمان مورخوں نے یونان اور روم کی تاریخ پر خاص توجہ نہیں دی۔ جن مصنفوں کو مجبوراً اس موضوع پر لکھنا پڑا،
کیونکہ یہ بہر حال تاریخ عام کا ایک باب تھا، انھوں نے ثانوی ذرائع پر اعتماد کیا۔ اصلی دستاویزیں اور بنیادی ماخذ
تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی۔ اس لئے کہ یہ مصادر لاطینی، سریانی یا اغریقی زبانوں میں تھے اور اختلاف لسان کی وجہ سے یہ لوگ
ان سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے مجبوراً ترجموں پر بھروسہ کرنا پڑا یا مسلمانوں اور عیسائیوں کی ان تصانیف سے اخذ کیا جو عربی میں مدون ہوئی تھیں

SUTER: A.Z.G.M.W. VOL 31, X.28

[1] ابن القفطی / ۱۵۲، ابن صاعد / ۵۶-۵۷، ابن خلکان: الوفیات (طبع قاہرہ) ۱ / ۱۱۲ - بروکلمان ۱ / ۲۲۱
[2] انسائیکلوپیڈیا / ۹۹ [3] الفہرست / ۳۸۶ [4] طبقات الامم / ۵۶ [5] بروکلمان / ۲۴۵ [7] انسائیکلوپیڈیا / ۱۰۰

[8] PARIS 5902, GARULLAH 1508, BERL. COD. ORIENT, SEMINAR. 46 HALID EF. 541 - YENI - 1193
MESH XVI. 50 ; S. BROCKELMANN. 395

[9] شاید اس عنوان سے چھپی ہے INTRODUCTION IN ASTRONOMIAM ALBUMASARIS OCTO CONTINENS
LIBROS PARTIALES [10] ABUMASAR DE MOGNIS CONJUNCTIONIBUS ET ENNORUM REVOL-
UTIONIBUS ... UM PROFECTIONIBUS OCTO CONTINENS TRACTATUS ENCY I. 100

(قسط ۲۷)

ہندو تہذیب اور مسلمان

از جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب استاذ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

چندل مندل اکبر بادشاہ نے چوپڑ میں گوٹوں کی جگہ انسانوں کا استعمال کر کے اس کا نام چندل مندل رکھا بقول ابوالفضل اکبر بادشاہ خود اس کھیل کا موجد تھا۔ درحقیقت یہ کھیل بھی چوپڑ کی طرح ایک کھیل تھا۔ لیکن اکبر بادشاہ نے اس میں کچھ اصلاحیں کی تھیں۔ اس کی بساط چوکور کے بجائے گول ہوتی تھی جس میں سولہ متوازی الاضلاع حصے ہوتے تھے، ہر ضلع میں تین قطاریں اور ہر قطار میں آٹھ خانے، اور چونسٹھ مہرے استعمال کئے جاتے تھے۔ چار پانسے ہوتے تھے جن کے چار طولانی پہلوؤں پر ایک، دو، دس اور بارہ نقطے نقش تھے۔ سولہ آدمی اس کھیل میں شریک ہوتے تھے اور ہر شخص کے پاس چار مہرے ہوتے تھے۔ مہرے وسط میں جمائے جاتے تھے اور چوسر کی طرح چندل میں بھی داہنی جانب سے چال شروع کرتے تھے۔ ہر مہرے کو پوری بساط طے کرنی پڑتی تھی جس کھلاڑی کے مہرے سب سے پہلے بساط طے کر لیتے تھے، وہ بقیہ پندرہ اشخاص سے شرط کی رقم وصول کرتا تھا اور دوسرا شخص جو کھیل سے فارغ ہو جاتا، چودہ اشخاص سے بازی جیت لیتا تھا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اول شخص کو فائدہ ہی فائدہ ہوتا تھا۔ اور آخری شخص سوائے نقصان کے فائدے کی صورت ہی نہ دیکھتا۔ دوسرے کھلاڑی نفع بھی اٹھاتے اور نقصان بھی برداشت کرتے تھے۔

اکبر بادشاہ اس کھیل کو مختلف طریقوں سے کھیلتے تھے ایک طریقہ یہ تھا کہ اس میں مہرے اسی طرح چلے جاتے تھے جس طرح کہ شطرنج میں اکثر اوقات کھیلا جاتا تھا۔

چندل منڈل میں پندرہ یا اس سے بھی کم اشخاص شریک ہو سکتے تھے جتنے کھلاڑی کم ہوتے

دوسرے گیارہ پتے مثال سابق رنگ کے وزیر کی تصویر، اور ایک سے لے کر دس ہاتھیوں تک کے نقوش سے مزین ہوتے تھے۔

(۳) نرپت یعنی وہ بادشاہ جو اپنی پیادہ فوج کی کثرت و قوت کے لحاظ سے مشہور تھا، جیسے شاہ بیجاپور۔ اعلیٰ پتے پر بادشاہ کی تصویر ہوتی تھی جو تخت شاہی پر بے حد شان و شوکت کے ساتھ وراجمان ہوتا تھا، دوسرا پتہ وزیر کی تصویر سے منقش ہوتا تھا جو ایک صندلی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بقیہ دس پتوں پر ایک سے لے کر دس پیادوں تک کی تصویریں بنی رہتی تھیں۔

(۴) گڈھ پت، اس پتے پر بادشاہ قلعے کے اوپر تخت نشین تھا۔ دوسرے پتے پر وزیر صندلی پر قلعے میں بیٹھا ہوا تھا اور بقیہ دس پتوں پر ایک سے لے کر دس تک قلعوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

(۵) دھن پت: یعنی خزانے کا بادشاہ۔ اس رنگ کے اعلیٰ پتے پر بادشاہ تخت پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے روبرو چاندی اور سونے کے انبار لگے ہوئے...... تھے۔ دوسرے پتے پر وزیر اس طرح صندلی پر متمکن تھا کہ گویا خزانے کا جائزہ لے رہا ہو، بقیہ دس پتوں پر سونے اور چاندی کے ظروف کی ایک سے لے کر دس تک تصویریں نقش کی گئی تھیں۔

(۶) دل پت: جنگ کا بادشاہ۔ اعلیٰ پتے پر بادشاہ تمام اسلحۂ جنگ سے آراستہ تخت پر براجمان تھا اور اس کے گرد سپاہی جنگ کے لباس پہنے کھڑے تھے۔ دوسرے پتے پر وزیر بکتر پہنے ہوئے صندلی پر متمکن تھا۔ بقیہ دس پتوں پر ایک سے لے کر دس تک سپاہیوں کی، جو لباس جنگ پہنے ہوئے تھے، تصویریں نقش تھیں۔

(۷) ناؤ پت۔ جنگی بیڑوں کا بادشاہ، اعلےٰ پتے پر بادشاہ جہاز کے اندر تخت پر بیٹھا ہوا تھا دوسرے پتے پر وزیر جہاز کے اندر صندلی پر بیٹھا تھا اور بقیہ پتوں پر ایک سے لے کر دس تک کشتیوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

(۸) تی پت۔ اعلیٰ پتے پر ملکہ تخت پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی سہیلیاں چاروں طرف

کھڑی تھیں۔ دوسرے پتے پر ایک عورت بطور وزیر صندلی پر متمکن تھی اور بقیہ دس پتوں پر ایک سے لیکر دس تک عورتوں کی تصویریں منقش تھیں۔

(۹) سورپت، اعلیٰ پتے پر دیوتاؤں کے بادشاہ یعنی راجہ اندر تخت پر وراجمان تھے۔ دوسرے پتے پر وزیر صندلی پر بیٹھا ہوا تھا بقیہ دس پتوں پر ایک سے لے کر دس تک دیوتاؤں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

(۱۰) اسرپت۔ جنوں کا بادشاہ۔ اعلےٰ پتے پر حضرت سلیمان علیہ السلام کا سا ایک بادشاہ تخت پر جلوہ افروز تھا، دوسرے پتے پر وزیر صندلی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بقیہ دس پتوں پر ایک سے لے کر دس تک جنوں کی تصویریں منقش تھیں۔

(۱۱) بن پت۔ جنگلی جانوروں کا بادشاہ، اعلیٰ پتے پر شیر کی تصویر تھی جس کے گرد دوسرے جانور کھڑے تھے۔ دوسرے پتے پر وزیر یعنی چیتے کی تصویر بنی ہوئی تھی، بقیہ دس پتوں پر ایک سے لے کر دس تک جنگل کے جانوروں کی مورتیں نقش تھیں۔

(۱۲) آہی پت۔ سانپوں کا بادشاہ، اعلیٰ پتے پر شاہ ماران، اژدہے پر سوار تھا۔ دوسرے پتے پر وزیر بھی ایک سانپ تھا جو اسی قسم کے دوسرے سانپ پر سوار تھا بقیہ دس پتوں پر ایک سے لیکر دس تک سانپوں کی تصویریں منقش تھیں۔

پہلے چھ رنگ بیش بر اور دوسرے چھ "کم بر" کہلاتے تھے۔

اکبر بادشاہ نے گنجفے میں ذیل تغیرات کیے۔

سرخ رنگ کے بادشاہ کی تصویر اس طرح بنائی گئی تھی کہ گویا تخت پر بیٹھا ہوا زر افشانی کر رہا تھا، دوسرے پتے میں وزیر صندلی پر جلوس فرما تھا اور خزانے کا جائزہ لے رہا تھا اور بقیہ دس صفحوں میں عملہ اللہ کی مختلف تصویریں بنائی گئی تھیں۔ مثلاً سنار، گداز گر، مطلس ساز، وزان، ٹکیچی، مہرکن، تنکچی، من، خریدار، فروشندہ، قرض گیر۔

بادشاہ برات کی تصویر ایسی تھی کہ تخت پر جلوس فرما تھا اور فرامین واسناد و دیگر کاغذات

دفتر کو ملاحظہ کر رہا تھا۔ وزیر صندلی پر بیٹھا ہوا دفتر کا کام کر رہا تھا۔ بقیہ دس پتوں پر عملے کی تصویریں تھیں مثلاً کاغذگر، مُہرہ کش، مسطرکش، نویسندہ دفتر، مصوّر، نقاش، جدول کش، فرمان نویس، مجلد رنگریز۔

بادشاہوں کے نام اس طرح تھے، بادشاہ قماش، بادشاہِ چنگ، بادشاہِ زرسفید، بادشاہِ شمشیر، بادشاہ تاج اور بادشاہِ غلامان۔

اکبر بادشاہ گنجفہ اور شطرنج صغیر و کبیر دونوں کھیلوں کو بڑے شوق سے کھیلا کرتا تھا اور بادشاہ کا مقصد صرف یہی تھا کہ بنی نوع انسان کے جوہر طبیعت کا اندازہ فرمائیں اور ان میں اتحاد و یک جہتی پیدا کریں۔ [1]

مغلوں کے عہد کا ترمیم شدہ پتوں کا کھیل اب ہندوستان میں جاری ہے [2]

بہادر شاہ ظفر نے گنجفہ کے بارے میں یہ شعر کہا تھا۔

شوق ہے اس جنگجو کو بازی شمشیر سے ۔۔۔ گنجفہ کا اس لئے اب اسنے سیکھا کھیل ہے

قمار بازی اسلام میں جوا کھیلنا حرام ہے لیکن ہندوستان کے مسلمانوں میں اس کا رواج پایا جاتا تھا۔ وہ لوگ چوسر کے کھیل میں بھی بازی لگاتے تھے۔ گلبدن بانو نے لکھا ہے کہ جس زمانے میں ہمایوں کابل میں تھا تو وہ جوا کھیلا کرتا تھا۔ وہ کھلاڑی عورتوں اور مردوں کو بیس دینار قمار بازی کے لئے دیا کرتا تھا۔ [3] دیوالی کے زمانے میں بھی مسلمان جوا کھیلا کرتے تھے [4]

---

[1] برائے تفصیل دیکھئے۔ آئین اکبری (ا۔ت) ج ۱، ج ۱، ص ۳۶۹۔ ۳۷۴، کتاب فصل الکلام/ ۱۵۷ اب۔ ۱۵۸ ب۔

[2] CROOK WILLIAM: HERKELOT'S ISLAM IN INDIA (L-1921) P. 335

[3] ہمایوں نامہ (ا۔ت) لاہور ۱۹۶۶ء ۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹ نیز دیکھئے آئین اکبری (ا۔ت) ۱۱/ ص ۲۹۲
PURUSH PARIKASH - P. 148

[4] ہفت تماشا/ ۸۳۔ ۸۴

طیور کی لڑائیاں | طیور بازی ہر طبقے کے مسلمانوں میں پائی جاتی تھی۔ ان میں مرغ بازی، بٹیر بازی، تیتر بازی، لگدم بازی، لوا بازی اور طوطے بازی۔ درندوں کی لڑائی جس کا بعد میں ذکر کیا جائے گا، صرف بادشاہ اور امراء تک محدود تھی۔ لیکن طیور کی لڑائی کا شوق ہر امیر و غریب کرسکتا تھا اور ہر شوقین محنت کر کے لڑائی کے قابل مرغ یا بٹیر تیار کر سکتا تھا۔[1]

اسپیر نے لکھا ہے کہ شام کے چار بجے محل کے سامنے کئی سلاطین جمع ہوتے اور اپنے مرغ لڑا کر بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) کی طبیعت بہلاتے تھے۔ اور غالباً یہ روزانہ کا شغل تھا۔[2] پیانٹ کا بیان ہے "ہندوستانی مرغ لڑانے کے بہت شوقین ہیں۔ اور ہم لوگوں کے مقابلے میں وہ لوگ ان جانوروں کو کھلانے اور تربیت کرنے میں زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ وہ مرغ کے ایک پیر میں ایک نکیلا کانٹا باندھ کر لڑاتے ہیں۔ مرغوں کے پر نہیں تراشے جاتے اور ان کو پورے پروں کے ساتھ لڑایا جاتا ہے۔"[3] نوابین اودھ اور انکے عوام کو مرغ، بیٹر اور دیگر طیور کی بازیوں کا بے حد شوق تھا۔ لمسن ڈین نے لکھنؤ میں مرغ بازی اور دیگر طیور کی بازیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس ملک کے باشندے مرغ پالنے اور ان کی تربیت کرنے اور ان کے لڑانے کا بہت شوق

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ گذشتہ لکھنؤ۔ ص ۱۷۴، شباب لکھنؤ / ۱۱۹

[2] TWILIGHT OF THE MUGHAL EMPIRE. P. 79.

بہادر شاہ ظفر نے بٹیر بازی پر ایک پوری غزل لکھی ہے جس کا مطلع یہ ہے:

ایسے شاہیں ہوئے ہیں میرے تیار بٹیر   ماریں شاہین کو اڑا کر یہ جگر دار بٹیر   (دیوان ظفر / ص ۱۱۷)

[3] A VIEW OF HINDOSTAN: 11, P. 246, 270

مصحفی کا یہ شعر بھی بٹیر بازی سے عوام کی دلچسپی کی شہادت پیش کرتا ہے:

یہاں نہ روبہ کی اور نہ شیر کی بحث   رات دن ہے یہی بٹیر کی بحث

دیوان ششم دق۔ رام پور، ص ۱۲۹

رکھتے تھے۔ وہ بازی بد کر رات بھر مرغ لڑاتے تھے[1] نوابین اودھ کی مرغ بازی کے شوق پر تبصرہ کرتے ہوئے پیناٹ نے بیان کیا ہے کہ بعض اوقات وہ انگریزوں سے مرغ لڑاتے تھے اور بازی لگاتے تھے اور کبھی کبھی یہ بازی ایک لاکھ روپے تک پہنچ جاتی تھی[2]۔ جون جوفینی نے ایک تصویر انگلینڈ بھیجی تھی جس میں نواب آصف الدولہ کو مرغ لڑاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر کے پس منظر میں رقص و سرود کی محفل جمی ہوئی تھی[3]۔ جس زمانے میں میر تقی میر نواب آصف الدولہ سے ملنے دربار گئے تھے تو اس وقت نواب مرغ بازی کے شغل میں منہمک تھا[4]

نوابین اودھ ان طیور کی پرورش، اور ان کی غذا میں کافی روپے صرف کرتے تھے ہر چرن داس نواب شجاع الدولہ کے بارے میں لکھتا ہے

"مرغان آنقدر بودند کہ ہزار روپیہ روزانہ خور اینده آنہا بود"[5]

لکھنؤ کے مرغ بازوں کی میر نے ایک ہجو لکھی ہے جس کے چند شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں:

---

[1] A JOWNEY FROM MERUT AND LONDON : P.4

OBSERVCK OIJETC 1 220 نیز ملاحظہ ہو۔ عماد السعادت۔ ص ۱۴۴،

[2] THE VILW OF HINDOOSTAN : II, P. 271

[3] ایضاً۔ ۲/ص ۲۷۱ برائے تصویر ملاحظہ ہو۔

SHAH ALLUM II AND HIS COURT ; TWINING = IRANELS IN INDIA : P.294

[4] میر کی آپ بیتی۔ ص ۱۷۹۔ نوابین بنگال مرغ بازی کا شغل کرتے تھے۔ طباطبائی نے لکھا ہے کہ علی وردی خاں دکھن سے مرغ منگواتا تھا۔ اور موسم سرما میں وہ راج محل کے علاقے میں چلا جاتا تھا۔ سیر و شکار کے بعد وہ شام کے وقت مرغوں کی لڑائی دیکھتا تھا۔ سیر المتاخرین (انگریزی ترجمہ) ۲/ص ۱۱۸

[5] چہار گلزار شجاعی ص ۲۲۱ ب، تفضیح الغافلین ۸۴۔ ۷۹، عماد السعادت ص ۴۸

دلّی سے ہم جو لکھنؤ آئے — گرم پرخاش مرغ یاں پائے
پر و پرزا درست یکساں ہے — مرغِ تصویر کا بھی حیراں ہے
مرغ ہے ایک ایک جیسے کلنگ — قاز و سارس سے جنگ جس کا تنگ
حوصلہ کس قدر ہوا اصل کا — ذکر کیا کرگسِ شتر دل کا
لات کی گھات کر جو مڑ جاوے — نسرِ طائر کا رنگ اڑ جائے
زہرۂ ققنس کا اس خطر سے آب — شب نہ سووے ہراس سے سُرخاب
بکری سا فیلِ مرغ کو مارا — کب شترمرغ سے ہوا چارا
آدمی جو بڑے کہاتے ہیں — مُرغ مارے بغل میں آتے ہیں
سُرخ و سبزوار کے سب مرغ — ہیں شناگستر ایسے تھے کب مرغ
ہو جو کین مرغِ خانگی کے تئیں — مت سُن اس ہرزہ چانگی کے تئیں
لات ماری جو کاٹ کر حلقوم — حیدرآباد تک پڑی ہے دھوم
کھا کے سینے کی مدمی سو وے — نسرِ واقع کا واقعہ ہووے
اڑ گیا حلق کا جو لڑتے پوست — کی صدا مرغ دوست نے ہی دوست

وقر اتنا کہ دیر بچے لیں — جان دے کوئی تخم مرغ نہ دیں
مرغ بازوں سے ساز کر دیکھا — درِ الطاف باز کر دیکھا
ربط رکھا بہت انھوں کے ساتھ — ایک پر مرغ کا نہ آیا ہاتھ

بازی بد بد کے جب لڑاتے ہیں — کانٹے لوہے کے باندھ لاتے ہیں
آیا حلقوم کے کہ حلق کے پار — پھوٹا چھاتی میں ایک لگ کے دوسار
ہاتھ جس مرغ باز کے تھا وہ — پانی کرنے لگا تر آکر وہ

کچھ تو ٹھہرا تو دم دیا اُن نے | بقیہ کرکے رکھ لیا اُن نے
اور جو سست ہو ہوا تھیلا | دونوں بازو کے پرہیے پھیلا

جنے منگل کو پالی کی دھوم | گلیوں میں روزِ حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش | جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش
مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں | سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں

ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ | ایک کہتا ہے بس گیا اب ٹوٹ

طُرفہ ہنگامہ طُرفہ صحبت ہے | بعد نصف النہار رخصت ہے
کھانچے سرپر بغل میں ہارے مرغ | لے گئے جیتے ہارے سارے مرغ
پھر جو روزِ معین آوے گا | نالہ مرغِ سحر سناوے گا
عالم آوے گا گردِ ویسا ہی | گرم ہنگامہ ہوگا ایسا ہی

میر اُن کا نہ ہووے گو قائل
مرغِ معنی پہ وہ بھی ہے مائل[1]

مختصر یہ ہے کہ لکھنؤ کے ہر طبقہ کے لوگ اپنا بیشتر وقت پرندوں کو لڑانے اور اس تماشے کو دیکھنے میں صرف کرتے تھے[2]

---

[1] کلیات میر، ص ۸۰۸ - ۸۱۰، لکھنؤ میں طیور بازی کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ گزشتہ لکھنؤ۔ ص ۱۷۵ - ۱۸۸، شباب لکھنؤ / ۱۱۹ - ۱۲۱

[2] تفضیح الغافلین ص ۴۸ - ۴۹

تبصرے

(۱) تذکرۂ قاریان ہند جلد اوّل صفحات ۲۴۸ قیمت مجلد ۹ روپے | از جناب عماد القرا کرنل مرزا بسم اللہ بیگ صاحب
(۲) " جلد دوم صفحات ۳۶۵ قیمت مجلد ۹ روپے | تقطیع کلاں۔ کتابت و طباعت بہتر۔
(۳) " جلد سوم صفحات ۲۸۰ قیمت مجلد درج نہیں | پتہ:- مصنف۔ ۱۱/۵/۵۷۰ نام پلی حیدر آباد ۔ ۲

مسلمانوں کو قرآن مجید کے ساتھ جو والہانہ عشق و محبت ہے اسی کی وجہ سے ان کو فنِ تجوید و قرأت کے ساتھ بھی بڑا شغف رہا ہے اور اس سے ہندوستان کے مسلمان بھی مستثنیٰ نہیں۔ بلکہ یہاں علما۔ صوفیا اور مشائخ کے علاوہ سلاطین و امراء اور ان کی بیگمات اور شہزادیوں تک نے اس فنِ شریف کے ساتھ جو اعتنا اور اہتمام کیا ہے وہ ہندوستان کا نشانِ امتیاز ہے۔ اس بنا پر یہ فن کسی ایک طبقہ کے ساتھ مخصوص نہیں رہا اور اس لئے تاریخ کے ہر دور میں حضرات قراء کی تعداد اربابِ شریعت و طریقت سے زیادہ رہی ہے لیکن یہ امر انتہائی افسوسناک تھا کہ ہر علم و فن کے لوگوں کے تذکرے لکھے گئے مگر قاریانِ ہند کا تذکرہ مرتب کرنے کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ فاضل مصنف کو جو ایک اعلیٰ فوجی خدمت پر فائز رہنے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہونے کے باوجود بلند پایہ اور ماہر فن قاری بھی ہیں اور جن کے فیضانِ تعلیم و تربیت سے سینکڑوں مرد اور خواتین اس فن کے عالم ہو گئے ہیں۔ انھوں نے "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" کے مصداق اس اہم اور ضروری کام کی طرف توجہ کی اور کم و بیش سولہ برس کی مسلسل محنتِ شاقہ کے بعد تین ضخیم جلدوں میں ایک ایسا تذکرہ مرتب کیا جسے بجا طور پر ہندوستان میں فنِ قراءت کی انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے۔ پہلی جلد میں جو چودہ ابواب پر مشتمل ہے فنِ قرأت اور علم تجوید کے آغاز اور عہد بعہد اس کی ترقی کی

مکمل تاریخ یعنی یہ کہ عہد نبوت میں قرآن مجید کی ترتیب و تدوین کس طرح ہوئی۔ عہد صحابہ میں اس کی کیا صورت ہوئی سبعتہ احرف کے اختلاف کی نوعیت کیا تھی۔ پھر فن کے ائمہ کبار جن پر قرأت سبعہ و عشرہ کا دارومدار ہے۔ ان کے سوانح حیات اور کارنامے۔ اس کے بعد صدی بصدی اس فن میں جو تصنیفات ہوئی ہیں ان کا تذکرہ اور پھر ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر عصر حاضر تک طریقت اور تصوف کے جو سلسلے رہے ہیں ان کو مختلف ادوار میں تقسیم کرکے ہر دور میں اس فن کے ساتھ گرویدگی اور ارباب فن کا تذکرہ۔ یہ سب چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ دوسری جلد کی صورت یہ ہے کہ پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر ۱۳۰۰ھ تک کے زمانہ کو مختلف حکومتوں اور سلطنتوں کے عہد پر تقسیم کیا ہے اور پھر ہر عہد میں سلاطین واعیان حکومت نے اس فن کی جو قدردانی کی اور اس میں فنِ قرارت کے جو اساتذہ یا علما پیدا ہوئے ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قارئین کے لئے یہ امر دلچسپی کا باعث ہوگا کہ اس جلد میں گولکنڈہ اور بیجاپور کے سلاطین کے علاوہ مغل بادشاہوں میں جہانگیر۔ اورنگ زیب۔ عالمگیر۔ شاہ عالم ثانی۔ اکبر شاہ ثانی۔ اور بہادر شاہ ظفر و بیگمات شاہی اور شہزادیوں میں جہاں آرا بیگم۔ ثریا بیگم زیب النساء۔ بدرالنساء۔ اور خادریہ بادشاہ بیگم۔ اور ہمارے زمانے کے مشاہیر میں سر سید احمد خاں۔ مولانا حالی۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد ان سب کا تذکرہ بحیثیت قاری کے کیا گیا ہے۔ تیسری جلد ان قاریوں کے تذکرہ کیلئے مخصوص ہے جو زمانہ حال سے تعلق رکھتے ہیں۔ غرض کہ پوری کتاب بڑی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ پھر فاضل مولف اشخاص و افرادِ متعلقہ کی زندگی کے دوسرے گوشوں، علمی و ادبی کمالات اور اخلاقی و عملی اوصاف کا بھی تذکرہ کرتے گئے ہیں اور زبان و بیان شگفتہ اور سہل ہے۔ اس بنا پر اس کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوگا۔ ارباب ذوق کو اس کی قدرشناسی کا ثبوت دینا چاہیئے۔

مقدمہ شیخ از جناب مولانا محمد شفیع صاحب حجۃ اللہ الانصاری فرنگی محلی۔ تقطیع متوسط ضخامت ۵۲ صفحات۔ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ:۔ مجیدی پریس چٹکا پور۔ کانپور۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح کی عربی اور فارسی میں جو دو شرحیں لکھی تھیں تو ان کے ساتھ مصطلحاتِ حدیث پر ایک رسالہ بھی تصنیف کیا تھا جو مقدمۂ شیخ کے نام سے مشہور اور مشکوٰۃ کے شروع میں مطبوع ہے۔ یہ مقدمہ اربابِ علم واصحابِ مدارس میں متداول اور مقبول ومعروف رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے موضوع پر یہ بھی بہت جامع اور منضبط لیکن بایں ہمہ اس کی حیثیت محض ایک متن کی ہے اور اس بنا پر اس کے بعض مطالب مبہم اور گنجلک ہیں اس لئے بعض علما نے اس کی شرح لکھی ہے اور بعض نے صرف اردو ترجمہ پر اکتفا کیا ہے فاضل مولف نے جو وسعت علم کے ساتھ اپنی دقتِ نظر اور اجتہادِ فکر کے باعث علماء کے طبقہ میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اس رسالہ کا اپنی لکھنؤ کی شستہ ورفتہ اردو زبان میں شگفتہ اور سلیس ترجمہ کیا ہے اس پر حواشی بھی لکھے ہیں اور اس کی شرح بھی کی ہے۔ جہاں تک شرح کا تعلق ہے مولانا نے صرف متن کی عبارت کو نہایت سلجھے ہوئے اور واضح انداز میں بیان کر دینے پر بس نہیں کیا بلکہ جن محدثین کا ذکر آیا ہے ان کا مع سنینِ وفات وغیرہ کے تعارف کرایا ہے اور جہاں بعض عبارتوں کی توجیہہ میں اربابِ فن کے اقوال مختلف تھے ان کو مع حوالہ کے بیان کرنے کے بعد خود اپنی طرف سے ان کی معقول اور مدلل توجیہہ کی ہے جس سے کم از کم مولانا کی طباعی و ذہانت اور جدتِ طبع پر روشنی پڑتی ہے اس حیثیت سے یہ رسالہ مدارسِ عربیہ کے طلبا کے علاوہ فنِ حدیث کے اساتذہ اور علما کے لئے بھی بہت مفید اور بصیرت افروز ہے۔ اور انہیں اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

تذکرۂ مشائخ دیوبند از مولانا مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری تقطیع متوسط ضخامت ۳۴۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد آٹھ روپے پتہ: مدنی دارالتالیف۔ بجنور (یوپی)

اس کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا یہ دوسرا اڈیشن ہے جس میں فاضل مولف نے بقول خود بہت سے مشائخ کے حالات کا اضافہ کیا ہے اور سنینِ وفات کے اعتبار سے ترتیب قائم کی ہے۔ اس طرح اگرچہ قالب وہی ہے لیکن چولا بدلا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر "دیوبند" سے مراد "مسلک دیوبند" لیا جائے (اور موصوف کی مراد بھی یہی ہے) تو یہ دائرہ اتنا وسیع ہو جاتا ہے اور ہر شیخ کے

حالات اور ان کی خدمات اس درجہ گوناگوں اور متنوع ہیں کہ ان کے تذکرے کے لئے کئی ضخیم مجلدات درکار ہیں۔ اور زیر تبصرہ کتاب میں جن بزرگوں کا تذکرہ ہے ان میں متعدد بزرگ ایسے ہیں کہ ان پر مستقل ضخیم کتابیں لکھی بھی گئی ہیں۔ تاہم اس کتاب کی افادیت مستقل بالذات ہے۔ اس میں میاں جی نور محمد صاحب سے لے کر مولانا محمد یوسف صاحب کاندہلوی تک اکتیس ۳۱ بزرگوں کا تذکرہ ہے۔ جس میں ان بزرگوں کے روحانی کمالات واکتسابات کو اصلاً اور دوسرے اوصاف ومحامد کو ضمناً وتبعاً بیان کیا گیا ہے۔ شروع میں ان بزرگوں کی مختلف النوع خدمات پر ایک عام تبصرہ اور درمیان میں دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارن پور کی تاریخ کا بیان بھی ہے۔ زبان شستہ ورفتہ اور سلیس وروان ہے جو کچھ لکھا ہے عقیدت اور محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھا ہے۔ اس بنا پر جگہ جگہ قلم میں جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا ہے۔ اللہ والوں کے حالات وواردات یونہی کچھ کم موثر نہیں ہوتے۔ اس طرز تحریر نے اثر کی شراب کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ ہندوستان میں اسلامی ثقافت کی تاریخ کے ہر طالب علم کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

ولی کامل از مولانا مفتی عزیز الرحمن بجنوری تقطیع متوسط ضخامت ۳۲۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد -/۶ پتہ: مدنی دارالافتا بجنور

یہ کتاب شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندہلوی کی سوانح حیات کی پہلی جلد ہے۔ اس کے شروع میں تو مولانا نے خود اپنے جو حالات املا کرائے تھے بتیس صفحات میں وہ درج کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد لائق مولف نے بارہ ابواب میں پہلے سہارن پور کے کچھ حالات لکھے ہیں اس کے بعد مولانا کے خاندانی حالات۔ ولادت۔ تعلیم وتربیت۔ علم وفضل طریقت اور معرفت۔ اخلاق وعادات۔ مظاہر العلوم سے تعلق اور اس سلسلہ میں مختلف واقعات تبلیغی۔ اور علمی وتعلیمی خدمات اور آخر میں مکتوبات۔ یہ سب چیزیں بیان کی ہیں اس میں شبہ نہیں کہ حضرت شیخ الحدیث کی ذات بابرکات اس دور میں اللہ کی ایک نشانی ہے۔

آپ ان بزرگوں میں سے ہیں جن کی صحبتِ یک نفس بھی دل میں ایمان و یقین کی قندیل روشن کردیتی ہے۔ اس بنا پر آپ کا ایک ایک ملفوظ اور ایک ایک گفتار، بچوں کی سی بھولی بھالی باتوں اور فضول کہانیوں کے پیرایہ میں۔ زندگی کے معنوی پہلو کی حقیقی تفسیر ہوتا ہے اس لئے بقول ائے "ذکرِ حبیب کم نہیں وصل حبیب سے" اس کتاب کا مطالعہ روحانی سرور و نشاط کا باعث ہوگا۔"

سیرت بندہ نواز۔ از جناب سید غلام مصطفیٰ قادری چشتی تقطیع خورد ضخامت ۵۶ صفحات کتابت و طباعت غنیمت۔ قیمت اور پتہ درج نہیں ہے

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز آٹھویں صدی ہجری کے ایک بہت نامور اور بلند پایہ بزرگ تھے۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی سے بیعت تھے۔ سو سے زیادہ رسالے آپ کے چکیدۂ قلم ہیں اور ان سب کے موضوع معرفت و طریقت اور اسرار الٰہی ہیں۔ زیرِ تبصرہ رسالہ دراصل ایک مقالہ ہے جو عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں جناب خواجہ کے روحانی اور عرفانی اوصاف و کمالات کا ذکر ہے۔ اگر مقالہ نگار اپنے مآخذ کا صحیح حوالہ بھی دیدیتے تو مقالہ علمی حیثیت سے بھی معتبر ہوجاتا۔

نوٹ جنوری ۷۰ء کا برہان ۹ مارچ ۷۰ء کو ارسال ہوگا جن حضرات کو اب نہ ملا ہو مطلع فرمائیں منیجر

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

بُرہان

شمارہ ۴	صفر المظفر ۱۳۹۱ھ مطابق اپریل ۱۹۷۱ء	جلد ۶۶

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

النباء العظیم

(۱۸)

شادی بیاہ ایک امرِ طبعی ہے اور موت ایک امر ناگزیر وشدنی لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے ان دونوں چیزوں کو بھی اپنے لئے وبالِ جان اور ایک مصیبت بنالیا ہے اور اس کی وجہ بجز اس کے کوئی اور نہیں کہ انھوں نے اسلامی تعلیمات، اسوۂ حسنہ نبویہ اور سلفِ صالحین کے تعامل کو پس پشت ڈال کر جاہلانہ معتقدات و مزعومات اور غیر اسلامی رسوم ورد بیات کی پیروی کو اپنا شعار بنالیا ہے۔ اس دیندار طبقہ میں جو لوگ دولت مند اور صاحب ثروت ہیں ان کے دل میں یہ ہے کہ جب خدا نے ہمیں دیا ہے تو پھر ہم کیوں دھوم دھڑکے سے اپنی اولاد کی شادی نہ رچائیں اور اس موقع پر اپنے دل کے ارمان کیوں نہ نکالیں۔ یہ لوگ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں کہ شریعت نے ان تقریبات میں اخراجات کی حد بندی نہیں کی ہے اس لئے ہم جو کچھ بھی خرچ کریں ہمارے لئے مباح ہے۔ چونکہ غم وشادی کی تقریبات میں فضول خرچی... اور قسم قسم کی بے اعتدالیوں کا مرض عام ہے جس میں اچھے اچھے دین دار مسلمان مبتلا ہیں اور جس نے تمام معاشرہ کو فاسد اور گندہ کر رکھا ہے اس بنا پر ہم کسی قدر تفصیل سے اس پر گفتگو کریں گے کہ یہ وقت احتساب کا اور اس کے بعد اپنی تعمیر نو کا ہے۔ اگر اب بھی ہماری غفلت کوشی اور حق فراموشی کا عالم وہی رہا تو وقت ہمارے سنبھلنے کا انتظار نہیں کرے گا اور اپنا قافلہ لے کر آگے بڑھ جائے گا، پھر ہماری پسماندگی پر نہ آسمان روئے گا اور نہ زمین کے سینہ سے ہمارے لئے ایک آہ نکلے گی اور ہم اس چمنِ زارِ عالم میں خس وخاشاک کے ان تنکوں کے مانند ہوں گے جن کو تند وتیز ہواؤں نے اڑا کر کسی ویرانے میں لا ڈال دیا ہو۔

الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ وما نزل من الحق ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم وکثیرٌ منھم فٰسقون ○

جو لوگ ایمان لے آئے ہیں کیا انکے لئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے سامنے اور جو اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں [1]

اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس عقیدہ کے بارہ میں ہر مسلمان کا ذہن بالکل صاف ہونا چاہئے کہ کائنات کی ہر چیز کی طرح ہماری جان۔ اولاد۔ مال ومنال۔ جاگیر اور جائداد ان سب کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اور یہ سب چیزیں ہم کو بطور امانت عطا فرمائی گئی ہیں۔ اس بنا پر ہم کو ان سے وہی کام لینے اور انہیں فوائد ومنافع کے حاصل کرنے کا اختیار ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے جائز کر دیا ہے اس سے سر مو تجاوز کرنا امانت میں خیانت ہوگا۔ ہم نہ ان چیزوں کو ضائع کر سکتے ہیں اور نہ ان کا غلط استعمال کر سکتے "جان" ایک ایسی چیز ہے جو ہر انسان کو سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتی ہے اور جس کا مالک وہ بلا شرکت غیرے ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اضاعت نفس اور خود کشی حرام ہے اور اس کے لئے بڑی سخت وعید ہے معصیت۔ بے اعتدالی اور گناہ۔ خواہ کسی قسم کا ہو اس کے محرکات کا تجزیہ کیجئے تو ہر قسم کے قول وقرار اور اقرار کے باوجود اس کی تہہ میں ایک یہی جذبہ واحساس کارفرما نظر آئے گا کہ میرے اعضا میری دولت اور میری زندگی یہ سب میری ہیں اور اس لئے مجھے اختیار ہے کہ اس سے جو کام چاہوں لوں۔ یہ احساس شعوری ہو یا غیر شعوری بہر حال قطعاً غیر اسلامی اور ایمان کی ضد ہے کسی شخص کو اس سے دھوکہ نہیں ہونا چاہئے کہ قرآن مجید میں اموال وانفس کی اضافت لوگوں کی طرف کی گئی ہے اور خدا نے اپنے آپ کو ان کا مشتری کہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بیشک اللہ نے مومنوں سے انکی جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے کیونکہ مستعار کی اضافت بھی مستعیر کی طرف ہو سکتی ہے۔ آپ ایک کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں لیکن جب کسی کو پتہ بتانا ہوتا ہے یا کوئی اور ضرورت ہوتی ہے تو بے تکلف اسے "میرا مکان" بولتے ہیں۔ رہا خدا

[1] اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوں جنکو اس سے پہلے کتاب دی گئی تھی لیکن جب ان پر مدت گذر گئی تو انکے دل سخت ہو گئے اور (اب) ان میں کثرت سے وہ لوگ ہیں جو راہ حق سے منحرف ہیں۔

وَتَاکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلاً لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ ترجمہ:- خبردار، تم لوگ نہ بن باپ کے بچہ کا لحاظ کرتے ہو اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو غریب پروری پر آمادہ کرتے ہو اور وراثت کے مال کو بے تکلف ہضم کر جاتے ہو اور مال سے عشق رکھتے ہو۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۝ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۝ ترجمہ: اور بے شبہ انسان مال کی محبت میں بہت ہی سخت ہے۔ اچھا! تو کیا یہ اس وقت کو نہیں جانتا جب قبروں کے مردے اٹھائے اور سینوں میں چھپائے بھید آشکارا کر دیئے جائیں گے، یاد رکھو! اس روز ان لوگوں کا آقا ان سے خوب واقف ہوگا۔

بخیل کی نفسیات سب سے الگ ہوتی ہیں۔ وہ پیسہ پیسہ پر جان دیتا ہے۔ اپنی پونجی کو بار بار گنتا ہے اور اپنی دولت کو گویا حیات جاوید کا ضامن سمجھتا ہے۔ قرآن کس بلیغ پیرایہ میں بخیل کے دل کا یہ کھوٹ فاش کرتا اور ساتھ ہی سخت وعید بھی دیتا ہے۔

الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ ترجمہ: عظیم ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو مال جمع کر کے رکھتا ہے اور اسے گنتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو مرنے نہ دیگا۔ تو ہاں خوب سن لو۔ یہ شخص دوزخ کی آگ میں ضرور پھینکا جائے گا ایک اور جگہ ارشادِ حق بنیاد ہوا۔

كَلَّا ۖ اِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝ ترجمہ: خبردار! دوزخ کی آگ تو اس بلا کی لپٹ ہے کہ وہ سر کی کھوپڑی تک ادھیڑ کر رکھ دے گی اور جن لوگوں نے حق سے روگردانی کی اور اسے پس پشت ڈالا اور جنہوں نے مال سینت سینت کے رکھا اور اسے خرچ نہیں کیا وہ آگ ان سب کو اپنی طرف کھینچ بلائے گی۔

بلاغت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ عطف خاص علی العام کا مقصد خاص کی اہمیت جتانا ہوتا ہے۔ اس بنا پر "من ادبر و تولی" پر "جمع فاوعی" کو معطوف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو اعمال دانی اللہ سے انحراف و سرتابی کی نشانی ہیں۔ بخل ان سب سے اہم ہے۔ چنانچہ سورۂ مدثر کی جن آیات میں اہل دوزخ

تفریط میں بے اعتدالی ہو وہ بخل اور شح ہے اور اگر جانب افراط میں ہو تو اس کا نام اسراف اور تبذیر ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک حد درجہ مبغوض و مذموم اور اسی لئے ممنوع و حرام ہیں بخل کی نسبت ارشاد ہوا:

ولا یحسبن الذین یبخلون بما آتٰھم اللہ من فضلہ ھو خیراً لھم بل ھو شر لھم سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیٰمۃ (آل عمران)

اور جو لوگ اس دولت میں جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے بخل کرتے ہیں وہ ہرگز اس کو اپنے لئے اچھا نہ سمجھیں بلکہ یہ بخل ان کے لئے بہت برا ہے کیونکہ قیامت کے دن انہیں چیزوں کا جن کا وہ بخل کرتے تھے ان کو طوق پہنایا جائے گا۔

یعنی دنیا میں ان ظالموں نے اپنی دولت کو گلے کا ہار بنا رکھا تو اب آخرت میں بھی یہ ان کے گلے کا ہار رہیگی لیکن کیسا ہار؟ صحیح بخاری میں ہے: زہریلے سانپ کی شکل میں! یہی وعید کسی قدر تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ایک دوسری آیت میں ہے:

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم ۝ یوم یحمیٰ علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم ھٰذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون ۝ (توبہ)

اور جو لوگ سونے چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو کار خیر میں خرچ نہیں کرتے آپ ان کو نہایت دردناک عذاب کا مژدہ سنا دیجئے یہ عذاب اسی دن ہوگا جبکہ ان کے اندوختہ کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا۔ اور پھر اسی سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور کمر کو داغا جائے گا اور کہا جائیگا کہ لو! یہ ہے وہ چیز جس کو تم نے اپنے لئے جمع کر رکھا تھا۔ تو اب اپنی اندوختہ چیز کو چکھو!!

بخل کا اصل سبب یہ ہے کہ بخیل مال سے اس درجہ محبت کرتا ہے کہ اس کی یہ محبت ہر چیز پر غالب آجاتی ہے وہ مال کو ہاتھ کا میل اور زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنیکا ذریعہ نہیں بلکہ اسے مقصود بالذات سمجھتا ہے۔ اس بنا پر قرآن مجید میں بار بار بخل کے اس سبب حقیقی کی سخت مذمت اور انسان کو اس کی اس کمزوری پر شدید تہدید کی گئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا: کلا بل لا تکرمون الیتیم ولا تحٰضون علیٰ طعام المسکین ۝

کی باہمی گفتگو بیان کی گئی ہے ان میں بھی یہ بات صاف نمایاں ہے۔ کچھ لوگ اپنے ساتھیوں سے پوچھیں گے "تمہارے دوزخ میں آنے کا کیا سبب ہوا؟" یہ جواب میں کہیں گے: "ہم نمازی نہیں تھے اور ہم غریبوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور ہم کٹ حجتی کرتے تھے اور ہم روزِ حساب وکتاب کی تکذیب کرتے تھے" ان آیات میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ آخری آیت "وکنا نکذب بیوم الدین" کا عطف آیات سابقہ پر عطفِ بیان ہے یعنی تکذیب بیوم الدین الگ کوئی صفت نہیں بلکہ اس سے قبل جو تین اعمال بیان کئے گئے ہیں انہیں کو روزِ حساب وکتاب کا انکار کہا گیا ہے اور ان میں ایک عمل بخل بھی ہے۔ ظاہر ہے یہ تکذیب زبان سے نہیں بلکہ عمل سے ہے اور مطلب یہ ہوا کہ جو شخص بخیل ہے وہ گویا حشر ونشر کا قائل ہی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جگہ جگہ اس کے لئے جہنم کے شدید عذاب کی وعید بیان کی گئی ہے۔

یہ رذیلت بخل کا ذکر تھا جو قوتِ شہوی کی تفریط سے پیدا ہوتی ہے۔ اب اسراف اور تبذیر یعنی فضول خرچی اور بے موقع خرچ کرنے کی صفت کو لیجئے جو اس قوت کی افراط سے پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے جو مذمت اور جو وعید بخل کے لئے بیان کی ہے وہی اس کے مقابل کیلئے بیان فرمائی ہے۔ سورۂ اعراف میں ارشاد ہے:-

وکلوا واشربوا ولا تسرفوا انہ لا یحب المسرفین۔

اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو بے شبہ اللہ تعالیٰ فضول خرچی کرنیوالوں کو دوست نہیں رکھتا۔

شادی بیاہ اور مرنے جینے کی کسی تقریب کا کیا ذکر! اسراف تو اللہ کے نزدیک اس درجہ مبغوض ہے کہ عبادات اور کارہائے خیر میں بھی گوارا نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

کلوا من ثمرہ اذا اثمر وآتوا حقہ یوم حصادہ ولا تسرفوا انہ لا یحب المسرفین۔ (انعام)

درخت میں جب پھل آجائیں تو تم کھاؤ اور جب فصل کٹے تو اسکا جو حق ہے وہ ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ فضول خرچی کرنیوالوں کو پسند نہیں کرتا

مشہور حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی پوری جائداد اللہ کے لئے وقف کرنی چاہی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی اجازت نہیں دی اور فرمایا "تیری اپنی جان اور تیرے اہل وعیال کا بھی تو تجھ پر حق ہے"۔ اب اس شخص نے جائداد نصف کردی تو حضور نے اس کی بھی اجازت نہیں دی اور وہی فرمایا جو پہلے فرمایا تھا لیکن اس کے بعد جب اس شخص نے ایک تہائی جائداد کا ذکر کیا تو آپ نے اس کی اجازت عطا فرمادی۔ قرآن مجید

کی ایک اور آیت میں مصارف خیر کا ذکر ہے لیکن ساتھ ہی فضول خرچی کی ممانعت بھی ہے: وآت ذا القربی حقہ والمسکین وابن السبیل ولا تبذر تبذیرا ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین وکان الشیطٰن لربہ کفورا (بنی اسرائیل)

ترجمہ: اور رشتہ دار، غریب اور مسافران سب کو ان کا حق ادا کرتے رہو اور فضول خرچی نہ کرو بے شبہ فضول خرچی کرنے والے شیاطین کے بھائی ہوتے ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا سخت ناشکرا ہے۔ جو لوگ شیطان کے بھائی ہوں اور اللہ ان کو ناپسند کرتا ہو۔ ظاہر ہے ان کا ٹھکانہ دوزخ کے سوا اور کہاں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اسکو صراحت کے ساتھ بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ فرمایا گیا: وان المسرفین ھم اصحب النار (المومن) ترجمہ: اور حد سے تجاوز کرنے والے ہی تو دوزخ والے ہیں۔ جب اسراف اور بخل دونوں صفت کفر اور اسی لئے مستوجب عذاب ہوئیں تو اب لامحالہ جو ان کے درمیان کا راستہ ہے وہ ایمان کا طریقہ ہوگا۔ چنانچہ سورۂ الفرقان میں اس کی صریح نشاندہی کی گئی ہے۔ والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالک قواما۔ ترجمہ: اور یہ (مومنین) جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ کھینچ تان برتتے ہیں بلکہ اعتدال اور میانہ روی سے کام لیتے ہیں۔

آہ! ہم کتنے بے خبر اور غافل ہیں کہ کتاب الٰہی کی ان تصریحات اور وعید کے باوجود اپنی من مانی کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام و ہدایات پر عمل کرنے کا جذبہ ہماری خواہشات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "آج بھی لوگ شادی بیاہ اور خوشی و غم کی تقریبوں میں اس قسم کی فضول خرچیوں کے مرتکب ہوتے ہیں وہ قرآن کی اصطلاح میں شیطان کے بھائی کہلائے گئے"۔ (سیرت النبی ج ۶ ص ۳۱۲) یہاں تک کہ جو گفتگو اسراف و تبذیر پر ہوئی ہے وہ دراصل ان کے رذیلت اخلاقی کی حیثیت سے ایک عام گفتگو تھی لیکن شادی بیاہ کی تقریبات میں جو فضول خرچی ہوتی ہے مختلف اعتبارات سے اس کی نوعیت ایک خاص قسم کی ہے جس کے باعث اس کے اثرات بد کسی ایک شخص یا گھرانہ تک محدود نہیں رہتے بلکہ پوری سوسائٹی اور معاشرہ کو متاثر کرتے ہیں اور اس کی قباحت و شناعت یک گونہ نہیں بلکہ چند در چند ہوتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ فضول کی اس نوع خاص پر مستقل گفتگو کی جائے اور اسکی ہیئت ترکیبی کا تجزیہ کر کے اس کے ہر ہر جز کی ضرر رسانی پر روشنی ڈالی جائے۔ اس کے بعد ہم اس پر گفتگو کریں گے کہ میانہ روی جس کو قرآن "وکان بین ذالک قواما" کہتا ہے وہ کیا ہے؟

کلوروفل اور قرآن

۱۔ سائنس اور قرآن۔ ایک نظر میں

جناب مولوی محمد شہاب الدین ندوی۔ فرقانیہ اکیڈمی چک بانادر بنگلور نارتھ

قرآن حکیم کا نظام دلائل قرآن مجید شعر و شاعری، ہندسہ و ریاضی، منطق و فلسفہ، تاریخ و جغرافیہ معاشیات و سیاسیات اور سائنس اور ٹکنالوجی وغیرہ کسی مخصوص دینوی علم و فن کی کتاب نہیں ہے۔ اس کا اصل اور بنیادی موضوع عالم بشری کی فکری و اعتقادی اصلاح اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں ہر حیثیت سے اس کی ہدایت و رہنمائی ہے۔ مگر دیگر فرسودہ مذاہب کی طرح اسلام مخصوص لوگوں کے جذبات سے اپیل نہیں کرتا اور اپنے نظریات و تصورات کو لوگوں کے دل و دماغ پر زبردستی مسلط نہیں کرتا۔ اور دوسری حیثیت سے وہ غیر معقول اور خلافِ عقل عقائد کی تعلیم نہیں دیتا جیسے عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث و کفارہ یا پارسیوں کے عقیدہ ثنویت (DUALISM)[1] یا شیعوں کے عقیدۂ بدا وغیرہ کا حال ہے۔ بلکہ وہ تمام معاملات میں عقل و خرد اور سوچ بچار سے کام لینے کی دعوت دیتا ہے۔ اور اپنے پیش کردہ عقائد و تعلیمات کے اثبات کے لئے ہر قسم کے علمی و عقلی اور آفاقی و انفسی دلائل نہایت انوکھے اور دل نشیں طرز میں بیان کرتا ہے۔ جن کے لحاظ سے انسانی ذہن و دماغ میں پیدا ہونے والے تمام شکوک و شبہات رفع ہو جاتے ہیں اور کسی قسم کی پیچیدگی یا غیر معقولیت باقی نہیں رہتی یہ اسلام کی ایک بہت بڑی خصوصیت

---

[1] یہ عقیدہ کہ دنیا میں خیر و شر کی الگ الگ حکومتیں قائم ہیں۔ خدائے خیر (یزدان) الگ ہے اور خدائے شر (اہرمن) الگ۔ اور ان دونوں میں ہمیشہ کش مکش اور آویزش برپا رہتی ہے۔ ایک کے قبضہ میں روشنی اور جملہ حسنات ہیں تو دوسرے کے قبضہ میں تاریکی اور تمام سیئات۔

ہے جس کا مقابلہ اس صفحۂ ارض پر کوئی دوسرا مذہب یا صحیفہ ہرگز نہیں کرسکتا۔

شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ھدی للناس وبینٰت من الھدیٰ والفرقان:۔ ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔ وہ نوع انسان کے لئے ہدایت نامہ ہے (جس میں نوع انسانی کی) رہبری اور حق و باطل میں فرق و امتیاز کے دلائل موجود ہیں (بقرہ: ۱۸۵)

ان فی ذالک لذکری لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید: اس میں ایک بہت بڑی یاددہانی موجود ہے ہر اس شخص کے لئے جو قلب (سلیم) رکھتا ہو یا توجہ کے ساتھ اس کی نصیحت پر کان دھرتا ہو (ق: ۳۷)

وننزل من القرآن ماھو شفاء ورحمۃ للمومنین: اور ہم قرآن کے ذریعہ ان مضامین کو اتارتے ہیں جو (ہر قسم کے قلبی امراض کے لئے) شفاء اور اہل ایمان کے لئے رحمت ہیں (بنی اسرائیل: ۸۲)

اسلامی عقائد و ایمانیات میں توحید، رسالت اور معاد (یوم جزاء) کے تصورات نہایت اہم اور معرکہ آراء نوعیت کے حامل ہیں۔ کیوں کہ اخلاق و کردار کی درستی اور تمام اعمال صالحہ پر عمل پیرائی کا دارومدار انہیں تصورات پر ہے۔ اس لئے قرآن مجید میں ان امور کے اثبات کے لئے بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور اس سلسلے میں وہ تمام طریقے استعمال کئے گئے ہیں جو ممکن ہو سکتے ہوں۔

ولقد صرفنا فی ھذا القرآن لیذکروا ومایزیدھم الانفورا: اور ہم نے اس قرآن میں (ہر بات) مختلف اسالیب میں بیان کی ہے تاکہ لوگ اس سے سبق حاصل کرسکیں۔ مگر منکرین حق کے لئے ان مضامین سے دوری ہی بڑھتی جائے گی (کیوں کہ قبول حق ان کے لئے بہت شاق گذرتا ہے (بنی اسرائیل: ۴۱)

ولقد صرفنا للناس فی ھذا القرآن من کل مثل فابی اکثر الناس الا کفورا: اور ہم نے نوع انسانی کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں پھیر پھیر کر (مختلف پیرایوں میں) بیان کردی ہیں مگر اکثر لوگوں کو (حق و باطل کے راستوں کی وضاحت کے بعد بھی) کفر ہی پر اصرار رہتا ہے (تاکہ وہ

بے راہ روی کی روش اپنا کر من مانی کر سکیں (بنی اسرائیل : ۸۹)

قرآن عظیم کا مشن یہ ہے کہ وہ حق بات کو پوری طرح اجاگر کر کے نوع انسانی پر اتمام حجت کر دے جس کے بعد مزید کسی قیل و قال کی گنجائش مطلق نہ رہ جائے۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ بنی آدم حق بات اور اس کے دلائل کو تسلیم کریں یا نہ کریں۔ ارادہ و اختیار کی آزادی عطا کرنے اور غور و فکر کی دعوت دینے کا مقصد بھی اتمام حجت ہی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے قرآن کریم محض علمی و عقلی دلائل ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ نظام کائنات سے متعلق ہر قسم کے آفاقی و انفسی (سائنٹفک) دلائل بھی توحید، رسالت اور معاد کی صحت و صداقت کے ثبوت میں فراہم کرتا ہے۔ حسب ذیل آیات کا یہی مطلب ہے:

سنریھم ایٰتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق : ہم ان منکرین کو اپنے نشانات و دلائل دکھا کر رہیں گے ان کے چاروں طرف (مختلف مظاہر کائنات میں) بھی اور خود ان کی ہستیوں (ان کے طبعی و فطری اور نفسیاتی احوال و کوائف) میں بھی تا آنکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ کلام برحق ہے۔ (حم سجدہ : ۵۳)

خلق الانسان من عجل سأوریکم الخ .... : انسان کی سرشت میں (نفسیاتی طور پر) بڑی عجلت پسندی رکھ دی گئی ہے۔ میں عنقریب تم کو اپنے نشانات و دلائل دکھا دوں گا۔ لہٰذا تم جلدی مت کرو۔ (مومن : ۸۱)

آیات الٰہی کیا ہیں | اس لحاظ سے قرآن حکیم میں نظام کائنات اور علوم سائنس سے متعلق جو آیات مذکور ہیں وہ ان ہی اغراض و مقاصد کے افہام و تفہیم کی غرض سے ہیں۔

ان فی السمٰوات والارض لاٰیٰت للمؤمنین ۝ وفی خلقکم وما یبث من دآبۃ اٰیٰت لقوم یوقنون ۝ واختلاف الیل والنھار وما انزل اللہ من السمآء من رزق فاحیا بہ الارض بعد موتھا وتصریف الریٰح اٰیٰت لقوم یعقلون ۝ تلک اٰیٰت اللہ نتلوھا علیک بالحق، فبای حدیث بعد اللہ واٰیٰتہ یؤمنون ۝ ویل لکل افاک اثیم ۝ یسمع اٰیٰت اللہ تتلیٰ علیہ ثم یصر مستکبرا کان لم یسمعھا

فضہ ۵ بعد اب الیمہ ۵

بے شک ارض وسماوات میں ایمان لانے والوں کے لئے نشانات ودلائل بکھرے ہوئے ہیں۔ خود تمہاری اور دیگر جانداروں کی خلقت میں بھی یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں موجود ہیں۔ رات دن کے ہیر پھیر میں اور اس رزق (پانی جو ذریعہ رزق ہے) میں جس کو وہ اوپر سے برسا دیتا ہے پھر اس کے ذریعہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے (خشک زمین کو سرسبز و شاداب بنا دیتا ہے) اور ہواؤں کے (نظام) ادل بدل میں بھی سمجھنے والوں کے لئے نشانہائے (قدرت) موجود ہیں۔ یہ اللہ کی آیات ہیں جن کو ہم ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ تو پھر اللہ اور اس کی آیات ونشانات کے بعد یہ لوگ آخر کس بات پر ایمان لا سکیں گے؛ خرابی ہے ہر اس شخص کے لئے جو جھوٹ اور گناہ پر کمر باندھ چکا ہو۔ جو "آیات اللہ" کو ـــــ جو اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ سنتا تو ہے مگر پھر تکبر ہی پر اڑا رہتا ہے، گویا کہ کچھ سنا ہی نہیں۔ تو ایسے شخص کو ایک دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔

(جاثیہ: ۲ ـــ ۸)

قرآن کی اصطلاح میں "آیات" یا "آیات اللہ" کا اطلاق چار چیزوں پر ہوتا ہے:

۱۔ قرآنی آیات

۲۔ احکام واوامر

۳۔ معجزات انبیاء

۴۔ نشانات ودلائل

لفظ آیات "آیۃ" کی جمع ہے جس کے معنی ظاہری یا واضح نشانی (SIGN) کے ہیں۔ یہ نشانی اگرچہ مکمل دلیل نہیں ہوتی۔ مگر واضح طور پر (منطقی) دلیل کی رہنمائی کرنے والی ہوتی ہے[1]۔

---

[1] مفردات القرآن، ص ۱۲، از مولانا فراہی رح

اس سے مراد وہ علامات قدرت اور نشانات الٰہی ہیں جو صحیفہ فطرت کے اوراق پر منقش ہیں، جن سے خدا کے وجود، اس کی قدرت و وحدانیت، ربوبیت و رحمانیت اور حکمت و منصوبہ بندی کا حال آشکارا ہوتا ہے اور جن سے رسالت اور یوم آخرت کی شہادت و گواہی فراہم ہوتی ہے۔ ان خدائی نشانات و دلائل میں سے جو چیزیں انسان کی ذات اور اس کی سرشت سے متعلق ہیں۔ ان کو دلائل انفس کہا جاتا ہے اور جو نشانات قدرت انسان کے چاروں طرف مختلف مظاہر (حیوانات و نباتات اور جمادات و افلاک) کی ساخت و پرداخت اور ان کے تحیر خیز نظامات کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں انہیں دلائل آفاق کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سائنٹفک تحقیق و ریسرچ سے جس قدر بھی دلائل و شواہد فراہم ہوں وہ اصولاً ان ہی دو اقسام میں محصور ہوں گے اور آفاقی و انفسی دلائل ہی کا دوسرا نام "آیات اللہ" ہے۔

غرض اس وقت میرا موضوع بحث اسی قسم کی ایک آفاقی یا تکوینی (NATURAL) "آیت" (کلوروفل[1]) سے ہے۔ جس میں توحید و رسالت اور یوم جزاء کے اثبات کے واضح دلائل اور نہایت حیران کن اسباق و بصائر موجود ہیں۔ یہ ایک ایسا مجموعہ عبر و بصائر ہے جس کے لاحظہ سے مادیت (MATERIAL-ISM) کے تار پود بکھر جاتے ہیں، نیچریت (NATURALISM) پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ اور تشکیک و لاادریت وغیرہ تمام گمراہ کن فلسفوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

کلیسا اور مادیت یوں تو مادہ پرستی یا دہریت زمانہ قدیم سے کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے۔ مگر یہ وبا جس عالمگیر پیمانے پر آج پھیلی ہوئی ہے اس کی مثال گذشتہ ادوار میں نہیں ملتی۔ موجودہ الحاد و لادینیت کی آفاق گیر نشر و اشاعت کلیسا (چرچ) کی ناعاقبت اندیشی کا براہ راست نتیجہ ہے۔ یعنی کلیسا نے علم و تحقیق کے خلاف صدیوں تک جبر و استبداد، شقاوت و بربریت اور روح فرسا

---

[1] اس سے مراد وہ خضرہ یا ہرا رنگ ہے جو دنیائے نباتات کا لازمی عنصر ہے۔ اس کی بنا پر پیڑ پودے ہرے بھرے اور سرسبز و شاداب دکھائی دیتے ہیں۔

مظالم کا جو مظاہرہ کیا تھا، الحاد و مادیت اسی کا رد عمل ہے۔ کلیسا کے مظالم اور جیرہ دستیوں سے تنگ آکر اہل علم (سائنس دانوں) نے مذہب کے خلاف بغاوت کردی اور الحاد و دہریت کے نقیب و ہمنوا بن گئے۔ کیوں کہ وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ عیسائی مذہب میں علمی ترقیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ کلیسا ہر نئی تحقیق پر کفر و ارتداد کا فتوی صادر کرتا ہے۔ جو صاف و صراحتاً رویت و مشاہدہ اور واقعات و حقائق کا انکار ہے، بلکہ تحقیق و تجربہ اور علمی سرگرمیوں کا گلا گھوٹنے کے مترادف بھی۔ غرض کلیسا کے "خدائی فوجداروں" نے محض اپنے نام نہاد مذہبی تقدس اور اس کی بالادستی کو قائم رکھنے کی خاطر بے شمار محققین اور سائنس دانوں کو بلا وجہ مجرم قرار دیا اور انہیں ایسی اذیت ناک سزائیں دیں جن کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں

جب لوگوں نے دیکھا کہ عیسائی مذہب عقل و مشاہدہ، تجربہ و اختیار اور واقعات و حقائق کا نہ صرف انکار کرتا ہے بلکہ "نئے نئے خیالات" پھیلانے کے جرم میں اہل علم کی گردنیں بھی اڑاتا ہے۔ تو انھوں نے اپنے کندھوں پر سے مذہب کا جوا ہی اتار پھینکا اور صاف صاف اعلان کر دیا کہ مذہب سراسر غیر علمی و غیر معقول نظریات و توہمات کا مجموعہ ہے، جن کو عقل و قیاس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے[1] یہ کلیسائی رویہ کا منطقی نتیجہ اور مثبت رد عمل تھا جس نے آگے چل کر خدا بیزاری کی عالمگیر شکل اختیار کرلی۔ اور جس کے تباہ کن اثرات آج پورے انسانی معاشرہ پر پڑ رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس خدا بیزاری کی وجہ سے تہذیب انسانی کے باقیات اور اس کی کل اخلاقی قدروں کو آج زبردست خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

اسلام کا کارنامہ یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ عیسائیت کے پھیلائے ہوئے مذکورہ بالا زہر

---

[1] یہ بات صرف عیسائیت پر ہی صادق آتی ہے۔ ورنہ اسلام تو ایک سراسر علمی و عقلی مذہب ہے جو نہ صرف ہر قسم کی دنیوی ترقیوں کے دروازے کھلے رکھتا ہے بلکہ اس کی ہمت افزائی بھی کرتا ہے جیسا کہ اگلے صفحات سے ظاہر ہوگا سائنس کی موجودہ ترقی بھی دراصل اسلام ہی کی انوکھی دعوت کا منطقی نتیجہ ہے۔

کا تریاق صرف اسلام کے "خزانۂ عامرہ" میں موجود ہے۔ گویا کہ عیسائیت کا "قرضہ" اسلام اپنی "جیب" سے ادا کر رہا ہے اور اس کی پھیلائی ہوئی مضرتوں اور گمراہیوں کا دفیعہ کر رہا ہے۔ اسلام سائنس کی ترقیوں کا داعی و نقیب رہا ہے جس کی راہ میں روڑے اٹکا کر عیسائیت نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج موجودہ خدا بیزار معاشرہ کا دماغی و روحانی آپریشن کر کے اس کے دل و دماغ کو دھونے والا کوئی بھی مذہب سوائے اسلام کے اس کائنات گیتی میں موجود نہیں ہے۔ قرآن عظیم حقیقتاً ایک ایسا "آپریشن روم" (یا روحانی ہسپتال) ہے جس میں ہر قسم کی "ذہنی بیماریوں" اور "دماغی امراض" کا کافی و شافی علاج ہوتا ہے جس میں "لاعلاج" قسم کے مریضوں کی چیر پھاڑ اور سرجری کر کے ان کی مرہم پٹی کر دی جاتی ہے۔ اس کے "فرسٹ ایڈ" بکس میں ہنگامی حوادث سے نمٹنے کا تمام سامان موجود ہے۔

یا ایها الناس قد جاءتکم موعظة من ربکم وشفاء لما فی الصدور وهدی ورحمة للمؤمنین: لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے نصیحت آ چکی ہے جو تمام دلی امراض کے لئے شفا ہے اور اہل ایمان کے لئے تو سراسر ہدایت و رحمت۔ (یونس: ۵۷)

یا ایها الناس قد جاءکم برهان من ربکم وانزلنا الیکم نوراً مبیناً، لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے دلیل آ چکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف نور روشن (قرآن) اتار دیا ہے (جو ہتیں دنیا کی بھول بھلیوں سے نکالنے کے لئے روشنی کا کام دے گا۔ (نساء: ۱۷۴)

ونزلنا علیک الکتب تبیاناً لکل شیء، (اے محمد) ہم نے تم پر وہ کتاب اتاری ہے جو ہر چیز کی وضاحت کرنے والی ہے (نحل: ۸۹)

ولقد ضربنا للناس فی هذا القرآن من کل مثل لعلهم یتذکرون: اور ہم نے اس قرآن میں یقیناً ہر (ضروری) بات کی مثال بیان کر دی ہے تاکہ وہ چونک سکے۔ (زمر: ۲۷)

ھذا بیان للناس وھدی وموعظۃ للمتقین۔ یہ نوع انسانی کے لئے ایک وضاحت نامہ ہے اور اہل تقویٰ کے لئے درس وہدایت (آل عمران: ۱۳۸)

اس لحاظ سے قرآن حکیم پوری دنیائے انسانیت کے لئے روشنی کا منارہ (لائٹ ہاؤس) اور مشعل راہ بن ہے جس کی جگمگاہٹ سے پورا کرۂ ارض بقعۂ نور بن چکا ہے۔ یا بن جانے کے قریب ہے۔

معرکۂ قرآن وسائنس | الحاد و مادیت اور تشکیک ولاادریت وغیرہ تمام مہمل فلسفوں کی مزاج پرسی اور ان کے گمراہ کن عقائد کے سیل رواں کا مقابلہ قرآن حکیم بہت ہی کامیاب اور حیرت انگیز انداز میں کرتا ہے۔ مگر یہ بڑی ہی عجیب حقیقت ہے کہ مادہ پرستی کا توڑ وہ خود اسی کی تحقیقات کے ذریعہ کر دیتا ہے اور اس کا داؤں اسی پر الٹ دیتا ہے۔ یعنی اس کے ہاتھ پیر خود اسی کی رسی سے باندھ دیتا ہے جس کے نتیجہ میں انسان کی تحقیقات خود اس کے گلے کا پھندہ بن جاتی ہیں جس کا نظارہ بڑا ہی سبق آموز اور عبرت انگیز ہے۔ جیسا کہ "کلوروفل" کے مباحثہ سے ظاہر ہوگا۔

قرآن حکیم اس سلسلے میں اعجازی طور پر ایک زبردست ہتھیار استعمال کرتا ہے جس کو "دلائل آفاق والنفس" کہتے ہیں۔ یہ قرآنی ہتھیار یا ضرب کلیمی "بڑی انوکھی، حیرت ناک اور چونکا دینے والی ہے۔ جس کی ضربوں سے مادیت کا قصر عالی ریت کے تودے کی طرح زمین بوس ہو جاتا ہے۔ الحاد ولادینیت کے تانے بانے مکڑی کے جالے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں اور شکوک وشبہات کی تمام دیواریں آناً فاناً منہدم ہو جاتی ہیں۔ ان معرکہ آرائیوں کے ملاحظہ سے اس حقیقت عظمیٰ کے تسلیم کر لینے میں کوئی تردد باقی نہیں رہ جاتا کہ یہ انوکھی اور لاجواب کتاب حکمت برحق اور منجانب اللہ ہے ورنہ وہ اس قدر لازوال سچائیوں سے لبریز نہ ہوتا۔

انبیائے کرام کے کارنامے اور معرکۂ جدید | آپ نوح علیہ السلام کی داستان سے واقف ہوں گے کہ ان کی نجات ایک حیرت انگیز کشتی کے ذریعہ کس طرح ہوگئی اور ان کی نافرمان قوم کو کس بری طرح ڈبو دیا گیا؟ ابراہیم علیہ السلام کے حالات سے باخبر ہوں گے کہ آپ کے مقابلے میں نمرود جیسا

باجبروت حکمران اپنے سارے کروفر کے باوجود کس طرح عاجز و بے بس ہو کر رہ گیا! موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کی معرکہ آرائی کا حال بھی سنا ہوگا کہ ایک پوری قوم باوجود سحر و ساحری میں استادانہ وا ماہرانہ مہارت رکھنے کے ایک فرد واحد کے مقابلہ میں کس طرح اپنی چوکڑی بھول گئی اور کس طرح ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو کر بارگاہ یزدانی میں سجدہ ریز ہو گئی! پھر بدر وخیبر کی معجز نمائیاں تو یاد ہوں گی کہ مٹھی بھر جانبازوں نے کس طرح کشتوں کے پشتے لگا دیئے! اور سب سے بڑھ کر قرآن عظیم کی وہ ڈانٹ اور للکار تو سنی ہی ہوگی جس کے روبرو پوری دنیائے عرب نے گھٹنے ٹیک دیئے اور گونگی بن گئی۔

مگر آپ نے یہ تمام واقعات یا تو پڑھے ہوں گے یا صرف سنے ہوں گے۔ شکست خوردہ فریق مخالف کی ذلت و مسکنت اور ندامت و شرمساری کا نظارہ تو یقیناً نہیں کیا ہوگا! لہٰذا آیئے آج کی صحبت میں بیسویں صدی کے ایک "مہادیو" (سائنس) کی شکست فاش اور اس کی بے چارگی و درماندگی کی ایک تصویر مجسم کا نظارہ کر لیا جائے جس کی آج عام طور پر دھاک بیٹھی ہوئی ہے اور ذہن و دماغ پر اس کی ہیبت چھائی ہوئی ہے[۱]۔

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تا کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کرے۔ اگرچہ مشرکین (دین حق کے اس غلبہ کو) ناپسند ہی کیوں نہ کریں۔

(توبہ:)

سائنس کی اصل حقیقت واضح رہے کہ اسلام یا قرآن کا اصل معرکہ صرف مادہ پرستی اور خدا بیزاری

۱؎ حقیقت یہ ہے کہ آج مادہ پرستوں میں سائنس کی وہی حیثیت ہے جو قدیم اقوام میں کسی سب سے بڑے اور قومی بت (مہادیو) کی ہوا کرتی تھی۔ آج کسی بھی مسئلہ کو سائنس ہی کی عینک سے دیکھنے کا رجحان عام ہو گیا ہے گویا کہ وہ کوئی سروقاضی یا جیوجینس ہے۔ حالانکہ حقیقت کے اعتبار سے وہ کائنات کے مبادیات تک سے ناواقف ہے

سے ہے نہ کہ براہ راست سائنس سے۔ یا دوسرے الفاظ میں قرآن حکیم براہ راست سائنس یا علم کائنات کا حریف اور اس کا مد مقابل نہیں بلکہ وہ صرف لوگوں کے ذہنوں میں سرایت کردہ ان جراثیم کو نکال باہر کرنا چاہتا ہے جو مادیت کے پروردہ اور خدا بیزاری کی آغوش میں پروان چڑھے ہوئے ہیں۔ ورنہ وہ نہ صرف نظام کائنات میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے بلکہ مختلف اندازوں سے اس پر ابھارتا بھی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی بیشتر آیات شاہد ہیں۔ اس دعوت فکر سے جہاں بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں وہاں پر ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ کائناتی علوم میں ترقی کے باعث انسان کو خود اپنی بے بسی اور عجز و درماندگی کا شدت کے ...... ساتھ احساس بھی ہو جائے۔

سائنس محض کائنات اور نظام کائنات کے حقیقت پسندانہ اور غیر جانب دارانہ تنقید و جائزہ اور نقد و نظر کا نام ہے۔ اس لحاظ سے سائنس اور علوم سائنس کا سرمایہ اپنی اصل ماہیت کے اعتبار سے علم انسانی کا ایک قیمتی سرمایہ ہے جو کسی بھی طرح دین و مذہب کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ سائنس دراصل آج مذہب اسلام کی سب سے بڑی حامی و مؤید اور اس کی لونڈی نظر آتی ہے۔ سائنسی تحقیقات و انکشافات ہی کی بدولت قرآن کے آفاقی و انفسی دلائل، دین متین کے ابدی حقائق کے روپ میں جلوہ گر ہو رہے ہیں کیوں کہ خلاقِ فطرت نے مظاہرِ فطرت کے اصول و ضوابط اپنے دین و شریعت کے اصول و کلیات میں بہت بڑی حد تک مطابقت و یکسانیت اور حکمت و مصلحت رکھ دی ہے۔ جس کا حال مطالعۂ فطرت سے آشکارا ہو جاتا ہے۔

خلق اللّٰہ السمٰوات والارض انا فی ذالک لاٰیتہ للمؤمنین: اللہ نے زمین اور آسمانوں کو مطابقت و سچائی کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ بلاشبہ اس (مطابقت) میں اہل ایمان کے لئے ایک بہت بڑی نشانی موجود ہے (عنکبوت: ۴۴)

کیا سائنسی نظریات قابل استدلال ہیں اس موقع پر یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ علم انسانی (سائنس) اگرچہ عموماً تغیر پذیر ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ سرے سے ناقابل التفات اور ناقابل استدلال ہے۔ ورنہ پھر قرآن حکیم کا جگہ جگہ نظام کائنات میں غور و فکر کی دعوت دینا اور اکثر مواقع پر

یہ فرمانا کہ سوچ۔ بچار اور تحقیق و تدقیق سے کام لینے والوں کے لئے کائنات کی ہر چیز میں دلائل و بینات موجود ہیں، ایک مہمل و بے معنی بات ہوتی۔ اور دوسری حیثیت سے نظام کائنات سے کسی پر بھی حجت پوری نہ ہو سکتی اور آفاقی و انفسی دلائل کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ حالانکہ قرآن کریم صاف صاف اور غیر مبہم الفاظ میں اعلان کرتا ہے:۔

ومن اٰیٰتہ ان خلقکم من تراب ثم اذا انتم بشر تنتشرون ۝ ومن اٰیٰتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یتفکرون ۝ ومن اٰیٰتہ خلق السمٰوٰت والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذٰلک لاٰیٰت للعٰلمین ۝ ومن اٰیٰتہ منامکم بالیل والنہار وابتغاؤکم من فضلہ ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یسمعون ۝ ومن اٰیٰتہ یریکم البرق خوفاً وطمعاً وینزل من السماء ماءً فیحی بہ الارض بعد موتہا ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یعقلون ۝ ومن اٰیٰتہ ان تقوم السماء والارض بامرہ ثم اذا دعاکم دعوۃً من الارض اذا انتم تخرجون ۝ ولہ من فی السمٰوٰت والارض کل لہ قٰنتون ۝

وجود باری کی نشانیوں میں سے ہے یہ بات کہ اس نے تم کو مٹی (کے عناصر) سے پیدا کیا پھر تم (بڑے ہو کر) انسان بن کر (دھرتی کے سینے پر) پھیل جاتے ہو۔ اور اس کے نشانہائے قدرت میں سے ہے یہ امر کہ اس نے تمہارے لیے اور تمہارے سکون کی خاطر تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے۔ اور تمہارے درمیان محبت و شفقت (کے جذبات) پیدا کر دیئے۔ درحقیقت ان امور میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے (وجود باری اور اس کی قدرت و ربوبیت کے) دلائل موجود ہیں۔

اور زمین و آسمانوں کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی اس کے نشانات خاصہ میں سے ہے۔ بے شک ان امور میں اہل علم کے لئے بڑی بڑی دلیلیں موجود ہیں۔

رات اور دن کے وقت تمہارا سونا اور (صفحۂ ارض میں) اس کے فضل کو تلاش کرنا بھی اسکی علامات میں سے ہے بلاشبہ ان باتوں پر کان دھرنے والوں کے لئے (ربوبیت خداوندی کی) .... خاص الخاص دلالتیں موجود ہیں۔

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ بھی کہ وہ امید وبیم کی خاطر تم کو بجلی (کے کرشمے) دکھاتا ہے اور اوپر سے پانی برساتا ہے۔ پھر اس پانی کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے (وہ خشک بیابان سے ایک لہلہاتے ہوئے سبزہ زار میں تبدیل ہو جاتی ہے)۔ یقیناً اس باب میں سمجھنے والوں کے لئے بڑے (اہم اور معرکہ آراء) دلائل موجود ہیں۔

اور اس کے نشانات قدرت میں سے ہے یہ بات کہ ارض وسما اسی کے حکم سے قائم ہیں (جو ایک دوسرے پر گر نہیں پڑتے) پھر وہ جب تم کو (کائنات کے فنا ہو جانے کے بعد) یکبارگی پکارے گا تو تم (مرے ہوئے) زمین سے نکل پڑو گے۔ اور زمین و آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے سب کچھ اس کی ملکیت ہے۔ اور سب کے سب اسی کے حکم کے تابع ہیں (کسی کو اس کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں ہے۔ وہ جب چاہے گا اور جس طرح چاہے گا تمام مخلوقات کا حشر کرے گا (روم: ۲۰-۲۶)

هو الذی انزل من السماء ماء لکم منه شراب ومنه شجر فیه تسیمون ینبت لکم به الزرع والزیتون والنخیل والاعناب ومن کل الثمرات ان فی ذلک لآیة لقوم یتفکرون ۝ وسخر لکم الیل والنهار والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامره ان فی ذلک لآیات لقوم یعقلون ۝ وما ذرا لکم فی الارض مختلفا الوانه ان فی ذلک لآیة لقوم یذکرون ۝

وہی ہے (تمہارا معبود) جس نے تمہارے لئے اوپر سے پانی برسایا۔ یہی پانی مشروب بھی ہے، اسی سے درخت اگتے ہیں اور اسی پانی (کے ذریعہ اگے ہوئے سبزہ زاروں میں) تم اپنے مواشی چراتے ہو۔ (یہ اس کی ربوبیت کا حیرتناک کرشمہ ہے کہ وہ محض) اس پانی کے ذریعہ تمہاری خاطر ہر قسم کی کھیتیاں، زیتون، کھجور، انگور اور قسم ہا قسم کے (رنگ برنگے اور مختلف ذائقوں اور خصوصیات والے) میوے اگا دیتا ہے۔ یقیناً اس باب میں سوچ بچار کرنے والوں کے لئے ایک بہت

بڑی نشانی موجود ہے۔ اور اس نے تمہارے لئے دن رات اور آفتاب و ماہتاب کو کام میں لگایا اور کل ستارے بھی اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ بلا شبہ ان امور میں عقل سے کام لینے والوں کے لئے بڑی بڑی نشانیاں موجود ہیں۔ اور تمہاری (پرورش کی) خاطر اس نے دھرتی میں جو (بوقلمونیاں) پھیلا رکھی ہیں۔ ان تمام کے رنگ و لون جدا جدا ہیں۔ اس اختلاف الوان میں چونکنے والوں کے لئے ایک عظیم الشان دلیل موجود ہے (نحل: ۱۰-۱۳)

یہ اور اسی قسم کی دیگر بہت سی آیات کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم انسانی علم و عقل کو (ایک حد تک) قابل استدلال ضرور سمجھتا ہے جیسا کہ "لقوم تیفکرون"، "لقوم یعقلون"، "لقوم یسمعون" اور "لقوم یذکرون" وغیرہ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اگر مظاہر کائنات کی ساخت و پرداخت میں نظم و ضبط نہ ہوتا، حکمت و منصوبہ بندی نہ ہوتی بلکہ انتشار و اضطراب ہوتا پھر ان مظاہر پر سوجھ بوجھ اور غور و تامل ایک بے کار اور لا یعنی بات ہوتی۔ یہ اور بات ہے کہ انسان کو اشیائے عالم کی اصل حقیقت و ماہیت اور اس کے آغاز و انجام کا کوئی کلی و حتمی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کا علم ہمیشہ بالکل سطحی اور واجبی واجبی قسم کا ہوتا ہے۔ اسی کو قرآن دیگر مواقع پر "علم قلیل" سے تعبیر کرتا ہے۔

وما اوتیتم من العلم الا قلیلا : اور تم کو بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

بنی اسرائیل: ۸۵)

ولا یحیطون بشیء من علمه الا بما شاء : اور یہ لوگ اس سے زیادہ علم حاصل نہیں کر سکتے جتنا کہ وہ چاہتا ہے (بقرہ: ۲۵۵)

ان دونوں آیتوں میں بھی علم انسانی کا سرے سے انکار نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ دونوں آیتیں اس مسئلہ پر صاف روشنی ڈال رہی ہیں کہ انسان کو ایک حد تک علم سے نوازا گیا ہے۔ یعنی نظام کائنات میں غور و خوض اور تلاش و تفحص کی بدولت جتنا کچھ بھی علم حاصل کیا جا سکتا ہے وہ "علم حقیقی" کی بہ نسبت "بہت تھوڑا" اور خفیہ قسم کا ہوگا، مگر ہوگا ضرور۔ ورنہ پھر نوع انسانی پر حجت قائم نہیں ہو سکتی۔

علم انسانی ۔ بالعلوم سائنس ۔۔ کے ایک حد تک قابل وثوق وقابل استدلال ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اپالو ۱۱ کی اڑان سے پہلے سائنس دانوں کا نظریہ تھا کہ چاند پر ہوا، پانی اور زندگی وغیرہ نہیں ہے۔ نیز یہ کہ چاند پر بیشمار گڑھے، غار اور آتش فشانی دہانے وغیرہ رونما ہو چکے ہیں اور وہاں پر کشش بھی زمین کے مقابلے میں صرف ۱/۶ ہے وغیرہ وغیرہ۔

چاند کی تسخیر کے باعث ان تمام نظریات کی تصدیق ہو چکی ہے۔ ہاں صرف فاصلے سے متعلق اندازے میں تیرہ ہزار میل کی غلطی ثابت ہوئی ہے۔ یعنی پہلے زمین سے چاند تک، کا اوسط فاصلہ دو لاکھ چالیس ہزار میل تصور کیا جاتا تھا۔ مگر تازہ تحقیق کے مطابق دو لاکھ ستائیس ہزار میل قرار پایا ہے۔ آرمسٹرانگ اور ایلڈرن نے چاند پر آئینہ نصب کیا تھا اس پر روشنی کی شعاع پھینک کر اس کی آمد و رفت کے وقفہ کے لحاظ سے یہ فاصلہ نوٹ کیا گیا ہے[۱]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم انسانی میں بعض اوقات غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ پورے علم انسانی کو ناقابل اعتبار قرار دے دیا جائے۔ یہ تو نظری مسائل کا حال ہوا اس کے برعکس وہ امور جو عملی سائنس (PRACTICAL SCIENCE) سے متعلق ہیں ان میں غلطیوں کا امکان بہت ہی کم اور نہ ہونے کے برابر ہے۔ عملی سائنس کی بدولت زیادہ تر قوانین قدرت دریافت ہوئے ہیں۔

سائنس اور اس کی شاخیں سائنس نظام کائنات پر غور و فکر اور مظاہر کائنات کی تحقیق و تفتیش کا نام ہے۔ بالفاظ دیگر استقرائی حیثیت سے اشیائے عالم کی چھان بین کر کے اصول و کلیات (قوانین قدرت) دریافت کرنا اور رازہائے فطرت کا پتہ لگانا۔ سائنس کی اہم شاخیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ علم کیمیا (کیمسٹری): جس میں مادہ اور دنیا کی تمام اشیاء کی بناوٹ اور ساخت،

---

[۱] روشنی ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا فاصلہ طے کر لیتی ہے۔ اور آج کل ایسے آلات ایجاد ہو گئے ہیں جو سکنڈ کو لاکھوں حصوں میں تقسیم کر سکتے اور ان کا حساب لگا سکتے ہیں۔

وترکیب سے بحث کی جاتی ہے۔ یعنی وہ کن کن عناصر سے مرکب ہیں اور ان کے خواص وطبائع کیا ہیں وغیرہ۔

۲۔ طبعیات (فزکس)؛ جس میں مادہ (کُل اشیائے کائنات) میں پائی جانے والی قوتوں: حرارت، بجلی، مقناطیس، روشنی اور آواز کے اصولوں سے بحث کی جاتی ہے۔ اور ان توانائیوں کے اثرات "مادہ" پر دکھائے جاتے ہیں۔

۳۔ حیاتیات (بیالوجی)؛ جس میں حیوانات ونباتات کی ساخت پرداخت اور "زندگی" کے خصائص ولوازمات زیر بحث لائے جاتے ہیں۔

۴۔ علم جمادات (جیالوجی)؛ جس کا موضوع بحث زیر زمین پائی جانے والی اشیاء ہوتی ہیں مثلاً مختلف قسم کی مٹی اور چٹانوں کی پرتیں وغیرہ۔

۵۔ فلکیات (آسٹرانمی) اور فلکی طبعیات (آسٹروفزکس)۔ جن میں ستاروں اور سیاروں کے کے نظامات، کہکشانی مادہ سے ان کی پیدائش اور موت کے اصول وضوابط، ان کے خواص وطبائع اور طبعی وفطری احوال وکوائف وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ (باقی)

لطائف اکبری نادر قلمی ملفوظ

خواجہ علی اکبر مودودی (م ۱۲۰۹ھ) کے احوال واقعی

جناب مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی. استاد دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

صاحب ملفوظ اور ملا ولی میں تصوف کے مسائل پر بات چیت ہوتی رہی دوران گفتگو میں خواجہ مودودی نے پوچھا:

مولانا نظام الدین رحمتہ اللہ تعالیٰ در تحقیق معارفِ فصوص الحکم بر کدامی شرح از شروح فصوص الحکم وثاق می نمودند و تحسین می فرمودند و مختار خودمی گردانیدند.

ملا نظام الدین رحمتہ اللہ علیہ فصوص الحکم کے نکتوں کی تحقیق کے سلسلے میں فصوص کی شرحوں میں سے کس شرح کو معتبر مانتے تھے اور کس شرح کی تعریف کرتے اور پسند فرماتے تھے.

ملا ولی نے جواب میں بتایا کہ ملا صاحبؒ کے مطالعے میں علامہ جامی کی شرح، قیصری کی شرح اور شیخ محب اللہ الہ آبادی کی دونوں شرحیں عموماً رہا کرتی تھیں اور شیخ صدر الدین قونوی کی شرح بھی مطالعے میں رہتی تھی.

خواجہ مودودی: شیخ صدر الدین قونوی نے جو صاحب فصوص الحکم شیخ محی الدین ابن عربی کے سجادہ نشین تھے فصوص الحکم کی کوئی شرح تو لکھی نہیں ہے ہاں شیخ مؤید الدین جندی کی استدعا پر فصوص الحکم کے خطبے کی ایسی تشریح لکھ دی تھی ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ کہ فصوص الحکم کے تمام مطالب و معارف کی اس سے تشریح و تنقیح ہوگئی."

ملا ولی:- "یہی صحیح ہوگا"

اس کے بعد ملا ولی فرنگی محلی نے کہا "تصوف بہت مشکل فن ہے جس شخص کو اچھی طرح

منطق نہ آتی ہو اور فلسفہ کے مبادیات پر پورا عبور نہ ہو اس کو تصوف کی کتابوں اور خاص شیخ ابن عربی کی تصانیف کے مطالعے سے کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، علم تصوف کے لئے منطق و فلسفہ کا علم ضروری ہے۔

خواجہ مودودی:- آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں درست ہے مگر مولانا روم نے فرمایا ہے ؎

دفتر صوفی سواد و حرف نیست — جز دل اسپید ہم چوں برف نیست

اور پوری مثنوی اسی قسم کے بیانات سے بھری ہوئی ہے، اور شیخ ابن عربی نے بھی فصوص الحکم کی کوئی فص ایسی نہیں ہے جس میں یہ نہ کہا ہو کہ اس فن (تصوف) کے نکتوں کا ادراک قوت عاقلہ و مفکرہ کے ذریعہ نہیں ہو سکتا فلسفہ کے مبادیات کے ذریعہ اس فن تک راہ طے نہیں کی جا سکتی ان معارف اور نکات کا انکشاف و ادراک، کشف و شہود کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔......... اس فن کے جاننے والوں کا اس بارے میں اجماع ہے اور تصوف کی کتابوں میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے کہ تمام متقدمین و متأخرین ایک زبان ہیں کہ مقدمات کشفیہ اور علوم و اسرار شہودیہ کا ادراک عقل و فکر کے ذریعہ محالات میں سے ہے ایسی صورت میں علم منطق پر، جس کے اوراق سے بعضوں کے نزدیک استنجا تک جائز ہے، طبقۂ عالیہ صوفیہ کے اعلیٰ نکتوں کا سمجھنا کیسے موقوف ہو سکتا ہے، جب علم کلام تک، جو ایک معزز علم ہے جیسا کہ علما نے تصریح کر دی ہے، صوفی علما اور فضلا کے نزدیک درجۂ اعتبار سے ساقط ہے تو منطق و فلسفہ کا کہاں گذر ہے؟

ملا ولی:- یہ تو مشہور و مسلم ہے کہ بغیر علم ظاہری کے فن تصوف پر عبور نا ممکن ہے۔

خواجہ مودودی:- یہ جو آپ کہہ رہے ہیں اور بات ہے..... علم امکانی اور چیز ہے اور علم وجوبی اور چیز، اور علم وجوبی متعارف علم (یعنی علم امکانی) کی ضد ہے، اس علم وجوبی اور اس کے حصول کے طریقے کی طرف اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں واضح اشارہ موجود ہے۔

واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ (اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو اللہ تعالیٰ تمہیں علم عطا فرمائے گا) یہی علم، علم لدنی ہے جو اہل اللہ کو بغیر کسی مادی ذریعہ کے نصیب ہوتا ہے اور ایسے ہی ایک اپنے بندے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (علمناہ من لدنا علما (ہم نے اپنی طرف سے اس کو پڑھا دیا) اور یہ جو آپ نے کہا علم ظاہری کے حصول کے بغیر صوفیا اور عرفا کے معارف اور نکات کا سمجھنا امکان سے باہر ہے تو پھر (حضرت سید) شاہ عبدالرزاق بانسویؒ کے بارے میں (جو علم ظاہری سے بالکل ناواقف تھے اور علمائے فرنگی محل کے سلسلۂ بیعت کے مرشد تھے) آپ کیا کہیں گے ؟

ملا محمد ولی :۔ ایسا بہت شاذ و نادر ہوتا ہے۔

خواجہ مودودی :۔ یہ درست ہے کہ ایسا ہونا بہت شاذ و نادر ہے لیکن اس گروہ کے کئی حضرات کے لیے اس سے بھی زیادہ کتابوں میں ملتا ہے اور یہ ثابت شدہ ہے۔

ملا محمد ولی :۔ اگر درحقیقت یہی صورت حال ہے (کہ بے علم ظاہری کے باطنی علوم حاصل ہو جاتے ہیں) تو ان حضرات صوفیہ کی معارف وحقائق کے بارے میں تصانیف محض تضیع اوقات اور فعل عبث ہوئیں ؟

خواجہ مودودی :۔ بات یہ ہے کہ حضرات صوفیا پر بسا اوقات ایسی حالت طاری ہوتی ہے کہ اگر اس وقت وہ کسی کام میں مشغول نہ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی تجلیات کے رعب سے مضمحل (کمزور) اور لاشئی (معدوم) ہو جائیں اور تجلیات کی تڑپ اور چمک سے جل کر ختم ہو جائیں، اس وقت یہ حضرات خود کو دانستہ دوسرے کام میں مشغول کر لیتے ہیں، یہ اس وقت ہوتا ہے جب حالت تجلی میں ان کے وجود اور لوازم وجود کا کچھ نہ کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے اور اگر سارا وجود تجلی میں گم ہو گیا ہے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ یا اس کا رسول (علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام) ان کو بغیر اس کے کہ ان کو خود احساس ہو،

مشغول کر دیتا ہے اور اس میں راز اور فائدہ یہ ہے کہ اس گروہ کا کوئی آدمی جب فن تصوف میں دخل رکھتا ہے اور اس کے نفس کا تزکیہ اور اس کے قلب کا تصفیہ اس حد تک ہو چکا ہے کہ مکاشفات مشاہدات تک اس کی رسائی ہو گئی ہے تو وہ اپنے مقدمات مکشوفہ و مشہودہ کو اپنے گروہ کے کسی ایک شخص سے مفصل بیان کر دیتا ہے یا اس مقام سے دوسرے بلند مقام تک اس کو عروج نصیب ہو جاتا ہے،...... اسی طرح یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص دولت تزکیہ نفس و تصفیہ قلب سے بے بہرہ ہے تو وہ محض صوفیوں کی تصانیف پڑھ کر ان کے نکات و معارف کا ادراک نہیں کر سکتا ہے چنانچہ کہنے والا کہتا ہے ؎

بقیاسات عقل یونانی نہ تواں یافت راہ ایمانی

گر ز منطق کسے ولی بودے شیخ سنت ابو علی بودے

ملا محمد ولی:- وحدت الوجود کے مسئلہ حقہ کے ثبوت کے لئے میرے پاس کئی عقلی دلائل اور نظری براہین ہیں جن کو رد کرنا یا ان پر اعتراض کرنا ممکن نہیں ہے۔

خواجہ مودودی:- علمائے حق کا اتفاق ہے کہ معرفت خداوندی کے لئے کسی بھی دلیل کی ضرورت نہیں ہے چہ جائیکہ عقلی دلیل اور نقلی برہان، اگر آپ گروہ صوفیہ کی تصانیف کا بغور مطالعہ فرمائیں گے تو جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں اس کی پوری طرح وضاحت ہو جائے گی اگر آپ خود دائرہ تصوف میں قدم رکھیں گے تو صوفیاء کی تصانیف میں جو کچھ تحریر ہے اس کی حقیقت و صداقت آپ پر خود منکشف ہو جائے گی یہ تو تسلیم شدہ بات ہے کہ دلیل کو مدلول سے واضح اور روشن ہونا چاہئے اور حق سبحانہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی چیز واضح اور جلی نہیں ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

گر دلیلت باشد از وے رو متاب"

اس تمام گفتگو کے بعد خواجہ سید علی اکبر مودودیؒ نے ملا محمد ولی فرنگی محلی سے فرمایا :" اچھا وحدت الوجود کے مسئلہ پر جو سب سے مضبوط دلیل آپ کے پاس ہو اسے پیش کریں، ملا ولی نے ایک دلیل پیش کی، خواجہ مودودی نے فرمایا یہ تو مسئلہ کی تشریح ہوئی اس پر دلیل کیا ہے ؟ ملا محمد ولی نے اپنی دلیل کی مزید وضاحت کی جس پر خواجہ مودودی نے نقد کیا ملا ولی نے اپنی دلیل کے ثبوت میں ایک اور دلیل دی جس پر خواجہ مودودیؒ نے فرمایا " یہ وہی دلیل ہے جسے میر زاہد نے اپنے حواشی میں یہ کہہ کر پیش کیا ہے کہ یہ ان کی خود ایجاد کردہ دلیل ہے مگر یہ دلیل بھی مخدوش ہے چنانچہ مولوی احمد علی اور آپ کے بھائی مولوی حسن (ملا حسن فرنگی محلی) نے اس پر اعتراض کیا ہے اور اسے ساقط قرار دیا ہے .....

ملا محمد ولی فرنگی محلی نے اعترافِ شکست کر لیا اور تبسم کے ساتھ کہنے لگے :" حقیقت یہی ہے کہ گروہ صوفیاء کے معارف اور نکات تابعِ حال ہیں جب تک حال وارد نہ ہو ان کا ادراک نہیں کیا جاسکتا، فقیر انشاء اللہ پھر حاضرِ خدمت ہوگا اور گروہ صوفیاء کے مسائل کے بارے میں جہاں کہیں شک محسوس کرے گا آپ سے اس کی تحقیق کرے گا۔ اس زمانے میں آپ کا وجود بے حد غنیمت ہے ایسے لوگ نادرات زمانہ میں ہیں، میں نے آپ کے اوصاف بہت سے علماء اور طلباء سے سنے تھے، مگر اس سے سوگنا زیادہ آپ کو پایا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس زمانے میں بھی ایسے عارفین موجود ہیں۔"

خواجہ مودودی :۔ (انکساری کے ساتھ) " یہ سب آپ کا حسن نظر اور لطافت ظن ہے فقیر تو جاہل محض ہے۔"

ملا محمد ولی :۔ آپ نے تحصیل علوم کس سے کیا ؟

خواجہ مودودی :۔ اس سوال کے جواب میں ایک واقعہ سن لیجئے جو حضرت سری سقطی کے احوال میں نفحات الانس میں درج ہے کہ حضرت جنید بغدادی بیان کرتے تھے کہ میں حاضرِ خدمت تھا اور کچھ لوگ قیام گاہ کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے، حضرت سری سقطی نے

مجھ سے فرمایا کہ دروازے پر کوئی غیر اور بیگانہ تو نہیں ہے؟ میں نے عرض کیا نہیں ایک درویش کام کی تلاش میں ہے۔ فرمایا اس کو بلا لو۔ میں نے اندر بلا لیا حضرت سری اس سے بڑی دیر تک ...... باتیں کرتے رہے اتنی باریک اور نازک گفتگو ان دونوں کے درمیان ہو رہی تھی کہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور میں پریشان ہو رہا تھا آخر میں حضرت سری سقطی نے اس سے دریافت کیا کہ تم نے کس سے پڑھا ہے؟ درویش نے جواب دیا ہرات میں میرا ایک استاد ہے جس سے فرائض نماز مجھے سیکھنا ہیں۔ جہاں تک علم توحید (معرفت خداوندی) کا تعلق ہے اس کی تلقین وہ مجھے کرتا رہتا ہے۔ حضرت سری سقطی نے فرمایا، جب تک یہ علم خراسان میں اپنی جگہ قائم ہے اس وقت تک ہر جگہ یہ علم موجود رہے گا اگر وہاں سے ختم ہو گیا تو پھر کہیں بھی اس کو نہیں پاؤ گے، اس کے بعد خواجہ مودودی نے فرمایا کہ فقیر کا سلسلہ بھی اسی جگہ سے ہے۔" (لطائف اکبری جلد اوّل صفحات ۱۱۸ تا ۱۲۳)

ملا محمد ولی کے براہ راست سوال پر کہ آپ کو تلمذ کس سے ہے؟ خواجہ مودودی ایک حکایت بیان کرنے کے بعد صرف اتنا کہتے ہیں "مجھے بھی اسی سلسلے سے سب کچھ حاصل ہوا ہے۔" ظاہر ہے کہ وہ سلسلہ جو حکایت میں مذکور ہے محض روحانی سلسلہ ہے یعنی تلمذ ظاہری کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ تلمذ ظاہری سے یکسر بے تعلق رہنے کے باوجود خواجہ مودودی، ملا محمد ولی فرنگی محلی کے ایسے فاضل اجل اور معقولی سے مباحثہ فرماتے ہیں ملا محمد ولی نہ صرف یہ کہ استاذ الہند ملا نظام الدین کے شاگرد رشید تھے بلکہ بڑے معقولی بھی تھے انھوں نے منطق کی کتاب سلم کی ایسی بے مثل شرح لکھی ہے کہ اس کے بارے میں "آمد نامہ" کے مصنف علامہ فضل امام خیر آبادی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ شرح ملا نظام الدین فرنگی محلی کے ملاحظے سے گذری تھی اور ملا نظام الدین نے اس میں جا بجا اصلاح کی تھی، تو ایسے ماہر علوم عقلیہ سے بحث کے دوران خواجہ مودودیؒ میر زاہد ہردی کے ایسے مسلم الثبوت استاد معقولات کی تصانیف کا حوالہ دیتے ہیں، حوالہ ہی نہیں دیتے بلکہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اگرچہ یہ دلیل خود

میرزاہد ہروی کی اختراع ہے جس پر انھوں نے فخر بھی کیا ہے مگر اس دلیل کو مولوی احمد علی (غالباً سندیلوی) اور
ملاحسن فرنگی محلی نے رد کردیا ہے" اس سے صاف ظاہر ہے کہ خواہ خواجہ مودودی نے کسی کے سامنے زانوئے
شاگردی تہ کیا ہو یا نہ کیا ہو، علوم متعارفہ میں بھی، علاوہ صوفیانہ معارف ونکات کے، ان کی نظر بہت وسیع
تھی نہ صرف نظر وسیع تھی بلکہ ان امور پر ان کو عبور کامل حاصل تھا، یہاں تک کہ ان معقولی علمائے وقت
سے بھی جن کی زندگی کا حاصل ہی درس وتدریس، منطقی موشگافی اور ذہنی جولانی تھا، خالص معقولی بحث میں
دو دو بدو ہونے میں تامل نہیں کرتے تھے۔ ملا محمد ولی فرنگی محلی شارح سلم العلوم، معمولی یا متوسط درجہ
کے اہل علم نہ تھے۔ اپنے مشہور زمانہ بھائی ملا حسن فرنگی محلی سے کسی طرح کم نہ تھے بلکہ ان سے بھی زیادہ
ثقہ اور مستند مانے جاتے تھے۔ نیز استاذ الہند ملا نظام الدین بانیٔ درس نظامی کے شاگرد رشید ہونے
کے علاوہ ملا صاحب کے بعد ان کے مدرسہ (واقع فرنگی محل) میں "مدرس قومی خدمت" آخر تک رہے
ہیں ان کا انتقال ملا نظام الدین کے ۳۰ سال بعد ۱۱۹۸ھ میں فرنگی محل ہی میں ہوا، ان کے نامور فرزند
ملا مفتی محمد ظہور اللہ جوان ہی کے شاگرد تھے مصنف وقائع قادر خاں کے الفاظ میں "صنادید فرنگی محل" میں
تھے۔ یہ اپنے وقت میں استاد عصر گذرے ہیں، (وفات ۱۲۵۶ھ) ایک خاندانی تحریر کے مطابق ملا محمد
ولی کے شاگردوں میں مشہور اردو شاعر انشاء اللہ خاں انشا بھی تھے اور خیرآبادی سلسلۂ معقولات کے
استاذ اول مولانا عبد الواجد خیرآبادی بھی ملا محمد ولی کے شاگرد تھے خیرآبادی سلسلے کے نامور اساتذہ
علامہ فضل امام خیرآبادی اور ان کے مشہور عالم فرزند علامہ فضل حق رام پوری گذرے ہیں۔

اس ساری تفصیل کا ماحصل یہی ہے کہ خواجہ سید علی اکبر علی مودودی کا سارا علم، علم لدنی تھا جس
میں کسب واکتساب کا کوئی دخل نہ تھا لیکن ان کے ملفوظات سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاوہ علوم ومعارف
تصوف کے وہ فقہ تفسیر حدیث کلام معقولات اور تاریخ پر اسی طرح گفتگو کرتے تھے جیسے ان فنون
کا کوئی ماہر گفتگو کرتا۔

خواجہ مودودیؒ نے اپنے حالات زندگی بھی اجمالاً خود بیان کئے ہیں، جنہیں جامع ملفوظ خواجہ
حسن نے "لطائف اکبری" کے لطیفۂ دوم میں۔۔۔۔ ان ملفوظات میں جو دوسرے ثقہ راویوں سے سن کر لکھے

گئے ۔ مکمل درج کردیا ہے،

خواجہ حسن لکھتے ہیں کہ ایک محفل میں "سیر و تفریح" کی گفتگو چھڑ گئی اس سلسلے میں خواجہ مودودی نے ابتدا سے لے کر آج تک کے اپنے سیر سفر کے حالات اجمالاً بتائے ۔ انھوں نے فرمایا :۔

"ایک عزیز سے دل لگاؤ کے نتیجے میں میرے سر میں سودا اور ہل چل پیدا ہوگئی، بعض اسباب کی بنا پر مجھے اس عزیز سے ترک تعلق کرنا پڑا اور بن جنگلوں میں مارا مارا پھرنے لگا۔ خوش قسمتی سے اس زمانے میں گاہ گاہ حضرت پیر و مرشد حقیقی قدس سرہ کی خدمت میں، جو بیرون آبادی صحرا میں قیام پذیر رہتے تھے، حاضری ہوجایا کرتی تھی کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ حضرت پیر و مرشد کی خدمت ہی میں رات گذارتا تھا، اپنی بے پناہ شفقت کی بنا پر میری آشفتہ حالی اور دل ریشی کو دیکھ کر فرمایا "اگر کبھی کبھی ذکر میں تمہاری مشغولیت رہا کرے تو کیا کہنا" میں نے عرض کیا ؎

صلاح کار کجا و من خراب کجا

مختصر یہ کہ ایک رات حضرت پیر و مرشد "ذکر ذات" بالجہر کر رہے تھے، جس سے میں نے اپنے اندر غیر معمولی اثر محسوس کیا اور عرض کیا "اگر حکم ہوجائے تو آپ کے ساتھ ساتھ میں بھی ذکر کروں" فرمایا "کوئی حرج نہیں" ، اس اجازت کے بعد میں نے حضرت کے ذکر کے ساتھ ساتھ ذکر شروع کردیا۔ اس طرح جب کئی راتیں ہوگئیں تو حضرت نے ذکر موقوف فرمادیا، جب میں نے اس کے جاری رہنے کی استدعا کی تو فرمایا "بوڑھا ہوگیا ہوں (مسلسل) ذکر کی طاقت مجھ میں نہیں رہی ہے"۔ جب میں نے اپنے لئے ذکر کی اجازت چاہی تو اجازت مرحمت فرمادی، اس دوران میں اپنے عزیز سے جو قلبی تعلق تھا وہ ذکر کی صورت میں تبدیل ہوکر ذکر مع اذکار سے ہوگیا، اب میں نے حضرت پیر و مرشد سے درخواست کی کہ مجھے مرید فرمالیں، انکار کردیا، کئی بار اس طرح میں نے التجا کی اور اسی طرح ادھر سے انکار ہوا، رفتہ رفتہ ایسا ہوا کہ اس عزیز سے تعلق خاطر نے اللہ جل شانہ سے تعلق کا رنگ اختیار کرلیا۔

بالآخر ایک رات خود ہی اس بے یار و مددگار کی طرف توجہ فرمائی ۔ فرمایا کہ "مٹھائی لے کر آؤ" میں مٹھائی لے کر حاضر ہوا۔ مجھے سلسلہ عالیہ چشتیہ میں داخل کر کے بیعت سے مشرف فرمایا، الحمد للہ الحمید المجید، اس کے بعد تین مہینے اور چند روز خدمت میں حاضری کی سعادت سے سرفراز رہا، اور جن امور کا مجھے حکم فرمایا اس میں مشغول ہوا۔ اسی دوران سفر و سیر کا رجحان میرے دل میں پیدا ہوا۔ اور درویشوں کی وضع کے مطابق، صحرانوردی اختیار کر کے آوارۂ وطن ہو گیا، اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اسی صحرانوردی کے دوران سلطان المشائخ محبوب الٰہی نظام الملۃ والحق والدین رضی اللہ عنہ کے روضۂ متبرکہ کی زیارت کو جاتا، ایک روز میرے مشفق بھائی سید کریم بخش مودودی سلمہ اللہ، بھی میرے ساتھ تھے، انھوں نے قسم دلا کر مذکورہ معاملہ (یعنی صحرانوردی یا عزیزوں سے قلبی تعلق) کے بارے میں پوچھا، ان کو بتانا پڑا۔ انھوں نے قسم دلائی کہ اب سفر (صحرانوردی) کے لئے جب روانہ ہونے لگنا تو مجھے اس کی خبر ضرور کر دینا، اس کے کچھ دن بعد ہم نے (خواجہ مودودی اور سید کریم بخش مودودی) اپنے خاندان کے مرید ایک گھرانے کی ایک بوڑھی بی بی کے یہاں ایک رات بسر کی اور آدھی رات تک گانا سنتے رہے پھر ہم الگ الگ اپنے گھروں کی طرف چل دیئے۔ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد میرے اندر سفر کے لئے ایسی بے چینی پیدا ہوئی کہ اگر تھوڑا سا بھی توقف کرتا تو (شوق کی آگ میں) جل جاتا۔ جس حال میں تھا اٹھ کھڑا ہوا۔ جاڑے کا زمانہ تھا، میں نیمہ، روئی کا دگلا، ٹوپی اور عمامہ پہنے ہوئے تھا اور ایک رزائی بھی میرے پاس تھی ایک ڈوری سے جو بھیڑ کے سیاہ بالوں کی تھی۔ میں نے کمر باندھی اور ایک لکڑی ہاتھ میں لے لی، میری والدہ محترمہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، جائے نماز پر تھیں۔ مجھے انھوں نے غور سے دیکھا۔ اور اشارے سے مجھ سے اس صورت حال کے بارے میں دریافت کیا، مجھے خیال ہوا کہ اگر اس تیاری کی اصلی وجہ بتا دوں گا تو (میری جوانی کے تصور سے) بے چین ہو جائیں گی، عرض کیا، حضرت خواجہ قطب الدین ابن بختیار کاکی رضی اللہ عنہ کے مزار پر انوار کی زیارت کا قصد ہے کچھ عرصے وہیں رہوں گا۔ والدہ ماجدہ نے آبدیدہ ہو کر مجھے رخصت کیا۔ گھر سے نکل کر اپنے بڑے بھائی (کریم بخش مودودی) کے یہاں گیا وہ مجھے نہیں ملے، واپس چلے آنے کا ارادہ ہوا۔ پھر خیال آیا کہ اگر زندگی نے وفا نہ کی

(اور صحرا نوردی میں وقت موعود آگیا) تو اپنے شفیق رشتہ داروں کی پھر زیارت کا موقعہ نہیں ملے گا، اپنی پھوپھو کی خدمت میں (اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے) حاضری دی وہ بھی جائے نماز پر بیٹھی تھیں ان کی زیارت کی سب بہنوں سے ملا، اور چلا آیا، بھائی (سید کریم بخش مودودی) سے ان بوڑھی بی بی جن کے یہاں رات گو گانا سنا تھا پھر آنے کی استدعا کی تھی وہ وہیں چلے گئے تھے اس لئے ان بوڑھی بی بی کے یہاں گیا۔ دیکھا کہ ان کا سارا گھر حیران و پریشان ہے، ان کے قریب گیا تو وہ میرے سلام کو کھڑی ہو گئیں۔ دیکھا تو وہ بری طرح رو رہی تھیں۔ میں نے وجہ پوچھی کہنے لگیں: جب آپ لوگ چلے گئے اور میری کنیزیں گانے میں مصروف تھیں، میں اپنے بچھونے پر آکر سو گئی۔ اسی وقت میں نے خواب دیکھا کہ حضرت سید سلطان مودود چشتی رضی اللہ عنہ مجھ سے غصہ کے ساتھ فرما رہے ہیں "اس شہر سے باہر چلی جاؤ ورنہ اس لکڑی سے جو ہاتھ میں ہے مار مار کر ختم کر دوں گا" جاگ پڑی۔ اسی وقت سے پریشان ہوں کہ اگر اس شہر میں رہتی ہوں تو مرجاؤں گی۔"

لکھنؤ میں آمد بہرحال، ہوا یہ کہ میں اور میرے بھائی ایک ساتھ مشرق کی طرف روانہ ہوئے اور "ضعیفہ بی بی" اپنا کثیر مال و متاع اور کنیز و خادم سب اسی طرح چھوڑ چھاڑ شاہ جہاں آباد (دہلی) سے باہر آگئی۔ وہاں سے روانہ ہونے کے بعد دوسری منزل پر پہنچ کر مجھے خیال ہوا کہ یہ راستہ مجھے تنہا طے کرنا چاہئے۔ جس قافلے میں تھا اس سے الگ ہو کر ایک دوسرا راستہ میں نے پکڑ لیا پیچھے پیچھے میرے بھائی بھی آگئے اور (ساتھ چلنے کے لئے) کوئی دلیل انھوں نے اٹھا نہ رکھی، اور اسی طرح میں قصبۂ لکھنؤ پہنچ گیا، یہاں مجھے اطلاع ملی کہ احمد شاہ درانی (ابدالی) شاہجہان آباد (دہلی) میں آگیا ہے اور وہاں کے باشندے سخت مصائب میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ شاہ جہاں آباد میں میرے کئی رشتہ دار تھے ان کے بارے دلی تشویش پیدا ہوئی، قصبہ مذکور (لکھنؤ) کے باہر ایک درویش ملا جو اپنے حد دار ستہ (مست و سرشار) تھا (یعنی بڑا خدا رسیدہ تھا) اس کی خدمت میں حاضر ہوا کہ اس سے اپنے رشتہ داروں کے بارے میں کوئی (الہامی یا کشفی) خبر معلوم ہو۔ وہ اکیلا

بیٹھا تھا، میری طرف سے منہ موڑے موڑے اس نے میرے تمام رشتہ داروں کا نام بہ نام حال بہت تفصیل سے بتایا اور کہنے لگا "ان تردّدات سے (جو رشتہ داروں کے بارے میں ہیں) کیا حاصل؟ اپنے کو پہچاننے کی فکر کرنا چاہئے"۔ یہ سن کر میرے دل میں خیال آیا کہ "خودشناسی" کا طریقہ کیا ہوگا۔ درویش بولا "یہ کرو اور وہ کرو"۔ میں نے اس کے کہے کو سب یاد کرلیا، کچھ زمانے کے بعد وہ سب کچھ سامنے آگیا جو درویش نے (شاہ جہان آباد میں مقیم رشتہ داروں کے بارے میں) کہا تھا۔ بہرحال میں گھومتے پھرتے (لکھنؤ سے) محمد آباد بنارس پہنچا، وہاں پہنچ کر سفر کا جو جذبہ تھا وہ ہوا ہوگیا اور اپنے اندر پوری طرح یک سوئی کی کیفیت میں نے محسوس کی اور ہر قسم کی فکر سے بے تعلق اور یک سو ہوگیا اور اپنے دل کو واحد حقیقی کی طرف متوجہ پایا"۔ ص۲۷۴ تا ص۲۷۶

خواجہ مودودی کی اس "آپ بیتی" سے ان کے سوانح حیات کے کئی تاریخی پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ ایک تو یہی کہ جوانی میں ان کو کسی سے لگاؤ پیدا ہوگیا تھا جس نے ان کو آشفتہ مزاج بنا دیا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب وہ کسی کے مرید نہیں ہوئے تھے۔ مرید ہونے کے بعد ان کی آشفتگی جاتی رہی اور سیر و سیاحت کا ولولہ پیدا ہوگیا۔ وہ دہلی سے چل کھڑے ہوئے منزلیں طے کرتے لکھنؤ آئے۔ وہاں سے محمد آباد بنارس پہنچ گئے۔ یہاں صحرا نوردی اور مسلسل سفر کے جذبۂ بے اختیار سے خالی ہوکر یادِ الٰہی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ محمد آباد بنارس سے چلے تو سیر و سیاحت کے شوق میں نہیں بلکہ حج اور زیارت کے قصد سے روانہ ہوئے الٰہ آباد آئے، وہاں دم لینے کے لئے ٹھہرے۔ ابھی وہیں تھے کہ وہ کیفیت تلاوتِ قرآن شریف کے دوران پیدا ہوگئی جس کا ذکر اوپر ہوا اور:۔

"چوں طہارت نہ بود کعبہ و بتخانہ یکیست"

کے حال خواب نے حج و زیارت کا قصد بھی فسخ کرادیا اور طہارتِ حقیقی کے حصول میں منہمک ہوگئے۔

اس آپ بیتی کے دوران میں خواجہ علی اکبر مودودی نے اپنے مرید ہونے کا واقعہ بھی بیان کیا ہے لیکن اس موقعہ پر انھوں نے پیر و مرشد کا نام صراحتاً نہیں لیا ہے صرف "پیر و مرشد حقیقی" سے کام چلایا ہے ــــ اور یہ بہت قدیم دستور ہے کہ محترم ہستیوں کے نام ادباً کم ہی لئے جاتے

ہیں کنایتاً ذکر ہی پر عموماً اکتفا کر لی جاتی ہے۔ یہ وہی ادب ہے جس کا اہتمام اس شعر میں ملتا ہے

ہزار بار بشویم دھن بعطر و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

یہ نہیں کہ "پیر و مرشد حقیقی" کا نام صاحب ملفوظ نے بالکل نہیں لیا ہے اور ہر جگہ صرف کنایہ ہی استعمال کیا ہے۔ جا بجا کنایہ کے بجائے صراحت بھی کی ہے جس سے معلوم ہو گیا کہ ان کے پیر و مرشد کا اسم گرامی سید محمد میر حسنی تھا اور ان کا عرف نزہتہ الخواطر میں "شیخ بھلن" بتایا گیا ہے مگر لطائف اکبری اور گلدستہ مودودی میں "شیخ بھلی" لکھا ہے (محض کتابت کا پھیر معلوم ہوتا ہے) ضمناً یہ بھی مل جاتا ہے کہ شیخ بھلی، خواجہ علی اکبر مودودی کے حقیقی چچا بھی تھے، پیر و مرشد تو تھے ہی، اور اس لطائف اکبری کے دوسرے صفحات سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ شیخ بھلی کا سلسلۂ بیعت چشتیہ ہے جو، کڑہ، دہلی، مانک پور، پنڈوہ کے مشائخ کے ذریعہ حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی نظام الدین محمد اولیاؒ کے توسط سے خواجۂ ہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ تک پہنچتا ہے۔ شیخ بھلی یا بھلن کے بارے میں اور تفصیلات نظر سے نہیں گذریں۔

اس "آپ بیتی" سے یہ بھی وضاحت سے معلوم ہو گیا کہ شاہ جہاں آباد (دہلی) سے چل پڑنے کا زمانہ وہ ہے جب مغلیہ تخت و تاج کا وارث نصیبوں کا مارا شاہ عالم عالی گہر تھا، اس لئے کہ دہلی سے چل کر گھومتے پھرتے "قصبہ لکھنؤ" میں اپنے داخل ہونے کا متعین زمانہ خواجہ، مودودی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

بر ہمیں منوال بقصبۂ لکھنؤ رسیدم و روزیکہ داخل شدیم خبرم شد کہ احمد شاہ درانی در شاہ جہاں آباد شد و مردم آں جا بحوادث شدیدہ گرفتار شدند (ص ۲۲)	اسی انداز سے سفر کرتے ہوئے میں قصبہ لکھنؤ پہنچ گیا جس روز قصبۂ لکھنؤ میں داخل ہوا ہوں مجھے اطلاع ملی کہ شاہ جہاں آباد (دہلی) میں احمد شاہ ابدالی (درانی) آیا ہے اور وہاں کے باشندے شدید قسم کے مصائب میں گرفتار ہو گئے ہیں۔

(باقی)

الحاج مولانا رضی الدین ابوالخیر محمد عبدالمجید خاں صاحب

جناب مولوی سعید احمد صاحب مبارک منزل، ٹونک

معزالدین سام شہاب الدین محمد غوری کو ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کا فخر حاصل ہے۔ وہ نہ صرف ایک جری اور اولوالعزم بادشاہ ہی تھا بلکہ علم دوست اور ادب نواز حکمراں بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عرصہ دراز تک غور علم وفضل کا گہوارہ بنا رہا۔ فتح ہند کے بعد ہی سے غور سے علماء وفضلا کی آمد شروع ہوگئی تھی جو ہندوستان کے مختلف مقامات پر علمی وتبلیغی کام انجام دینے کے لئے متوطن ہونے لگے تھے۔

نواب بہاول خاں سوم والئی بہاولپور[1] کے دور حکومت میں حافظ نور نبی خاں غوری سکونت پذیر تھے۔ آپ نہایت عابد وزاہد اور زاہد مرتاض تھے۔ صاحب "خاندان غوری" نے آپ کو "دریائے معرفت کے شناور اور راہِ سلوک کے عامل" کے لفظوں سے یاد کیا ہے[2] آپ کے زہد اور کرامت کا غلغلہ تمام بہاول پور میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جنرل

---

[1] نواب بہاول خاں سوم ۱۸۲۵ء میں مسند نشین ہوئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حملے کے خوف سے گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنگ سے ریاست کی حفاظت کی درخواست کی۔ اسی زمانہ میں پنجاب اور بہاول پور کے حدود متعین کردیئے گئے۔ اور بہاول پور ریاست کو خود مختارانہ حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا۔ نواب صاحب کا ۱۸۵۲ء میں انتقال ہوا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (RULING PRINCES & CHIEF OF INDIA. (1930)

[2] صفحہ ۳

ونیٹورہ[1] نے بہاول پور کا رخ کیا اور دریائے ستلج کے کنارے خیمہ زن ہوا تو نواب صاحب موصوف نے حافظ صاحب سے دعا کی درخواست کی۔ آپ کی دعا قبول ہوئی اور فوج کا رخ بہاول پور سے ہٹ گیا بہاول پور میں نواب سر محمد صادق خاں صاحب رابع[2] کے عہد حکومت میں حاسدوں کے حسد اور خسروانہ تزحمات کی کاہش سے مجبور ہو کر بہاول پور سے کوچ کیا۔ کچھ عرصہ ڈیرہ غازی خاں میں مقیم رہے پھر ٹونک میں سکونت اختیار کی حافظ صاحب کا انتقال ۶ ذیقعدہ ۱۲۶۳ھ میں ہوا۔ پسماندگان میں پانچ لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی تھی۔

محمد عبد المجید خاں آپ کے اول فرزند تھے۔ ولادت ۱۲۳۲ھ میں ہوئی تھی۔ رضی الدین لقب اور کنیت ابوالخیر تھی جیسا کہ کسی شاعر نے مدحیہ اشعار میں کہا ہے ؎

آں رضی دیں لقب وکنیت او	بابوالخیر مبارک فرجام
نام او عبد مجید والا ست	لیک تو خوانی عرب بالام[3]

---

[1] خاندان غوری مصنفہ فضل حسین صاحب غوری نے ونٹورہ یہ نام لکھا ہے جو غلط ہے۔ اس کو فرانسیسی بتایا ہے یہ بھی غلط ہے۔ یہ اطالوی باشندہ تھا۔ مہاراجہ کے نامی گرامی افسران میں تھا۔ بیس سال سے زائد خالصہ دربار میں رہا ۱۸۴۳ء میں انگریزوں سے جاملا اور گورنر جنرل ایلنبرا کو لاہور دربار کی خبریں خفیہ طور سے بھیجا کرتا تھا تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مہاراجہ رنجیت سنگھ۔ مصنفہ سیتارام کوہلی (ہندی ایڈیشن)

[2] ۱۸۶۶ء میں نواب بہاول خاں رابع کی وفات کے بعد مسند نشین ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر چار سال تھی اس لئے ریاست کا انتظام برطانوی ایجنسی کرتی تھی ۱۸۷۹ء میں آپ خود مختار ہوئے۔ جنگ کابل کے دوران آپ نے برطانوی حکومت کی قابل قدر خدمات کیں۔ اس لئے آپ کو جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۲۰ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۸۹۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ ملاحظہ ہو "رولنگ پرنسز اینڈ چیف آف انڈیا مطبوعہ ۱۹۳۰ء (انگریزی)

[3] عذب الکلام فی تحیۃ السلام مصنفہ مولانا رضی الدین ابوالخیر محمد عبد المجید خاں صاحب ص ۵

مولوی بہادر علی بن ملا جیون جو شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ تھے۔ ان سے آپ نے علوم حاصل کئے۔ حافظ قرآن تھے ۱۲۶۱ھ میں حج کے لئے تشریف لے گئے۔ ڈھائی سال وہاں مقیم رہے۔ شیخ عبداللہ بن عبدالرحمن سراج شیخ المدرسین حرم شریف سے ثلاثیات مع شرح امداد الباری لتفقہ ثلاثیات البخاری کے پڑھی اور اس کی سند لی[1]۔ حج سے تشریف لائے، تو تخم خرما عقیدت کے ساتھ ہمراہ لائے تھے۔ تاکہ اسے صحن میں اگائیں۔ ارض پاک کی نشانی سامنے رہے۔ اسی کھجور کی نسبت سے مرحوم کی حویلی اب تک "کھجور والی حویلی" کے نام سے مشہور رہے۔ قادری سلسلہ سے بیعت تھے اور حنفی المذہب تھے۔ نواب وزیر الدولہ وزیر الملک محمد وزیر خاں صاحب علیہ الرحمۃ والغفران والئ ریاست ٹونک کے استاد تھے[2]۔ نواب صاحب موصوف نے اپنی دختر کا نکاح آپ سے کر دیا تھا اور برادر خورد نواب زادہ احمد علی خاں رونق کی شادی آپ کی خواہر عصمت زمانی بیگم سے کر دی تھی[3]۔ صاحبزادہ کا خطاب آپ کو عطا گیا۔ لیکن خاص و عام میں "نوشہ میاں" کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کی حویلی کے سامنے کا پل اسی عرفیت کی بنا پر اب تک "نوشہ میاں کا پل" کے نام سے معروف ہے۔

---

[1] یہ سند ادارہ تحقیقات علوم شرقیہ ٹونک میں محفوظ ہے۔

[2] ۱۸۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۰ سال کی عمر میں مسند آرا ہوئے۔ سید احمد بریلوی رحمۃ علیہ کے مرید تھے اسلامی علوم پر آپ کی گہری نظر تھی۔ آپ کے ہی دور میں بہت سے مشہور و معروف علماء ٹونک آکر مقیم ہوئے اسی وجہ سے ٹونک قبۃ الاسلام کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ الوصایۃ الوزیریہ آپ کی مشہور تصنیف ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو واقعات ہفت دہ سالہ امیر دولت صالہ وزیر مولفہ دیوان شمس الدین (فارسی قلمی)

[3] نواب زادہ احمد علی خاں بانی ریاست ٹونک نواب امیر خاں کے فرزند ہشتم تھے۔ اردو، فارسی، ہندی و عربی سے خوب واقف تھے۔ ہندی میں "احمد" اور اردو میں "رونق" تخلص اختیار کیا۔ دیوان "رونق سخن" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے ؎

دل زمانے سے ہٹ گیا اپنا ہم بھلے اور گھر بھلا اپنا

والیان مالیر کوٹلہ و رام پور اور بیگم صاحبہ والئی بھوپال سے آپ کے مراسم رسل و رسائل تھے نواب امیر الملک والا جاہ مولانا صدیق حسن خاں صاحب بہادر جنت مکانی سے آپ کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ مدالباع لاثبات حرمتہ النکاح فوق الرباع موصوف کی فرمائش پر ہی مولانا حافظ رضی الدین ابو الخیر محمد عبد المجید خاں نے قلمبند کی تھی[1] یمین الدولہ نواب محمد علی خاں[2] کو ایک ناخوشگوار واقعہ کے سبب سے جلاوطنی نصیب ہوئی تھی اور بنارس میں آپ کا قیام رہا تھا۔ ان سے ملنے کے لئے بنارس تشریف لے گئے اور وہاں فن جفر میں ایک رسالہ تصنیف کیا۔ ہند اور بیرون ہند کے علماء آپ کے علم فضل کے قائل تھے۔ مفتی سلطان مکہ شریف سید عبد اللہ بن عبد الرحمن سراج شیخ المدرسین حرم شریف آپ کی مدح میں اس طرح رطب اللسان ہوئے ہیں[3]

مولٰی لنا عبد المجید القادری	یکنی اباخیر بحر القادر
حبر رضی الدین من القابہ	فی العلم معراج کبحرٍ زاخر

بقیہ صہ کا

بچ گئے ہم صدمہ ہائے ہجر سے	موت کا اچھا بہانہ مل گیا
پھیلائے پاؤں قبر میں سوتے تھے چین سے	اے شور حشر تو نے ہمیں کیوں جگا دیا

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مضمون "نواب زادہ احمد علی خاں رونق" شاعر بمبئی ماہ اگست ۱۹۶۸ء

[1] دیکھئے مدالباع لاثبات حرمتہ النکاح فوق الرباع مصنفہ عبد المجید خاں صاحب (قلمی) مملوکہ ادارہ تحقیقات علوم شرقیہ ٹونک۔

[2] نواب محمد علی خاں ۱۲۸۱ھ المطابق ۱۸۶۴ء میں تخت نشین ہوئے۔ تین سال حکومت کی۔ ۱۸۶۷ء میں جلاوطن ہو کر بنارس میں مقیم ہوئے اور وہیں انتقال ہوا۔ بڑے عابد، زاہد اور متبحر عالم تھے۔ "قرۃ العیون" آپ کی تصنیف ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ٹونک گزیٹیر (انگریزی قلمی) مرتبہ ڈاکٹر برہمت شرما ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مملوکہ راقم الحروف۔

[3] المرتجی بالقبول قدمۃ قدم الرسول مطبوعہ ۱۳۲۵ھ مطبع علوی لکھنؤ۔

ہندوستان کے بہت سے علماء کے تاریخی قطعات، مدحیہ اشعار اور تقاریظ آپ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ مولوی محمد عمران خاں صاحب رقمطراز ہیں کہ

"...... صاحب علم وفن اور قابل افراد میں تھے۔ اسی وجہ سے نواب وزیر الدولہ نے اپنی بیٹی کی شادی آپ سے کر دی تھی۔ تصنیف وتالیف کی بڑی صلاحیت رکھتے تھے۔ متعدد کتب و رسائل آپ کی یادگار ہیں۔" [1]

آپ کی متعدد کتابیں مطبوعہ وغیر مطبوعہ ہیں۔ یہاں ان کا مختصراً تعارف کرایا جاتا ہے۔

(۱) المرتجی بالقبول خدمۃ قدم الرسول شیخ الانام العالم الہمام حافظ سیدنا احمد بن محمد المالکی المصری صاحب فوائد الفریدہ کے رسالہ فتح المتعال فی مدح خیر النعال کی تلخیص ہے۔

(۲) التحفۃ الحمیدۃ فی نعت الرسول الحمیدہ حلیۂ شریفہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ مختصر رسالہ المرتجی بالقبول خدمۃ قدم الرسول کے ساتھ ۱۲۸۵ھ میں مطبع علوی میں طبع ہوا تھا دونوں رسائل ۲۰،۱۲ صفحات پر مشتمل ہیں۔

(۳) القول القویم فی استبراک نعل نبی الکریم۔ رسالہ نایاب ہے۔

(۴) تذکرہ احباب من کلام من اختص بالوحی والکتاب۔ حج کے دوران ۱۲۶۱ھ میں مکہ شریف میں تصنیف کیا گیا تھا۔ غیر مطبوعہ رسالہ ہے۔

(۵) مجیدیہ فی اقسام شہداء الاخرویہ۔ عربی کے اس رسالہ میں موصوف نے شہداء کی اقسام کو مختلف کتب احادیث سے جمع کیا ہے۔ رسالہ میں شہدا کی چھیالیس ۴۶ اقسام کا ذکر ہے۔ مصنف مرحوم نے مقدمہ میں تحریر کیا ہے کہ سیوطی نے شہدا کی اقسام پر ایک رسالہ تحریر کیا تھا لیکن وہ نہیں

---

[1] برہان ماہ مارچ ۱۹۶۶ء

مل سکا۔ ۱۳۹۲ھ میں طبع ہوا۔

(۶) یدیتہ اولی النہی فی اثبات ارسال اللحی۔ رسالہ نایاب ہے۔

(۷) الفایدۃ العمیمہ فی اطعام الولیمہ۔ طعام ولیمہ سے متعلق احادیث جمع کی ہیں اور فوائد کا جائزہ لیا گیا ہے۔

(۸) رسالہ حرمیہ۔ حرم شریف کا حال تحریر کیا ہے۔ مصنف مرحوم نے ڈھائی سال وہاں قیام کیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ رسالہ اہم ہے کہ حرم شریف کا چشم دید حال درج ہے۔

(۹) رسالہ زحافیہ۔ فن عروض پر نایاب رسالہ ہے۔

(۱۰) احسن القواعد فی عمل المناسخہ۔ بجامع واحد۔ رسالہ نایاب ہے۔

(۱۱) القاعدہ الفائدہ تصحیح المناسخہ۔ بجامعۃ واحدہ۔ مذکورہ بالا رسالہ اور اس کا موضوع ایک ہی ہے۔

(۱۲) جامعہ الجدولات فی شبکات الشبکات۔ رسالہ نایاب ہے۔ قیاس ہے کہ فن خوشنویسی پر قلمبند کی ہوئی کوئی کتاب ہوگی۔

(۱۳) ظفرالمرا ایتمناہ برکتہ قول انشاءاللہ۔ غیر مطبوعہ ہے۔ موضوع نام سے ظاہر ہے۔

(۱۴) عذب الکلام فی تحیۃ السلام۔ تحیہ سلام کے متعلق بحث کی گئی ہے آخر میں تحیہ سلام کے تحیہ مسجد، تحیہ وضو، تحیہ غسل اور تحیہ موت کے متعلق بھی مرقوم ہے۔ رسالہ فارسی میں ہے اور غیر مطبوعہ ہے[1]

(۱۵) حسن التجہیز فی تہذیب فاتحہ فتح العزیز۔ فارسی کا غیر مطبوعہ رسالہ ہے فن فقہ سے متعلق ہے۔

(۱۶) الرقیم الوجیز فی تلخیص فتح العزیز۔ مذکورہ بالا رسالہ اور اس کا موضوع ایک ہی ہے۔

---

[1] عذب الکلام فی تحیۃ السلام (قلمی فارسی) مصنفہ عبدالمجید خاں صاحب۔

(۱۷) القول الاسعر فی جواز لباس المعصفر۔ غیر مطبوعہ ہے۔ نام سے ہی موضوع ظاہر ہے۔

(۱۸) القول المجید فی تجوید کلام اللہ المجید۔ قرآن و تجوید سے متعلق ہے۔ رسالہ نایاب ہے۔ ممکن ہے سبعہ قرأت قرآنی کا بھی ذکر کیا ہو۔ نایاب ہونے کی وجہ سے مطالعہ میں نہیں آسکا۔

(۱۹) خلاصۃ الاقوال فی تحقیق العالم وما یتعلق بہ من الاحوال۔ عالم کے متعلق تحقیقی رسالہ ہے جس میں علماء و فضلاء کے اقوال سے ابتدائے آفرینش وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ بحث فلسفیانہ ہے اور قرآن و احادیث کا حوالہ جابجا ہے۔

(۲۰) نعم الاتفاق فی تحقیق الالصاق۔ الصاق کعبین سے متعلق ہے۔ ایک مدحیہ قصیدہ میں اس کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

کہ سنت است کہ کعبین را درون نماز   بہم کنی برکوع و سجود اے ذی شان

(۲۱) الجوامع فی تلخیص الھوامع۔ حزب البحر کی فارسی شرح ہے۔ شارح نے ورد کا طریقہ بھی مرقوم کیا ہے۔ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔

(۲۲) تنبیہ الانام علی الساعۃ و ساعۃ القیام۔ ساعۃ و ساعۃ القیام کا فقہی جائزہ لیا گیا ہے

(۲۳) احسن الفتوح فی تحقیق الروح۔ اگرچہ روح کے متعلق "من امر ربی" کہہ کر بحث و مباحث کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ لیکن علماء و فلاسفہ نے پھر بھی عجیب موشگافیاں کی ہیں۔ رسالہ میں روح کے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

(۲۴) الجز المعتبر فی کشف ماہیۃ الحلۃ الاحمر۔ رسالہ نایاب ہے۔ نام سے موضوع ظاہر ہے۔

(۲۵) مدالبحج لاثبات حرمۃ النکاح فوق الرباع۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب والئی بھوپال کی فرمائش پر تحریر کیا گیا۔ ۹۰ صفحات کا یہ رسالہ فارسی میں ہے اور آخر میں فہرست فوائد مذکورہ درج ہیں۔ رسالہ طبع ہو چکا ہے۔ اس میں چار سے زیادہ نکاح کرنے کو غیر شرعی اور ناجائز ثابت کیا گیا ہے۔

(۲۶) الفتوح من جانب اللہ فی تحقیق ما اہل بغیر اللہ۔ رسالہ کے نام سے موضوع ظاہر ہے۔

(۲۷) نور العینین فی افشائے سیر شہادۃ الحسنین۔ حضرت حسن اور حسین کی شہادت کے واقعات مندرج ہیں اور مناقب مرقوم ہیں۔

(۲۸) سفینۃ العلوم کالقمر فی النجوم۔ پرانی طرز کا انسائیکلو پڈیا (جامع العلوم) ہے۔ اسمیں ہر دو علوم کے متعلق تحریر کیا گیا ہے۔

(۲۹) بلغتہ الاسمیٰ فی تحقیق الاسمأ — رسالہ نایاب ہے۔ مدحیہ اشعار جن میں فاضل مصنف کی اکثر کتابوں کے نام قلم بند کئے ہیں۔ اس کو "غرایب دوراں" بتایا گیا ہے[۱]۔

(۳۰) اشباع الکلام فی التخلّل ذات الاکمام۔ رسالہ نایاب ہے۔

(۳۱) تدقیق النظر فی تحقیق النذر — اس رسالہ میں نظر غیر اللہ کی تحریم ثابت کی گئی ہے۔ قرآن کریم اور احادیث سے نذر غیر اللہ کو ناجائز بتایا گیا ہے۔

(۳۲) تدقیق النظر فی خفض النظر — رسالہ میں ختنہ زن کے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

(۳۳) المقالتہ الانیفہ فی تلخیص الحدیقہ — رسالہ نایاب ہے۔ نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ "حدیقہ" کی تلخیص ہے۔

(۳۴) مزبل الشجن فی تہذیب نفحتہ الیمن۔ یہ بھی تلخیص شدہ رسالہ ہے۔

(۳۵) المتاع الانفس لطالب مطالب نورس۔ فاضل مصنف نے یہ رسالہ عورتوں کے لئے تصنیف کیا تھا۔ رسالہ فن سنگار رس سے متعلق ہے۔

(۳۶) ملہم الاسرار من کلام الابرار۔ یہ ۸۰ صفحات کا خوشخط فارسی میں لکھا ہوا رسالہ ہے۔ ۷ ارمحرم ۱۲۸۹ھ کا نوشتہ ہے۔ جب آپ بنارس میں اپنے برادر نسبتی نواب محمد علی خاں صاحب سے ملنے گئے تھے تو ان کی فرمائش پر وہیں تحریر کیا تھا۔ حروف کے خواص پر اچھی بحث کی گئی ہے

۱۔ بفیضان المجید علی طلب المستفید قلمی فارسی مصنفہ ابوالخیر رضی الدین عبدالمجید خاں صاحب۔

رسالہ میں اسمائے باری تعالیٰ کے صفات بھی مندرج ہیں۔

(۳۷) معلم القاری بفتوح الباری۔ ۱۲۶۱ھ میں جب آپ حج کو تشریف لے گئے تھے وہاں مولانا عبداللہ بن عبدالرحمٰن سراج الحنفی المکی سے ثلاثیات مع شرح امداد الباری لتنفعۃ ثلاثیات البخاری پڑھی تھی۔ آپ نے ان احادیث کو جو بخاری سے مروی ہیں اور درمیان میں تین راوی ہیں کو ایک کتاب کی شکل میں ترتیب دیا۔ غیر مطبوعہ ہے اور شروع میں سند اجازت منسلک ہے۔[1]

(۳۸) تنبیہ النبیہ۔ یہ رسالہ مذکورہ رسالہ کے ساتھ منسلک ہے۔ فاضل مصنف نے اس رسالہ میں یہ بحث کی ہے کہ حدیث کی سند لینا ضروری ہے یا نہیں؟ رسالہ قدرے محشی ہے اوّل سے آخر تک حواشی ذیل سے چڑھائے گئے ہیں۔ رسالہ پر کاتب کا نام ہے نہ تاریخ کتابت۔ مخطوطہ کرم خوردہ ہے[2]

(۳۹) معلم القاری فی شرح ثلاثیات البخاری۔ معلم القاری بفتوح الباری کی شرح ہے۔

(۴۰) فیضان المجید علی قلب المستفیذ۔ فارسی زبان میں اصول حدیث پر لکھا ہوا رسالہ ہے۔ آخر میں محدثین کے نام اور تاریخ اور تاریخ وفات درج ہیں۔ راقم الحروف کی نظر سے اس رسالہ کے دو مخطوطے گذرے ہیں۔ دونوں مخطوطے محشیٰ ہیں۔ ادارہ تحقیقات علوم شرقیہ کے مخطوطہ کا آخر حصہ مجدول ہے۔ دوسرا نسخہ جو احقر کی نظر سے گذرا ہے اس کے آخر میں فاضل مصنف کی ۴۰ کتابوں کے نام کسی شاعر نے نظم کئے ہیں اور تاریخ وار بیان کیا گیا ہے۔ بعد ازیں زبدہ ابرار مولوی محمد عبدالغفار کی منظوم تاریخ ہے۔ جس میں شاعر نے فاضل مصنف کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کی تعریف کی ہے۔

(۴۱) القول السدید فی ثبوت استبراک لنعل سیدالاحرار العبید۔ جناب فضل حسین صاحب غوری نے اس تالیف کے بارے میں تحریر کیا ہے "آپ کی ایک تالیف نعل شریفہ حضرت سید السادات

---

[1] معلم القاری بفتوح الباری (قلمی) مملوکہ ادارہ تحقیقات علوم شرقیہ ٹونک

[2] ایضاً

سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات شاہی لائبریری بہاول پور میں داخل ہے جو اُن کے قلمی ودماغی شاہکار کا نمونہ ہے۔ یہ سولہ صفحات کا مطبوعہ رسالہ ہے جس میں سرورِ کائنات کے نعلِ شریف کے متعلق متعدد روایات مرقوم ہیں اور آخر میں نقشِ پائے مبارک بھی منقوش ہے۔ روایات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اقلیدس (GEOMETRY) کی مدد سے نقش پابنا ہے۔

(۴۲) نجات المومنین۔ اردو میں فقہی مسائل سے بحث کی گئی ہے اور مسائل کا استنباط قرآن اور احادیث کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ احناف کے لئے یہ کتاب قابلِ قدر ہے۔ مخطوطہ ادارہ تحقیقات علوم شرقیہ ٹونک میں محفوظ ہے۔

مندرجہ بالا بیالیس کتابوں کے علاوہ اور بھی متعدد کتابیں آپ کی مصنفہ ہیں لیکن امتدادِ زمانہ سے ان کے نام تک محفوظ نہ رہ سکے۔ آپ زود نویس اور کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ عروض، سیر، حدیث، تجوید، جفر، فقہ، فلسفہ اور سنگاررس جیسے مختلف النوع اور متضاد الطبع علوم میں آپ کی تصانیف ہیں۔ سفینۃ العلوم کا لقمر فی النجوم میں ہژدہ علوم مذکور کئے ہیں جس سے آپ کے علم و فضل اور مختلف النوع مطالعہ کا علم ہوتا ہے۔ آپ نہ صرف عربی، فارسی اور اردو سے واقف تھے۔ بلکہ ہندی بھی جانتے تھے۔ ماہر خطاط اور ممتاز خوشنویس تھے۔ مختلف قسم کے خطوط لکھنے پر کامل عبور تھا۔ دوسرے خوشنویسوں اور خطاطوں کے خط سے خط اس طرح ملا لیتے تھے کہ کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ روشنائی، حروف کی کرسی و نشست میں کسی طرح امتیاز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ۱۲ر شوال ۱۳۰۷ھ میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

آپ سخی، متقی اور بڑے عابد و زاہد تھے۔ دنیا کو ترک کر کے شب و روز تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے[۲]۔ ایک معاصر نے آپ کے علم، حلم، خوش بیانی اور نکتہ دانی کا اعتراف کیا ہے۔ اور منظوم صورت میں ان اوصاف کی تعریف کی ہے[۳]۔ آپ کی شہرت آپ کی زندگی میں ہی ارضِ ہند کو عبور

۱؎ خاندانِ غوری صفحہ ۴ ۲؎ المرتجی بالقبول خدمتہ قدم الرسول

۳؎ فیضان المجید علی طلب المستفید

کرکے اسلامی ممالک میں پہنچ گئی تھی۔ آپ کی تصانیف میں مختلف علماء کے تاریخی قطعات اور مدحیہ اشعار مرقوم ہیں مفتی سلطان مکہ شیخ احمد الدمیاطی المصری و سید عبداللہ بن عبدالرحمن سراج الحنفی المکی جیسے بیرون ہند کے علماء آپ کے مدح خواں تھے۔ شیخ المدرسین حرم شریف نے "فاضل اللبیب والحسیب النسب شمس فلک المجد والتمجید" سے خطاب کیا ہے[1]

رضی الدین ابوالخیر مولانا حافظ محمد عبدالمجید خاں کی متعدد تصانیف نہیں مل سکی ہیں۔ اور حالات بھی کماحقہ نہیں معلوم ہوسکے۔ اسے "بے مہری یاران وطن" کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے۔ ایسے علماء جن کے حالات اور تصانیف ابھی تک "پردۂ خفا" میں ہیں ان کو "روشناس خلق" کرانا ایک علمی و دینی خدمت ہوگی جس کا اجر اللہ تعالیٰ دے گا۔

---

[1] المرتجی بالقبول خدمۃ قدم الرسول۔

پھر وہی رویت ہلال

از حاجی احسان الحق صاحب بجنوری ایم۔ ایس۔ سی۔ سابق لکچرر طبعیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

ماہنامہ برہان کی گذشتہ اشاعتوں (اکتوبر تا دسمبر ۷۰ء) میں مولانا محمد برہان الدین سنبھلی کا ایک مقالہ بعنوان "خبر رسانی کے موجودہ وسائل اور رویت ہلال کا مسئلہ" شائع ہو چکا ہے۔ میں نے اس مضمون کا مطالعہ کیا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے بہت عمدہ مضمون ہے۔ ہر پہلو پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ مگر بعض جگہیں تشنہ ہیں۔ درخواست ہے کہ ان گوشوں پر بھی روشنی ڈالی جائے۔

یہ نہ معلوم ہو سکا کہ خبر رویت ہلال کی رمضان شریف میں کب تک آ جانی چاہئے۔ عشاء تک، سحر تک، ضحوۂ کبریٰ تک یعنی نصف النہار شرعی تک تاکہ روزہ کی نیت صحیح وقت پر ہو جائے یا انیس ۱۹ یا بیس ۲۰ تک تاکہ اعتکاف صحیح ہو جائے۔ یا تیس ۳۰ تک غروب آفتاب سے پہلے تاکہ روزہ افطار کر لیا جائے کیوں کہ یکم شوال کو روزہ رکھنا حرام ہے۔

اگر حج میں لوگوں کو بذریعہ خبر موجب معلوم ہو کہ رمضان کا پہلا روزہ فلاں دن ہوا تھا۔ اور ہندوستان میں ایک دن بعد یا دو دن بعد کو روزہ رکھا تھا تو کیا ہندوستان میں ایک یا دو روزے اور رکھنے ہوں گے۔ یا کسی اور طریقہ پر رمضان گذرنے کے بعد معلوم ہو تو کیا صورت ہو گی۔

مولانا کفایت اللہ صاحبؒ نے ۲۴ رمضان ۱۳۶۵ھ مطابق ۲۲ر جولائی ۱۹۴۶ء بروز جمعہ فتویٰ دیا کہ آج ۲۵ر رمضان ۱۳۶۵ھ مانی جائے اس پر روشنی ڈالی جائے۔

اگر ایسی خبر ذی الحج کے چاند کے متعلق ۶ر ذی الحج کو آئے تو ۶ر ذی الحج کو ۷ر ذی الحج مان کر

۸ر ذی الحج کو منا چلدیں گے اور ۹ر ذی الحج کو عرفات میں ہوں گے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ۶ دن تک حج کے لئے رویت کا انتظار کرنا چاہئے۔ کیا چھ دن کا انتظار اوائل رمضان میں آئندہ عید الفطر کے لئے یا ایک روزہ یا دو روزے رکھنے کے لئے بھی کرنا چاہئے۔

میری ناقص رائے میں قانون ایک ہی ہونا چاہئے اور اس طریقہ پر فاصلہ کی تعین بھی ہو جاتی ہے۔ ۱۶ کروہ فی روز یعنی ۱۶×۶ = ۹۶ کروہ = ۱۱۰ میل انگریزی۔ ۱۷۶ کلومیٹر کیوں کہ رفتار اوسط لینی چاہئے۔ رفتار قرون اولیٰ کی ہی ماننی چاہئے۔ میری عرض یہ ہے کہ فاصلہ کے لئے ایک شرعی نشان موجود ہے۔ فاصلہ کی حد کے لئے تبرکاً جزیرۃ العرب (جو صرف مسلمانوں کے لئے کر دیا گیا تھا) کے حدود سے کام لے سکتے ہیں یا حج کے لئے جو میقات مقرر ہیں ان سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مجھے تعجب ہے کہ فرمان نبوی کے ہوتے ہوئے کہ ہم امی ہیں یعنی حساب سے تعلق نہیں ہے پھر فن ہئیت کا ذکر کیوں کیا جاتا ہے اور اس سے کام لینے کی کیوں کوشش کی جاتی ہے۔ سوال کیا جاتا ہے کہ فن ہئیت کے لحاظ سے مطلع کب بدل جاتا ہے۔ چھ دن کے اندر خبر آئے یا تیس ۳۰ دن کے اندر خبر آئے جو مستقد میں نے طے کر دیا ہے وہ سر آنکھوں پر ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ زمانۂ نبوی میں عرب ہئیت سے واقف نہیں تھے میری جہاں تک معلومات ہیں عرب واقف تھے۔ القمر الجدید کے متعلق ایک میٹان دور ہے (METON Cycle) جس کو میٹان صاحب یونانی نے ۴۳۲ سال قبل حضرت عیسٰے علیہ السلام دریافت کیا تھا یعنی حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ہزار برس پہلے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ممالک شرقیہ میں اس سے پہلے معلوم تھا یہ دور ۱۹ سال کا ہے جس کے ذریعہ اب بھی یکم جنوری کو چاند کی عمر معلوم کی جاتی ہے جس کو اپی پیکٹ (EPACT) کہتے ہیں۔ مفصل معلومات کے لئے مولانا اسحٰق النبی علوی رامپوری کا مضمون توقیتی تعداد برہان ۱۹۶۸ء مئی تا دسمبر دیکھئے جس میں مولانا موصوف نے خوب ثابت کیا ہے کہ عرب چاند کے منازل سے خوب واقف تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امی کہہ کر ہم کو اس دردسری سے بچایا۔ مگر معلوم نہیں کیسے ان اصحاب نے جن کی خاکِ پا میرے لئے نجات کا باعث ہے یہ لکھ دیا کہ فن ہئیت سے مطلع کب بدل جاتا ہے اور اس سے مسافت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ ذی الحج میں تو

۶ دن انتظار کرنا ضروری ہے۔ اور اگر رمضان شریف کے لئے انتظار ۳۰ دن کرنا ہو تو ۱۶×۳۰=۴۸۰ کروہ=۵۵۰ میل انگریزی یا اس سے زیادہ مقرر کریں اس میں فن ہئیت سے کام نہ لیا جائے اور پھر چاہے خبر ریڈیو کے ذریعہ سے آجائے۔ ریڈیو کو علماء کرام جانیں کہ کس طرح اس سے کام لیا جائے۔ فاصلہ کے معاملہ میں سعادت اس میں ہے کہ وہ حضرت کریبؓ والی حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے (جب کہ مدینہ طیبہ میں ۲۹ واں روزہ تھا) اس فاصلہ سے کم ہو جو دمشق (شام) اور مدینہ طیبہ میں ہے یعنی ۶۲۸ میل کے قریب۔ اور خبر آنے کا زمانہ بھی ۲۹ دن سے کم ہو یعنی ۶ دن ہو یا ۱۸ دن یا ۱۵ دن یا ۲۸ دن ہو۔ بیت المقدس سے مدینہ طیبہ کا فاصلہ ۵۵۰ میل ہے۔

صفحہ ۳۰۷ پر یہ لکھا ہے کہ مکہ مکرمہ اور ریاض کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے۔" حالانکہ ۵۰۸ میل کا فاصلہ ہے۔

صفحہ ۳۰۸: "علم ہئیت کے اعتبار سے جتنی مسافت پر مطلع بدل جائے" خاکسار کا خیال یہ ہے کہ علم ہئیت سے کام نہ لیا جائے۔ علاوہ اس کے جن دو مقامات میں ان کے مطالع میں اشتراک ہوگا آپ کتنے عدم اشتراک کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں۔

صفحہ ۳۰۸: "مقام رویت سے اتنا فاصلہ کہ جہاں عادۃً" چاند نظر آجانا چاہئے۔ (اگر کوئی مانع نہ ہو) قریب ہے اس سے زیادہ بعید ہے۔" اس کی بھی تشریح کی ضرورت ہے۔

صفحہ ۳۰۸: "ایک اقلیم کے تمام حصے قریب ہیں اور دوسری اقلیم میں واقع حصے بعید ہیں" اقلیم جو خط استوا سے ملی ہوئی ہیں وہ قریب ۲۴ ہزار میل لمبی ہیں جس کا آدھا ۱۲ ہزار میل ہوا۔ اسکے یہ معنی ہوئے کہ ۱۲ ہزار میل تک مطلع ایک ہے۔ اور شمالاً اور جنوباً (۷۰۰) سات سو میل ہے۔ کیا اقلیم کے یہ ہی معنی ہیں۔ (ساری دنیا کو ہفت اقلیم مانا گیا تھا) (فتح الباری صفحہ ج ۴)

صفحہ ۳۰۸: مجھے حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصبہ سے ایک مہینہ کی مسافت کے متعلق استدلال سمجھ میں نہیں آیا مہربانی فرما کر اس کی بھی وضاحت کی جائے۔

صفحہ ۳۰۹: "۲۴ فرسخ پر مطلع بدل جاتا ہے" پھر یہ ہی سوال پیدا ہوتا ہے مطلع سے

کیا مطلب ہے؟

ارشاد نبوی کو سامنے رکھتے ہوئے کہ "ہم اُمّی ہیں مہینہ ۲۹ کا یا ۳۰ دن کا" جس کے معنی یہ ہیں کہ مہینہ ۲۸ دن کا یا ۳۱ دن کا نہیں ہوگا اور ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ ایک دن سے زیادہ کا فرق نہیں ہوگا۔ میں نے انیس ۱۹ سالہ دور کے ماتحت بیس ۲۰ سال کے القمر الجدید لیے (یعنی ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۱ء تک) اور ان سے یہ نتیجہ نکلا کہ واقعی اختلاف مطالع معتبر نہیں ہے۔ یعنی حضرت امام ابوحنیفہ رح کا مذہب بالکل صحیح ہے۔

پہلے تو میں نے ۱۲ مہینے ۱۹۵۲ء کے لئے اور یہ اصول قائم کیا کہ اگر ۲۹ کو چاند نہ ہوا تو موجودہ مہینہ ۳۰ دن کا مانا جائے اور کہیں سے خبر نہ منگائی جائے۔ یعنی اصل طریقہ قائم رکھا اور حسب ذیل نتیجہ نکالا۔

پہلا:

مہینہ	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲
دن	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰	۳۰	۲۹	۳۰	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹

دوسرے میں نے یہی ۱۲ مہینے ۱۹۵۲ء کے لئے اور یہ اصول قائم کیا کہ مغرب سے چار ہزار میل سے یعنی ۴ گھنٹے کے بعد اگر خبر آئے تو ۲۹ کا موجودہ مہینہ مان لو۔ اور چار ۴ گھنٹے کے بعد یعنی چار ہزار میل سے زیادہ فاصلہ سے خبر آئے تو ۳۰ دن کا موجودہ مہینہ مان لو۔ حسب ذیل نتیجہ نکالا۔

دوسرا:

مہینہ	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲
دن	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰

یہ دوسرا طریقہ اس وجہ سے لیا کہ اس زمانہ کے معلومات کو سامنے رکھتے ہوئے جب کہ امریکہ نہیں دریافت ہوا تھا اور ربع مسکون کا نظریہ تھا جو ناف عالم یعنی مکہ مکرمہ سے ہر طرف کو

ساٹھ درجہ ہوتا ہے جو مشرق و مغرب چار گھنٹہ کی برابر ہے۔ زمین کا محیط قریب ۲۴ ہزار میل ہے اور یہ ۲۴ گھنٹہ میں طے ہوتا ہے۔ یعنی ہزار میل کا فاصلہ ایک گھنٹہ میں طے ہوتا ہے۔ پندرہ درجہ ایک گھنٹہ میں طے ہوتا ہے۔

تیسرا: تیسرے میں نے یہ ہی بارہ مہینہ ۱۹۵۲ء کے لئے اور یہ اصول قائم کیا کہ مغرب سے ۶ ہزار میل سے یعنی ۶ گھنٹہ کے بعد اگر خبر آئے تو ۲۹ کا موجودہ مہینہ مان لو اور چھ گھنٹہ کے بعد یعنی چھ ہزار میل سے زیادہ فاصلہ سے خبر آئے تو موجودہ مہینہ ۳۰ دن کا مان لو۔ حسب ذیل نتیجہ نکالا۔

تیسرا

مہینہ	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲
دن	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰

یہ تیسرا طریقہ اس وجہ سے لیا کہ قرآن پاک میں جو مشرقین اور مغربین آئے ہیں ان کے یہ معنی لیے گئے ہیں کہ گرما کا مشرق اور سرما کا مشرق اس طرح سے ۳۶۵ مشرق ہوتے ہیں جو قیاس سے بعید ہیں۔ خاکسار کی ناقص سمجھ میں یہ آتا ہے کہ مشرقین سے دو مشارق ایک مشارق فوق افق اور دوسرا مشارق تحت الافق مراد ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ جو کہا گیا ہے چاہے مشرق سے خبر آئے یا مغرب سے تو اس سے مراد مشارق فوق الافق اور مغارب فوق الافق ہیں۔

چوتھا: چوتھے میں نے یہ ہی ۱۲ مہینہ ۱۹۵۲ء کے لئے اور یہ اصول قائم کیا کہ مغرب سے ۱۲ ہزار میل سے یعنی ۱۲ گھنٹے سے کم کے بعد خبر آئے تو ۲۹ کا موجودہ مہینہ مان لو اور ۱۲ گھنٹہ سے زیادہ کے بعد یعنی مشرق کیطرف سے خبر آئے تو ۳۰ دن کا موجودہ مہینہ مان لو مغرب کیطرف سے ۱۲ گھنٹہ کے معنی یہ ہیں کہ مشرق کی طرف سے ۱۱ گھنٹہ۔ حسب ذیل نتیجہ نکالا۔

چوتھا

مہینہ	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲
دن	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰	۳۰	۲۹	۳۰	۳۰	۲۹	۳۰

یہ چوتھا طریقہ اس وجہ سے لیا تاکہ مشارق و مغارب تحت الافق بھی لے لئے جائیں۔ آخری مشرق تحت الافق اور آخری مغرب تحت الافق ایک ہی ہیں۔ یعنی یہ وہ مقام ہے جو مغرب کی طرف سے ۱۲ گھنٹے اور مشرق کی طرف سے بھی ۱۲ گھنٹے کی دوری پر ہے۔

میں چاروں کو ایک جگہ لکھے دیتا ہوں تاکہ اندازہ لگانے میں آسانی ہو۔

مہینہ		۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲
پہلا طریقہ رویت	دن	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰	۳۰	۲۹	۳۰	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹
دوسرا طریقہ ربع مسکون	دن	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰
تیسرا طریقہ فوق الافق	دن	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰
چوتھا طریقہ تحت الافق	دن	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰	۲۹	۳۰	۳۰	۲۹	۳۰	۳۰	۲۹	۳۰

دو اصول لکھنے سے رہ گئے۔ (۱) جب ۲۸ دن یا ۲۸ دن سے زیادہ کے بعد خبر آئے، تو اس موجودہ مہینہ کو ۲۹ دن کا مان لو۔ (۲) جب ۳۰ دن یا ۳۰ دن سے زیادہ کے بعد خبر مغرب کی طرف سے آئے تو اس موجودہ مہینہ کو ۳۰ دن کا مان لو۔ ۲۸ دن والا قصہ تو رویت والے طریقہ میں بھی پڑتا ہے جو اعتراض کی بات نہیں ہے۔ ۳۰ دن سے زیادہ والا اس وجہ سے گوارا کیا جاسکتا ہے کہ ۳۰ تاریخ کو چاند دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ربع مسکون والا طریقہ ایسا ہے جس میں نہ ۲۸ کا معاملہ ہے اور نہ ۳۰ کا یعنی چار ہزار میل تک دونوں طرف کوئی حرج نہیں۔ یہ یاد رہے کہ اگر ۲۷ دن کے بعد خبر آئے تو ۲۸ کا مہینہ مانا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے۔ اور اگر ۳۱ دن بعد خبر آئے تو ۳۱ دن کا مہینہ مانا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ اس لئے ۲۷۔ ۲۸۔ ۳۱۔ ۳۲ کا اندیشہ نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض فقہاء کرام کی عبارتوں سے نتیجہ نکلتا ہے۔

اس اختلاف مطالع کے معاملہ میں اگر غور کرنے کی ضرورت ہے تو شمالاً جنوباً ہے۔ جب کہ ان عرض البلاد سے بحث کی جاتی ہے جو تحت الاعتدال نہیں ہیں۔ یعنی ۵۴ درجہ سے زیادہ ہیں جہاں عشاء کا وقت بعض ایام میں نہیں رہتا ہے یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ جہاں ظہر کا وقت جاڑوں میں

بہت ہی کم ہوتا ہے بلکہ بعض جگہ عصر کے وقت سے ظہر کا وقت کم ہوتا ہے۔ جہاں سورج اور چاند کئی کئی دن افق سے نیچے رہتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مطلع سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ مسافت سے ہے جو قرون اولیٰ میں ممکن تھی یعنی پیدل یا بیل۔ گھوڑا۔ اونٹ وغیرہ کے زمانہ میں۔

قصر کی رفتار اور آرام کرنے کے وقفہ کو نظر انداز کرتے ہوئے گھوڑا دوڑنے کی رفتار ۱۲ میل فی گھنٹہ اور ۲۴ گھنٹہ روزمرہ ۶ دن تک ۱۲ × ۲۴ × ۶ = ۱۷۲۸ میل یعنی دو ہزار میل تقریباً ہوتے ہیں۔ اور بجائے ۶ دن کے ۱۰ دن کا زمانہ لیتے ہیں تو ۲۸۸۰ میل ہوتا ہے۔ اگر زمانہ ۳۰ دن لیا جائے ۸۶۴۰ میل ہوتے ہیں۔ میں نے (۱۲۰۰۰) ۱۲ ہزار میل تک نکالا کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ خاکسار کی درخواست ہے کہ فن ہیئت سے کام نہ لیا جائے اور نہ اس کا ذکر کیا جائے بلکہ قرون اولیٰ کی رفتار اور آرام کرنے کے وقفہ سے کام لیا جائے اور یہ بھی درخواست ہے کہ فاصلہ دمشق اور مدینہ طیبہ کے فاصلہ سے کم ہو اور خبر آنے کا وقفہ ۲۹ دن سے کم ہو یعنی ۶ دن ہو یا ۱۰ دن ہو یا ۲۰ دن ہو۔ غرض ہم کو حضرت کریبؓ والی حدیث کو بنیاد بنانا چاہیے۔ اور اصل میں چاہیے تو یہ کہ تراویح کے لیے ۱۲ میل تقریباً کی خبر سے کام لیا جائے اور سحر کے لیے ۵۶ میل تقریباً سے کام لیا جائے اور نصف النہار شرعی کے لیے یعنی روزہ رمضان کی نیت کے لیے اگر کچھ کھایا پیا نہیں ہے تو ۲۰۰ میل تقریباً سے کام لیا جائے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس طریقہ پر کام کیا جائے کہ جس سے قرون اولیٰ کے طریقہ کا اکرام و احترام ثابت ہو۔ مسافت کا معاملہ تو اس طریقہ پر مقرر کیا جائے چاہے خبر ریڈیو کے ذریعہ سے آئے اور ریڈیو کو کس طرح کام میں لایا جائے اس کو علماء کرام طے فرمائیں۔

بعض اصحاب یہ فرمائیں گے کہ میں فن ہیئت کے خلاف ہوں اور فن ہیئت سے کام بھی لے رہا ہوں۔ میں مجبوراً ایسا کرتا ہوں۔ اس وجہ سے کہ مکہ مکرمہ میں جو جنتری آئندہ سال کے لئے حکومت حجاز ایک سال پہلے تیار کراتی ہے وہ رویت کے مطابق نہیں ہوتی ہے۔ کبھی کبھی دو دن کا فرق ہندوستان کی رویت سے ہوتا ہے جو بالکل صحیح نہیں ہے۔ میں نے بارہ سے زیادہ چاند ایسے نکالے ہیں جو قمر غیر مرئی سے پہلے یعنی القمر الجدید سے پہلے دیکھ لئے گئے جو بالکل ناممکن ہے۔ ۱۳۸۹ھ یعنی ۱۹۷۰ء کے شوال

اور ذی قعدہ دونوں مل کر ۶۱ دن کے ہوئے۔ یعنی ایک مہینہ ۳۰ دن کا اور ایک مہینہ ۳۱ دن کا ایک مہینہ ۲۹ دن کا اور ایک مہینہ ۳۲ دن کا۔ اور دعویٰ یہ ہے کہ رمضان شریف۔ شوال و ذی الحج کے چاند کے لئے رویت سے کام لیا جاتا ہے اور باقی نو (۹) مہینہ کے لئے جنتری سے کام لیا جاتا ہے۔ تفصیل کے لئے برہان جنوری ۱۹۷۸ء ملاحظہ ہو۔

میں نے علماء کے سامنے اپنے خیالات اور معلومات رکھ دیئے۔ اب ان کا کام ہے کہ وہ ان کو پسند فرمائیں یا جہاں شک ہو یا تشنگی ہو اس کے متعلق میں خدمت کے لئے تیار ہوں۔ میں تو خود حاضر ہوا ہوں اور بات صاف کی ہے لیکن اب مجبور ہو گیا ہوں کہیں آنا جانا نہیں ہو سکتا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ ہندوستان کے علماء ابھی تک صحیح طریقہ پر قائم ہیں اور رویت کے مطابق تاریخیں مقرر کرتے ہیں۔ میں نے دوسرے ممالک کی جنتریاں دیکھی ہیں وہ رویت کے مطابق نہیں ہیں۔ بعض القمر الجدید کے دن کو یکم قرار دیدیتے ہیں اور بعض دوسرے دن کو یعنی رویت کے دن کو یکم قرار دیتے ہیں جو صحیح نہیں ہے۔

آج کل سفر میں بہت آسانی ہوگئی ہے اور رفتار بھی کہیں ریل کی ہے اور کہیں ہوائی جہاز کی ہے۔ لیکن قصر کی مسافت کی مقدار وہ ہی ۴۸ میل شرعی ہے جو میرے لئے خوشی کی بات ہے کہ ابھی ہم قرون اولے کے طریقہ پر قائم ہیں، اور ہونا بھی یہی چاہئے۔ مگر معلوم نہیں کیسے فن ہئیت سے کام لے رہے ہیں اور بعض جگہ لینے کی کوشش ہے۔ میں کج فہم بہت سنتا رہتا ہوں کہ یہ بدعت وہ بدعت میری علماء کرام سے درخواست ہے کہ وہ فن ہئیت سے کام لینے پر بھی روشنی ڈالیں۔ کہاں فن ہیئت سے کام لے سکتے ہیں اور کہاں کام لینا بدعت ہے۔

انشاء اللہ تعالیٰ مفصل مضمون اختلاف مطالع پر لکھوں گا جس میں حضرت امام ابوحنیفہ رح کے نظریہ کو کہ "اختلاف مطالع معتبر نہیں ہے" ثابت کروں گا۔

حجاز مقدس میں قمری تاریخ کا نظام

مولانا محمد منظور نعمانی

"برہان" کے جنوری کے شمارہ میں جناب حاجی احسان الحق صاحب بجنوری (سابق لکچرر طبعیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے،

"کیا حجاز میں رویت ہلال کا اہتمام ہوتا ہے"

اس مضمون میں ناچیز راقم سطور کے بارہ میں لکھا گیا ہے کہ میں نے کبھی صاحب مضمون کو بتلایا کہ حجاز پاک میں

"تین مہینوں کا چاند یعنی رمضان شریف، عید الفطر اور ذی الحجہ کا دیکھا جاتا ہے۔ اور باقی نو مہینوں کی یکم بذریعہ جنتری طے ہوتی ہے"۔

برہان بابت جنوری ۱۹۷۱ء صفحہ ۳۰

مجھے برہان کے ناظرین کرام سے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ صاحب مضمون نے یہ جو بات میری طرف منسوب کر کے لکھا ہے، صحیح نہیں ہے، بلکہ میرے نزدیک تو یہ نہایت مہمل اور ناقابل فہم بات ہے کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے ۹ مہینوں کی یکم تو جنتری سے طے ہو .... اور تین مہینوں کی یکم کا تعین چاند دیکھ کر کیا جائے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ چونکہ سعودی حکومت اور پوری سعودی مملکت کا سارا نظام اور کاروبار عربی مہینوں اور قمری تاریخوں کے حساب سے چلتا ہی یعنی عدالتوں، سرکاری دفتروں، تعلیم گاہوں حتیٰ کہ پوسٹ آفس وغیرہ میں بھی قمری مہینوں کی تاریخیں چلتی ہیں اس لیے ہمیشہ نیا قمری سال شروع ہونے

سے پہلے ہی اگلے سال کے پورے بارہ مہینوں کی تقویم (جنتری) سرکاری طور پر چھپ کر شائع ہو جاتی ہے۔ یہ بالکل اسی طرح کی جنتری ہوتی ہے جس طرح کہ ہمارے ہاں ہندوستان میں بھی بہت سی ایسی ڈائریاں اور جنتریاں شائع ہوتی ہیں جن میں قمری تاریخیں بھی دی جاتی ہیں ــ ظاہر ہے کہ قمری مہینوں کی جو جنتری سال شروع ہونے سے پہلے ہی شائع ہوگی اس کے بارہ میں چاند دیکھ کر تاریخ مقرر کرنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کی تاریخیں رؤیت ہلال کے حساب سے کسی مہینہ میں مطابق ہو جاتی ہیں اور کسی مہینہ میں کچھ فرق و اختلاف بھی ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ ہمارے ہاں کی جنتریوں اور کلنڈروں کی قمری تاریخوں میں ہوتا ہے ــــــ حجاز پاک میں اس تقویمی تاریخ کو "میقاتی" کہتے ہیں ــــــ وہاں اسکی خاص اہمیت یہی ہے کہ حکومت اور بازاروں کا سارا کاروبار اسی کے مطابق چلتا ہے لیکن عبادات صوم رمضان، تراویح، اعتکاف، عید الفطر، اور حج و قربانی وغیرہ کے دنوں کا تعین اس جنتری سے نہیں کیا جاتا بلکہ شرعی قاعدہ کے مطابق رؤیت ہلال کے ثبوت پر کیا جاتا ہے ــ اور اس وجہ سے بسا اوقات یہ تاریخیں جنتری والی میقاتی تاریخوں سے مختلف بھی ہو جاتی ہیں ــــــ اور خود دیکھا ہے کہ بہت سے بے چارے ناواقف حاجی تاریخوں کے اس اختلاف کی وجہ سے طرح طرح کی چہ میگوئیاں اور عجیب و غریب قسم کے تبصرے کرتے ہیں۔

صاحب مضمون جناب حاجی احسان الحق صاحب سے میں نے یہی بات اسی تفصیل سے کہی تھی اور اس لئے کہی تھی کہ مجھے ان کی باتوں سے محسوس ہوا تھا کہ وہ اس بارے واقف نہیں ہیں۔ اور اس ناواقفیت کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیوں اور بے اصل بدگمانیوں میں مبتلا ہیں ــــــ چنانچہ جب میں نے انہیں یہ بات بتائی اور یہ بھی بتایا کہ حجاز مقدس کی وہ سرکاری جنتری میرے پاس بھی ہر سال آتی ہے۔ تو انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ ایک پرانی جنتری دیکھنے کے لئے میں ان کو بھی بھیج دوں۔ چنانچہ میں نے ۱۳۸۳ھ کی جنتری ان کو بھیج دی جس کا انھوں نے اپنے اس مضمون میں ذکر بھی فرمایا ہے۔

میں نے انہیں یہ بھی بتلایا تھا کہ رویت ہلال کے ثبوت کا فیصلہ شہادت وغیرہ کی بنیاد پر سعودی حکومت نہیں کرتی بلکہ وہاں کے مفتی اعظم کرتے ہیں، حکومت اس کا اعلان کرتی ہے اور اس پر عمل کرتی ہے

اور مفتی صاحب کو ہم لوگ ذاتی طور پر بھی جانتے ہیں وہ بہت بڑے عالم ہیں۔ ان کے بارے میں یہ شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ رویت ہلال کے فیصلے میں جس پر رمضان کے روزوں اور حج جیسے اہم ارکان دفرائض کا دارومدار ہے۔ کسی سہل انگاری اور بے احتیاطی سے کام لیں گے۔

لیکن ان بزرگوار نے میری اس سادی گفتگو کا مطلب یہ سمجھا اور یہ یاد رکھا کہ حجاز میں "تین مہینوں کا چاند دیکھا جاتا ہے اور باقی ۹ مہینوں کی یکم بذریعہ جنتری طے ہوتی ہے۔ (لاحول ولاقوۃ الا باللہ)

صاحب مضمون نے اسی سلسلہ میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ کہ

"میں مولانا علی میاں ندوی کا مشکور ہوں کہ انھوں نے اس معاملہ کو میرے (اکتوبر ۶۸ء میں) لکھنے پر مکہ مکرمہ میں چھیڑا۔"

برہان بابت جنوری ۷۱ء صفحہ ۳۳

اکتوبر ۶۸ء میں رابطۂ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) کے اجلاس میں مولانا علی میاں اور ناچیز راقم سطور دونوں ساتھ ہی گئے تھے اور ساتھ ہی رہے تھے، میرے علم میں یہ بات بالکل نہیں تھی کہ مولانا نے اس معاملہ کو وہاں چھیڑا ہو اور میں اس کو مستبعد بھی سمجھتا تھا کیوں کہ میری طرح ... مولانا موصوف کو بھی یہ بات معلوم ہے کہ وہاں رویت ہلال کے ثبوت کا فیصلہ مفتی اکبر کی طرف سے ہوتا ہے اور شرعی قاعدہ کے مطابق ہوتا ہے تو اس میں کسی گفتگو کی کیا گنجائش ہے۔ اس لئے "برہان" میں یہ پڑھ کر مجھے تعجب ہوا۔ پھر بھی میں نے ضروری سمجھا کہ مولانا علی میاں سے دریافت کروں۔ وہ ان دنوں لکھنؤ سے باہر تھے۔ کل ہی (۲۰ر مارچ ۷۱ء) وہ آئے تو میں نے ان سے "برہان" کے اس مضمون کا ذکر کیا اور دریافت کیا، تو انہیں سخت حیرت ہوئی کہ ان کے متعلق یہ بات کیسے لکھ دی گئی۔ اور انھوں نے بتایا کہ میں نے کبھی اس معاملہ میں وہاں کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ اللہ ہی کو علم ہے کہ صاحب مضمون نے کس غلط فہمی یا کس غلط اطلاع کی بنا پر مولانا

کے بارے میں یہ لکھ دیا۔

اس مضمون کا ایک اور عجوبہ بھی قابل ذکر ہے۔ ذی الحجہ ۹۰ھ کا ذکر کرتے ہوئے صاحب مضمون نے لکھا ہے۔ کہ۔ "اتوار کی پہلی ہوئی اور حج پیر کو ہوا!"

پھر اس پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا ہے۔

"لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ یکم شوال ۹۰ھ منگل کی بذریعہ رویت ہوئی۔ اور یکم ذی الحجہ اتوار کی بذریعہ رویت ہوئی، اس درمیان میں دو چاند ہوئے ایک تیس ۳۰ کا اور دوسرا انتیس ۲۹ کا۔۔۔ یہ اس حدیث کے خلاف ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ مہینہ ۲۹ کا یا ۳۰ کا ہوتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شہادتیں ہوتی بھی ہیں تو اعتبار کے لائق نہیں ہوتیں۔" صہ ۳۴

سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی مہمل بات کی کیا توجیہ کی جائے۔ اگر کسی نے ان سے تفریحاً و مزاحاً یا کسی غلط فہمی کی بنا پر یہ بات بیان کی تھی تو انہیں سوچنا چاہئے تھا کہ حجاز کے مفتیٔ اعظم اور دوسرے ذمہ دار ناواقف تو نہیں ہو سکتے کہ انہیں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ قمری مہینہ کبھی ۳۱ کا نہیں ہو سکتا اور مہینے کے ۳۰ دن پورے ہو جانے پر چاند نہ دکھائی دینے کی صورت میں بھی اگلے نئے مہینہ کی پہلی تاریخ ہو جاتی ہے۔۔۔ لیکن انھوں نے اتنا سوچنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی اور اس کو قبول فرما کر اس پر یہ تبصرہ فرما دیا، حالانکہ وہ آسانی سے تحقیق فرما سکتے تھے کہ ذی الحجہ ۹۰ھ کی پہلی تاریخ کس دن ہوئی تھی اور حج کس دن ہوا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ ۹۰ھ میں حجاز مقدس میں یکم ذی الحجہ اتوار کی نہیں بلکہ سینچر کی ہوئی تھی اور حج یعنی وقوف عرفہ پیر کو نہیں بلکہ اتوار کو ہوا تھا اور شوال اور ذی قعدہ دونوں مہینے تیس ۳۰ تیس ۳۰ دن کے ہوئے تھے۔ حیرت ہے کہ صاحب مضمون اپنی اس ذہنی کیفیت کے باوجود اس طرح کے مضامین لکھنے کا اپنے کو کیوں مکلف سمجھتے ہیں۔

اس خامہ فرسائی سے اس عاجز کا مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ " برہان " میں شائع شدہ مضمون میں جو غلط بات میری طرف سے منسوب کر کے لکھ دی گئی تھی اس کی تصحیح ہو جائے اور ساتھ ہی ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ صاحب مضمون کا حال اور اندازِ فکر کیا ہے۔ اور پھر ان کے اس طرح کے مضامین لوگوں کے لئے ذہنی خلجان کا باعث نہ بنیں۔

آخر میں مناسب سمجھتا ہوں کہ حجاز مقدس میں رؤیت ہلال کے ثبوت اور اس سلسلے میں وہاں کے ذمہ داروں کے طریق کار کے بارہ میں کچھ لکھ کے اس کو ختم کر دوں۔ عوام ہی نہیں بلکہ بہت سے خواص اور اہل علم کو بھی دیکھا ہے کہ وہاں کا طریق عمل اور ان حضرات کا ....

فقہی مسلک نہ معلوم ہونے کی وجہ سے طرح طرح کے خلجانات اس سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ سب سے پہلی اور قابل ذکر اور قابل لحاظ بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ علماء نجد جو سعودی حکومت میں امور مذہبی کے عموماً ذمہ دار ہیں اور ذمہ دارانہ مناصب پر ہیں وہ حنبلی المذہب ہیں اور متاخرین میں خاص طور سے قاضی شوکانی کی تحقیقات پر ان کا اعتماد ہے اور جس طرح حنفیہ کا اصل مشہور مذہب (جو فقہ حنفی کی تقریباً سب ہی کتابوں میں لکھا ہے) یہ ہے کہ رویت ہلال میں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں ہے (اور اس بنا پر دنیا کے کسی حصہ میں بھی رویت ثابت ہو جائے تو معلوم ہو جانے پر ساری دنیا میں اس کے مطابق عمل ہوگا اور ہر جگہ رویت تسلیم کر لی جائے گی)، یہی مذہب ان حنابلہ کا بھی ہے۔ (قاضی شوکانی نے نیل الاوطار میں اسی کو ترجیح دی ہے)

دوسری قابل ذکر اور قابل لحاظ بات یہ ہے کہ خاص شرائط کے ساتھ ٹیلی فون وغیرہ کی خبر ان کے نزدیک رویت ہلال کے سلسلہ میں معتبر ہے، اس لئے اگر ان کو مثلاً مصر سے یا مراکش یا کسی دوسرے مغربی ملک سے ٹیلی فون وغیرہ کے ذریعہ معلوم ہو جائے کہ وہاں رؤیت ہو گئی تو وہ رؤیت ان کے حنفی مسلک پر ان کے نزدیک اپنے ہاں کے لئے بھی بلکہ ساری دنیا کے لئے قابل تسلیم اور واجب العمل ہوگی،

تیسری اور آخری قابل ذکر بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ خود مملکت سعودیہ کے مشرقی علاقہ

(مثلاً ظہران، دمام، الخبر) اور مغربی علاقہ (مثلاً تبوک) کے مابین اتنا فاصلہ ہے کہ اس کا پورا امکان ہے کہ مغربی علاقہ میں رویت ہو جائے اور مشرقی علاقہ میں بلکہ ریاض اور مکہ مکرمہ میں بھی نہ ہو — اور مملکت کے ہر چھوٹے بڑے شہر اور قصبہ میں بھی حکومت کی طرف سے قاضی مقرر ہیں جو علماء ہیں اور حکومت کا یہ پورا شعبہ مفتیٔ اکبر کے ماتحت ہے — اب فرض کیجئے کہ مملکت کے آخری مغربی علاقہ میں مثلاً تبوک میں کسی نے چاند دیکھا، اس نے وہاں کے قاضی کے سامنے شہادت دی، قاضی اسی وقت مفتیٔ اکبر کو (جن کا مستقر دارالسلطنت ریاض ہے) ٹیلی فون سے اس کی اطلاع دیں گے، اس مقصد کے لئے حکومت کی جانب سے یہ انتظام ہے کہ ٹیلی فون کا رابطہ فوراً قائم ہو جائے۔ مفتیٔ اکبر تبوک کے قاضی کی اس باضابطہ اطلاع کی بنا پر رؤیت ہلال کے ثبوت کا حکم دیں گے اور حکومت کو اس سے مطلع کر دیں گے۔ حکومت اسی وقت ریڈیو وغیرہ سے اس کا باقاعدہ اعلان کر دے گی۔

یہ ہے وہاں کا نظام اور طریق عمل، اور اس کی وجہ سے قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ حجاز مقدس میں رمضان یا عید ہندوستان و پاکستان سے اکثر ایک دن اور کبھی کبھی دو دن پہلے ہو جاتی ہے۔

امید ہے کہ اس تفصیل کے معلوم ہو جانے کے بعد اس سلسلہ کے بہت سے خلجانات دور ہو جائیں گے۔

محمد منظور نعمانی

۱۲ر مارچ ۱۹۶۱ء

چند روز جاپان میں

مذہب اور امن پر دوسری عالمی کانفرنس

(۱)

سعید احمد اکبر آبادی

گذشتہ ماہ اکتوبر میں جاپان کے مشہور شہر کوئٹو میں ایک نہایت عظیم الشان عالمی کانفرنس مذہب اور امن پر منعقد ہوئی تھی۔ اس میں میری شرکت کی تقریب یہ ہوئی کہ غالباً فروری ۷۰ء میں محب محترم و مکرم جناب خواجہ غلام السیدین صاحب جو ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے کانفرنس کی مجلس عاملہ کے ایک باوقار اور باثر ممبر ہیں انھوں نے مجھ کو لکھا کہ اس مرتبہ کانفرنس اکتوبر میں جاپان میں ہو رہی ہے اور وہ ہندوستان کے مندوبین میں میرے نام کو بھی شامل کرنے کی سفارش کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب میں جناب موصوف کا شکریہ ادا کیا۔ اور لکھا کہ بہت اچھا۔ اگر مجھ کو دعوت ملی تو میں منظور کر لوں گا۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے بعد کانفرنس کے صدر اور کانفرنس کی ہندوستانی شاخ کے صدر ڈاکٹر رادھا کرشن کی طرف سے باقاعدہ دعوت نامہ بھی آ گیا۔ لیکن اس میں لکھا تھا کہ چونکہ کانفرنس میں کم و بیش تین سو بیرونی نمائندوں کی شرکت متوقع ہے اس بنا پر کانفرنس صرف ایک طرف کا ہوائی جہاز کا کرایہ دے سکے گی۔ دوسری طرف کا کرایہ خود دینا ہوگا یا کسی اور ادارہ سے اس کا انتظام کرنا ہوگا۔ میں نے یہ دعوت قبول کر لی لیکن ساتھ ہی تحریر کیا کہ دوسری طرف کا کرایہ نہ میں خود دے سکتا ہوں اور نہ میں کسی ادارہ سے اس کی درخواست کر سکتا ہوں۔ اس لئے اگر کانفرنس ہی میرے آمد و رفت کے کرایہ کا انتظام کر سکتی ہے تو خیر! ورنہ میری طرف سے معذرت! اس کے جواب میں ڈاکٹر رادھا کرشن نے جو گاندھی پیس فاؤنڈیشن نئی دہلی کے سکریٹری بھی ہیں لکھا کہ ہم اپنے ہاں مجلس عاملہ کی میٹنگ میں اس پر غور کریں گے اور جو فیصلہ ہوگا آپ کو اس سے مطلع کر دیں گے۔ اس کے بعد اس "فیصلہ" کی

تو کوئی اطلاع ملی نہیں۔ البتہ ہندوستان سے ڈیلی گیشن کے جانے کے سلسلہ میں جو تیاریاں ہو رہی تھیں ان سے مجھ کو برابر باخبر رکھا گیا۔ اسی اثنا میں خواجہ غلام السیدین صاحب کناڈا اور یورپ کے ایک طویل دورے پر ہندوستان سے باہر چلے گئے تھے۔ جب وہ واپس آ گئے تو میں نے غالباً اگست میں ان کو لکھا کہ "کانفرنس کے انعقاد میں صرف دو مہینے باقی رہ گئے ہیں اور مجھے اب تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ میں جا سکوں گا یا نہیں۔ اور یہ میں اس غرض سے پوچھتا ہوں کہ اگر جانا ہو تو میں مقالہ لکھوں"۔ موصوف نے حسب عادت فوراً جواب دیا اور لکھا: "کانفرنس تو پورا کرایہ دینے سے معذور ہے۔ البتہ میں آپ کی یونیورسٹی کے وائس چانسلر (ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب) کو لکھ رہا ہوں کہ وہ یونیورسٹی کی طرف سے آپ کے لئے نصف یعنی ایک طرف کے کرایہ کا انتظام کر دیں۔ رہا مقالہ تو آپ کو وہاں مقالہ نہیں پڑھنا ہے۔ بلکہ صرف بحث مباحثہ میں حصہ لینا ہے۔

اس خط کے بعد میں مطمئن ہو کر بیٹھ گیا کہ مقالہ لکھنا تو ہے نہیں۔ اب جانا ہوا تو فبہا اور نہ جانا ہوا تو کیا غم! السیدین صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ "میں اس معاملہ میں خود بھی وائس چانسلر صاحب سے گفتگو کر لوں"۔ لیکن افسوس ہے میں اس کی تعمیل نہیں کر سکا۔ کیوں کہ گفتگو کے معنی درخواست کے تھے اور اللہ کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے کہ اس نے اپنے حبیب پاک کے صدقے میں مجھ کو اس ننگ سے محفوظ رکھا ہے۔[1]

نظر ہے ابرِ کرم پر درختِ صحرا ہوں — کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجکو

---

[1] والد مرحوم کا یہ فقرہ اکثر یاد آتا ہے۔ بچپن میں کس محبت و شفقت سے فرمایا کرتے تھے: "میری یہ تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی کہ بیٹا سعید کبھی تو مجھ سے کسی چیز کی فرمائش کرتا۔ اور میں اس کے جواب میں کہتا کہ "ابا! جب آپ خود ہی میری ہر بات کا خیال رکھتے ہیں تو میں فرمائش کیوں کروں"۔ تو فرماتے "اگر یہی اعتماد اور بھروسہ خدا پر پیدا کر کے تم نے اس اصول کو اپنا لیا تو زندگی میں کبھی نامراد نہیں رہو گے۔ اور اس کے بعد یہ شعر پڑھتے۔

کارسازِ ما بسازِ کارِ ما — فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

وائس چانسلر صاحب سے یونیورسٹی کے معاملات میں اور یوں بھی آئے دن ملاقات اور گفتگو رہتی تھی لیکن اس چیز کا کبھی ذکر بھی نہیں آیا اور نہ میں نے خواجہ صاحب کو ہی لکھا کہ وہ ایک اور خط یاددہانی کا لکھ دیں۔ آخر ہوتے ہوتے اکتوبر کے مہینہ کا پہلا ہفتہ گذر گیا اور کانفرنس ۱۶ر سے شروع تھی اور ڈیلیگیشن ۱۳ر کو نئی دہلی سے روانہ ہو رہا تھا۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ اب جاپان جانے کی کیا توقع ہو سکتی تھی۔ میں صبر کرکے بیٹھ گیا۔ لیکن عجب اتفاق دیکھئے۔ ۱۰ر اکتوبر کو اچانک وائس چانسلر صاحب نے مجھ کو یاد فرمایا اور بولے: کافی دن ہوئے خواجہ غلام السیدین صاحب کا خط آپ کے سفر جاپان کے بارہ میں آیا تھا۔ یہ خط میری نظر سے ضرور گذرا تھا لیکن مصروفیتوں کے باعث اس پر کارروائی کرنا یاد نہیں رہا۔ پرسوں دہلی میں خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے یاددہانی کی اور اب ان کا پھر ٹیلیفون بھی آیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا: میں نے معلوم کر لیا ہے۔ جاپان کا ایک طرف کا کرایہ تین ہزار روپے کے لگ بھگ ہے۔ یونیورسٹی آپ کو یہ روپے دے گی۔ آپ تیاری کر لیں۔

جن لوگوں کو ہوائی جہاز سے سفر کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ ہوائی جہاز سے دنوں کی مسافت گھنٹوں میں طے تو ہو جاتی ہے۔ لیکن روانگی سے پہلے جن ضروری چیزوں کی تکمیل درکار ہے اسکے لئے کم از کم ایک ہفتہ چاہئے۔ اور یہاں لے دے کے صرف دو روز باقی تھے اور وہ بھی اس طرح کہ اگلا دن یعنی ۱۱ر اکتوبر اتوار کا تھا جب کہ دفاتر بند ہوتے ہیں۔ اس لئے میں نے وائس چانسلر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کہا: "وقت بہت کم ہے بہرحال قسمت آزمائی کرتا ہوں"۔ دوسرے روز صبح کی ٹرین سے دہلی کے لئے روانہ ہوا۔ وہاں بارہ بجے کے قریب دفتر "برہان" میں پہنچ کر ڈاکٹر رادھاکرشن کو فون کیا۔ حسن اتفاق سے اتوار ہونے کے باوجود آج اس وقت بھی وہ دفتر میں موجود تھے۔ گفتگو ہوئی تو میں نے صورت حال بیان کی۔ انھوں نے کہا آپ پریشان نہ ہوں ساڑھے تین بجے میرے دفتر میں آجایئے سب کام مکمل ہوجائیں گے۔ چنانچہ ٹھیک وقت پر میں گاندھی پیس فاونڈیشن کے دفتر میں پہنچا تو وہاں ٹریولنگ ایجنٹ موجود تھے۔ انٹرنیشنل پاسپورٹ میرے پاس تھا ہی۔ انھوں نے فوراً چند فارموں اور کاغذات پر میرے دستخط لئے اور ان کی خانہ پری خود کر دی۔ میں

شام کی ٹرین سے علی گڈھ واپس آکر دوسرے دن صبح کے وقت وائس چانسلر صاحب سے ملا۔ اور ان کو روئداد سنائی تو خوش ہوئے اور فوراً ٹریژرر کو لکھا کہ کرایہ کی رقم کا چک ٹریول ایجنٹ کے نام لکھ کر میرے حوالہ کر دیا جائے۔ ہم یونیورسٹی کے لوگوں کو پی فارم یونیورسٹی کی طرف سے NO OBJECTION CARTIFICAT کے بغیر نہیں مل سکتا۔ اس لئے اسسٹنٹ رجسٹرار صاحب سے مل کر یہ سرٹیفیکیٹ حاصل کیا۔ بارہ بجے کے قریب ٹریول ایجنٹ کا ایک کارندہ کار کے ذریعہ دہلی سے علی گڈھ پہنچا اور مجھ سے چک اور سرٹیفیکیٹ لے کر چلا گیا تاکہ پی فارم حاصل کرنے کے بعد ٹکٹ خرید کیا جا سکے۔ یہ نے یہ تفصیل اس جذبۂ تشکر کے اظہار کے لئے سنائی ہے جو اس معاملہ میں میرے دل میں جناب خواجہ غلام السیدین صاحب اور وائس چانسلر صاحب کے لئے ہے۔ لیکن ناسپاسی ہوگی اگر اس سلسلہ میں اپنے ایک اور محسن کا ذکر نہ کروں۔ ڈاکٹر ابوالنصر معزالدین صاحب جو پہلے یونیورسٹی کے چیف میڈیکل آفیسر تھے اور اب اس عہدہ سے سبکدوش ہو کر ہیلتھ آفیسر ہیں میرے دیرینہ کرم فرما اور بے تکلف دوست ہیں۔ میں جب وائس چانسلر صاحب سے بات کر کے ان کی کوٹھی سے نکل رہا تھا۔ تو ڈاکٹر صاحب موصوف سے ملاقات ہو گئی اور جب انہیں معلوم ہوا کہ میں جاپان جا رہا ہوں تو انھوں نے اپنے خاص انداز میں فرمایا: ہیں یہ کیا! آپ میری اجازت کے بغیر کیسے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے یہ کہا اور مجھے اپنے ساتھ کار میں لے کر اپنے مکان پر آئے اور یہاں بڑی تفصیل کے ساتھ میرا ڈاکٹری معائینہ کیا۔ بلڈ پریشر دیکھا۔ قلب کی کیفیت دیکھی۔ سینہ اور نبض کی حالت ملاحظہ کی اور پھر فرمایا: الحمد للہ آپ بالکل فٹ ہیں۔ اب اطمینان سے جا سکتے ہیں اور ساتھ ہی بے خوابی گھبراہٹ۔ تھکن اور کمزوری اور معدوی شکایات کے لئے کچھ دوائیں تجویز کیں اور وقت ضرورت ان کے استعمال کی ہدایت کی۔ یہ معمولی سا واقعہ ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے جس بے ساختہ کرم گستری کا معاملہ کیا آج تک میرے قلب پر اس کا اثر ہے۔

یوں ہی رہی عنایت اہل نظر اگر
گندرے کی اپنی عمر ادائے سپاس میں

دہلی سے روانگی ۱۲ر کو صبح کی ٹرین سے دہلی اور وہاں سے خود ٹریول ایجنٹ کے ساتھ اس کی کار میں شام کو سات بجے کے قریب پالم کے ہوائی اڈے پر پہنچا تو یہاں ڈیلی گیشن کے دوسرے افراد سے بھی ملاقات ہوئی ان میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب بھی تھے جن سے دیرینہ نیازمندی کا تعلق ہے۔ آپ کو دیکھ کر بڑی خوشی اور تقویت ہوئی۔ آپ کے علاوہ پروفیسر ڈاکٹر ہربنس سنگھ جو پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں شعبہ مذہبیات کے صدر اور بڑے لائق شخص ہیں ان سے بھی پہلے سے ملاقات اور بعض امور میں خط و کتابت بھی تھی۔ جہاز دو گھنٹہ لیٹ تھا۔ نو بجے روانہ ہوا اور گیارہ بجے کے قریب ڈم ڈم پہنچ گیا۔ رات کلکتہ میں گذارنی تھی اس لئے ہوائی اڈہ سے روانہ ہو کر گریٹ الیسٹرن ہوٹل میں پہنچے۔ ڈنر طیارہ میں ہی کھا لیا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر ہر شخص کو ایک ایک کمرہ الگ ملا تھا۔ میں نے عشاء کی نماز پڑھی اور سو گیا۔ ۱۳ر کی صبح کو ناشتہ سے فارغ ہو کر آٹھ بجے کے قریب ہم کو ڈم ڈم واپس جانا تھا۔ کلکتہ میں میری زندگی کے بہترین دس برس گذرے ہیں۔ یہاں مجھ کو اخلاص و محبت کی جو متاع گرانمایہ ملی ہے وہ کہیں اور نہیں ملی۔ اس بنا پر کلکتہ اور وہاں کے احباب کے ساتھ مجھ کو ایک قسم کا جذباتی تعلق ہے۔ اب ڈم ڈم اور ہوٹل کی آمد و رفت میں شہر کی انہیں مانوس سڑکوں اور محلوں سے گذر ہوا تو ان دس برسوں کی سرگذشت حیات کا ایک ایک نقش دل و دماغ میں اجاگر ہوتا چلا گیا اور طبیعت کو بے چین کر گیا۔

دل میں اک درد اٹھا آنکھ میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیئے کیا یاد آیا

اللہ اللہ! یہ عہد ماضی کی یاد بھی کیا فتنہ قیامت ہے۔ میں نے کراچی میں دیکھا ہے جو لوگ وہاں عالی شان کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہتے اور عیش و تنعم کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کے سامنے دہلی کے گلی کوچے جن کو عرصہ ہوا وہ خیر آباد کہہ گئے ہیں باتوں باتوں میں اگر کبھی ان کا ذکر آ گیا ہے تو بے ساختہ ان کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے ہیں اور جیسے وہ تھوڑی دیر کے لئے گم سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایرپورٹ پہنچ کر میں نے احمد سعید صاحب ملیح آبادی اور ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی کو ٹیلی فون بھی کیا۔

مگر دونوں جگہ گھنٹی بجتی رہی اور صدائے برنخاست۔

ہانگ کانگ میں قیام یک شب | ساڑھے نو بجے ہمارا جہاز ڈم ڈم سے اڑا اور سات بجے ہانگ کانگ پہنچا دیا۔ ہانگ کانگ میں وقت ہمارے یہاں سے دو گھنٹہ پیچھے ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں اس وقت پانچ کا عمل تھا ابھی دھوپ چھٹکی ہوئی تھی۔ ہانگ کانگ ایک جزیرہ کا نام ہے اس کا خاص شہر وکٹوریہ ہے۔ یہاں انٹرنیشنل نام کے ایک ہوٹل میں ہم لوگوں کے قیام کا پہلے سے انتظام تھا ایرپورٹ سے نکل کر سیدھے یہاں پہنچے اور ہر شخص الگ الگ کمرے میں مقیم ہوگیا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب مرحوم کے ایک صاحبزادہ حسین نظامی کئی برس سے ہانگ کانگ میں مقیم ہیں اور کوئی کاروبار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے ان کو اطلاع کردی تھی۔ اس لئے یہ پہلے سے ہوٹل کے لانج میں بیٹھے انتظار کررہے تھے۔ میں نے ان کو تقسیم وطن سے بہت پہلے اس وقت دیکھا تھا جب کہ خواجہ صاحب سے رسم وراہ تھی اور وہ کھانے پر کبھی کبھی مدعو کرتے تھے۔ اب تئیس چوبیس برس کے بعد دیکھا تھا۔ مگر فوراً پہچان لیا اور ان کا نام لے کر میں نے السلام علیکم کہا تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ وہ مجھے بھول گئے تھے ڈاکٹر صاحب نے تعارف کرایا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے کچھ دیر آرام کیا۔ پھر چوں کہ یہاں فرصت یک شب ہی تھی اس لئے ڈنر اول ہی وقت میں کھا کر باہر نکل گیا اور شہر کے مختلف حصوں کا گشت لگا کر اس کا جائزہ لیا۔ باخبر اصحاب جانتے ہیں کہ ہانگ کانگ صفائی ستھرائی اور خوبصورتی کے لئے مشہور ہے یہاں بعض قیمتی چیزیں بھی اس قدر سستی ہیں کہ یہ اسمگلنگ کا ایک بڑا مرکز ہے۔ پورا شہر دلہن کی طرح آراستہ پیراستہ تھا۔ چینی زبان کے حروف کھلے پتیوں کی طرح حسین اور خوشنما نظر آتے ہیں۔ اس خطہ میں دکانوں کے بڑے بڑے بورڈ اور اشتہارات جو اِدھر اُدھر سڑک کے وسط میں سرخ اور سبز روشنی کے ساتھ آویزاں تھے تو پورا بازار نگار خانۂ مانی و بہزاد یا گل و گلزار نظر آتا تھا۔ اکثر دکانیں تو اس وقت بند تھیں لیکن فسق و معصیت کا بازار شباب پر تھا۔ قدم قدم پر سینما اور نائٹ کلب آباد تھے۔ علاوہ ازیں جگہ جگہ مساج کے بورڈ بھی لگے ہوئے تھے۔ ایک واقف کار نے بتایا کہ عیاشی و فحاشی کی اس نوع خاص کا رواج بھی یہاں عام ہے۔ تھوڑی دیر پیدل چلا ہوں گا

کہ ان مناظر کو دیکھ کر دم گھٹنے لگا اور طبیعت پریشان ہو گئی۔ مجبور ہو کر ایک ٹیکسی کی۔ کسی ایک اجنبی ملک میں اور وہ بھی ہانگ کانگ ایسے شہر میں رات کے وقت ٹیکسی میں تن تنہا سفر کرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر میں نے ترکیب یہ کی کہ ٹیکسی کو لے کر پہلے ہوٹل آیا اور ڈرائیور کو ہوٹل کے منیجر سے ملایا۔ منیجر نے ٹیکسی کا نمبر اور ڈرائیور کا نام دونوں نوٹ کر لئے اور ڈرائیور کو کچھ راستوں کے متعلق بھی ہدایات دیں۔ کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ ٹیکسی میں گھومتا ہوں گا۔ درمیان میں کوئی پارک یا کوئی خاص بلڈنگ یا عمارت .... آئی تو ٹھہر کر اور ٹیکسی سے اتر کر اسے اچھی طرح دیکھا بھالا بھی، بہر حال اس میں شبہ نہیں شہر نہایت حسین و جمیل، صاف ستھرا اور مرصع و پرکار ہے۔ ساڑھے گیارہ کے قریب واپس آیا اور نماز پڑھ کر سو گیا۔

اساکا دوسرے دن یعنی ۱۵ر کی صبح کو ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم لوگ ایرپورٹ پہنچے۔ جہاز ساڑھے نو پر اڑا اور ایک بجے اساکا کے ایرپورٹ پر اتار دیا۔ یہ جاپان کا عظیم تجارتی اور صنعتی و حرفتی شہر ہے۔ روئی کے مل، لوہے اور شیشہ کے کارخانے، جہاز سازی، اسلحہ سازی اور شکر سازی کی نہایت عظیم الشان فیکٹریاں اور بودھ مذہب کے بڑے بڑے مناد جن کو یہ لوگ پگوڈا کہتے ہیں اس شہر میں موجود ہیں۔ آبادی تیس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ٹوکیو سے پانچ سو کیلومیٹر کی مسافت پر ہے۔ اساکا کا ایرپورٹ اور اس کی عمارتیں بھی نہایت وسیع اور بڑی شاندار ہیں۔

کوئٹو کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ٹھیک دو بجے بس آئی اور ہم تین بجے کوٹو پہنچ گئے۔ چالیس بیالیس کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ کوٹو جاپان کا بہت قدیم شہر ہے۔ ایک ہزار برس تک (۷۹۴ء سے لے ۱۸۶۸ء تک) ملک کا دار الحکومت رہا ہے۔ اس بنا پر مذہب، ثقافت، فن اور آرٹ اور صنعت و حرفت کے اعتبار سے اس کو مرکزیت حاصل رہی ہے۔ اب اگرچہ اس کی سیاسی حیثیت وہ باقی نہیں ہے لیکن اور دوسری حیثیتوں سے اب بھی وہی اہمیت اور امتیاز ہے۔ کوٹو میں ہم

لوگوں کے قیام کا انتظام گرانڈ ہوٹل میں تھا جو بہت وسیع، چند منزلہ اور شاندار ہوٹل ہے کمرے، آرام دہ اور سروس قابلِ اطمینان ہے۔ ایک کمرے میں دو دو اشخاص کے قیام کا انتظام تھا۔ چنانچہ میں اور کراچی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ فلسفہ ڈاکٹر منظور حسین ایک کمرہ نمبر ۵۲۳ میں اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایک اور کمرہ میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی کے ساتھ ٹھہرائے گئے تھے۔

کانفرنس کا مقصد اب کل سے کانفرنس شروع ہے۔ لیکن اس کی روئداد سننے سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ اس کانفرنس کا مقصد اور اس کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟ جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے ہمارا یہ زمانہ سائنس اور ٹکنالوجی کا عہد ہے۔ ان کی غیر معمولی ترقی نے عالم آب و گل کو طلسم کدۂ ایجادات و اختراعات بنا دیا۔ اور انسان نے جیسے نوامیس فطرت پر قابو پالیا ہے۔ علم و فن، شعر و ادب۔ صنعت و حرفت۔ تہذیب و تمدن۔ اور معیشت و معاشرت غرض کہ ہر وہ چیز جس سے انسان کی حیات مادی و جسمانی کا تعلق ہے اس میں عہدِ جدید نے وہ ترقی کی ہے کہ دنیا چشم کو ہر رنگ میں وا ہو جانے کی دعوت سراپا بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن اس ترقی کا سب سے زیادہ افسوسناک اور تشویش انگیز پہلو یہ ہے کہ انسان قلب و روح کے سکون و اطمینان کی نعمت و دولت سے محروم ہو گیا۔ کیوں کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی پیش رفت نے ایک طرف انسان کے ہاتھ میں وہ محشر انگیز اسلحہ بھی دے دیئے ہیں جو کروڑوں انسانوں کی آبادی کو چشم زدن میں خاک سیاہ کر دے سکتے ہیں۔ اور دوسری جانب اس نے اقوام عالم میں باہم رقیبانہ کشمکش۔ ہوسِ اقتدار و تغلب۔ خود غرضی۔ مطلب پرستی ظلم و عدوان۔ اور استحصال بالجبر کے جذبات کو برافروختہ کر کے انسان کو زندگی کے اقدار عالیہ سے بہت دور کر دیا ہے۔ ان دونوں چیزوں کا مجموعی اثر یہ ہے کہ ایٹمی جنگ کا خطرہ ہر وقت انسان کے دل و دماغ پر مسلط ہے اور اس کے باعث امن و سکون ایک جنس نایاب ہو گئے ہیں۔

اس بنا پر اگر انسان کو دنیا میں رہنا ہے تو اس کی سب سے زیادہ اہم اور بڑی ضرورت

امن کی متاع گمشدہ کی بازیافت ہے۔ لیکن یہ امر حد درجہ مایوس کن ہے کہ گذشتہ جنگ عظیم اوّل کے بعد سے اب تک اقوام وملل عالم نے امن کو پالینے کی جتنی اجتماعی اور منظم کوششیں کی ہیں وہ سب ناکام رہی ہیں اور صورت حال روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی ہے۔ چنانچہ لیگ آف نیشنز کا عبرتناک انجام دیکھنے کے بعد جن لوگوں نے یو۔این۔او۔ سے توقعات قائم کی تھیں وہ اب بڑی حسرت سے دیکھ رہے ہیں کہ مشرق وسطیٰ میں، جنوب مشرقی ایشیا میں، مغربی اور جنوبی افریقہ میں اور خود امریکہ میں وہ انسانی حقوق کس بری طرح پامال ہو رہے جن کی حفاظت کو یو۔این۔او کے منشور میں امن کی اساس اور بنیاد قرار دیا تھا۔ مجلس اقوام متحدہ یہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ لیکن چند رزولیوشن پاس کرنے یا جنگ بندی لائن پر اپنے مشاہدین کے بھیج دینے کے علاوہ اب اس کا کوئی کام نہیں رہا۔

اس صورت حال پر جو مفکرین عالم برابر غور کر رہے۔ ان میں ایک طبقہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے بجا طور پر یہ محسوس کیا کہ دنیا میں امن نہ سیاسی اور فوجی توازن کے برقرار رکھنے سے حاصل ہوسکتا ہے اور نہ عدل و انصاف اور مساواتِ حقوق انسانی کا وعظ کہنے سے بلکہ اگر وہ قائم ہوسکتا ہے تو صرف مذاہب عالم کی باہم متفقہ جہد و سعی سے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ ہو یا امن بہرحال دونوں کا دار و مدار انسان کے قلب اور دماغ کے صلاح و فساد پر ہے۔ قدرت کی بخشی ہوئی ہر نعمت کی مثال ایک تلوار کی ہے۔ یہ تلوار اگر ایک شریر النفس کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو وہ اس سے دوسروں کا گلا کاٹتا ہے اور بسا اوقات خود بھی اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کے برعکس یہ تلوار کسی ایک صالح شریف اور بہادر انسان کے قبضہ میں ہو تو اس کے ذریعہ وہ اپنی حفاظت کرتا ہے اور مظلوموں کی اعانت بھی! اس بنا پر بڑی ضرورت انسانِ عہد حاضر کے دل و دماغ کو بدلنے اور ان کے اصلاح کرنے کی ہے۔ اور یہ کام سوائے مذہب کے کوئی اور طاقت نہیں کرسکتی۔ کیوں کہ مذہب انسان کو ایک عقیدہ دیتا ہے اور اس کے ذریعہ زندگی کے اقدار عالیہ سے اس کے دل و دماغ کو

معمور کر دیتا ہے۔

ان حضرات نے اصل معاملہ پر جب اس طرح غور کیا تو انہیں دو باتیں محسوس ہوئیں:۔
(۱) ایک یہ کہ چونکہ ایٹمی جنگ کا خطرہ کسی ایک ملک یا قوم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ عالمگیر ہے۔ اس بنا پر جب تک مذاہب یک جہتی اور اتفاق کے ساتھ قیام امن کی جدوجہد نہیں کریں گے حصول مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مذاہب عالم باہمی آویزش اور حریفانہ کشمکش سے آزاد ہوں۔ (۲) دوسری یہ کہ بدقسمتی سے مذہب عبادت گاہوں اور چند رسومات کی چہار دیواری میں مقید ہو کر رہ گیا ہے اور عام زندگی سے اس کا رشتہ منقطع ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جو حالات پیش آ رہے ہیں مذہب کا ان میں کوئی عمل دخل نہیں اور وہ ان کا ایک اجنبی تماشائی بنا ہوا ہے حالانکہ مذہب عمل کا محرک بھی ہے اور اسکا نگران بھی اس بنا پر قیام امن کا مقصد حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مذہب کو فعال محرک اور موثر بنا کر زندگی سے اس کا رابطہ قائم کیا جائے۔

تاریخی پس منظر یہ خیالات و تصورات اب عام ہیں چنانچہ مشرق اور مغرب کے ارباب سیاست اور اصحاب علم و دانش عموماً یہ کہہ رہے ہیں کہ انسان کو اگر کلیتہً نیست و نابود ہونے سے بچانا ہے تو سائنس کو لامحالہ مذہب کا تعاون حاصل کرنا ہوگا لیکن عجیب بات ہے کہ جاپان اپنی صنعت و حرفت کے اعتبار سے جتنا ماڈرن ہے بڑے درجہ کا کٹر مذہبی ملک بھی ہے۔ اس بنا پر اس راہ میں سب سے پہلے عملی اقدام کرنے کا شرف اسی کو حاصل ہے اگرچہ اس میں دخل اس بات کا بھی ہے کہ جنگ عظیم دوم میں جو تباہی اور بربادی ایٹم بم کا نشانہ بننے کے باعث اس ملک کی ہوئی کسی اور کی نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ خاص جاپان میں اس سلسلہ کے حسب ذیل اجتماعات ہوئے:۔

(۱) ۱۹۴۷ء میں جاپان کی مجلس مذاہب نے مئی کی پانچ اور چھ تاریخ کو ٹوکیو میں امن عالم کے مسئلہ پر غور کرنے کی غرض سے مختلف المذاہب کانفرنس منعقد کی۔ اس میں ایک ہزار کے قریب مندوبین شریک ہوئے تھے۔

(۲) ایک برس بعد یعنی ۱۹۵۶ء کے ماہ نومبر کی پہلی تاریخ کو ٹوکیو میں پھر مذہب اور امن پر ایک گول میز کانفرنس ہوئی جس میں جاپان کے ہی مختلف علاقوں کے ارباب علم و دانش نے تعداد کثیر شرکت کی۔

(۳) ۱۹۵۵ء کے ماہ اگست میں "مذہب پر عالمی کانفرنس" کے نام سے ایک عظیم الشان بین الاقوامی کانفرنس جاپان کے مختلف مذاہب کی انجمنوں اور اداروں کی مشترکہ دعوت پر اور انکے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔

جاپان کی ان کوششوں اور امن کے لئے اس جد و جہد کی صدائے بازگشت اب امریکہ میں بھی گونجی۔ چنانچہ وہاں سب سے پہلے ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر ڈانا مکلین گریلے بشپ جون رائٹ (جواب کارڈنل ہیں) بوسٹن کے بشپ جون ویسلے لارڈ۔ اور نیویارک کے ایک یہودی مذہبی پیشوا، ربی مورس آئزن ڈراتھ۔ ان لوگوں کا خیال ہوا کہ مذہب اور امن پر ایک عالمی کانفرنس کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک بین المذاہب کمیٹی کی تشکیل کی گئی اور اس کا ایک جلسہ ۱۹۶۴ء میں نیویارک میں منعقد ہوا اور اس کے بعد اسی شہر میں ۱۹۶۵ء میں ایک غیر رسمی بین المذاہب کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۶۶ء میں واشنگٹن میں اس موضوع پر ایک قومی بین المذاہب کانفرنس ہوئی جس میں تقریباً پانچ سو عوام و خواص نے شرکت کی اس کانفرنس میں یہ طے کیا گیا کہ ۱۹۶۸ء میں ایک عالمی کانفرنس جس میں سب مذاہب کے لوگ شریک ہوں اس کے انعقاد کے امکانات پر غور کیا جائے۔ اس تجویز کے مطابق ۱۹۶۷ء میں ریورنڈ ہرشل ہالبرٹ اور ڈاکٹر ہومر اے جیک نے ان امکانات کا جائزہ لینے کی غرض سے شمالی افریقہ اور ایشیا کا سفر کیا اور اپنی رپورٹ "جنیوا اور روم سے ٹوکیو کے ذریعہ" پیش کی۔ اس کے دوسرے برس یعنی ۱۹۶۸ء میں گاندھی صدی تقریبات کی انڈین نیشنل کمیٹی اور یو۔ ایس۔ انٹر ریلیجس کمیٹی برائے امن۔ ان دونوں نے بماہ جنوری نئی دہلی میں ایک بین الاقوامی اور بین المذاہبی سمپوزیم منعقد کیا۔ اس سمپوزیم کی روئداد "مذاہب عالم اور امن عالم" کے نام ڈاکٹر ہومر جیک نے مرتب کی تھی اور بیکن پریس نے اس کو شائع کیا تھا۔ اس سمپوزیم کی ایک سفارش

یہ بھی تھی کہ مذہب اور امن کے موضوع پر ایک عالمی کانفرنس منعقد کی جائے۔ اس سال کے اسی مہینہ میں جاپانی اور امریکن بین المذاہبی مشاورتی کمیٹی برائے امن کا ایک جلسہ کوٹو میں ہوا اور اس میں بھی عالمی کانفرنس کے انعقاد کی سفارش کی گئی مشاورتی کمیٹی کے اس جلسہ کی روداد بھی انگریزی میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے بعد ۱۹۶۹ء میں ایک عارضی مشاورتی کمیٹی کی نشست فروری کے مہینہ میں استنبول میں ہوئی یہاں جاپان کے جو ممبر حضرات موجود تھے انھوں نے مذہب اور امن پر ایک عالمی کانفرنس کوٹو میں منعقد کرنے کی دعوت دی۔ جولائی میں اس کمیٹی کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ بوسٹن (امریکہ) میں ہوا اور پھر دسمبر میں تیاری کمیٹی کا ایک جلسہ کوٹو میں ہوا اور یہ طے ہو گیا کہ مجوزہ عالمی کانفرنس جس دنیا کے سب مذاہب کے نمائندے شریک ہوں ۱۹۷۰ء میں بماہ اکتوبر کوٹو میں منعقد کی جائے۔ ڈاکٹر ہومر۔ اے۔ جیک (امریکہ) جو امن کی مختلف تحریکوں میں بیس برس سے اور اس خاص تحریک میں دس برس سے حصہ لے رہے تھے کانفرنس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔

بہرحال یہ ہے تاریخی پس منظر اس کانفرنس کا اب اس کانفرنس کی روداد سنئے۔

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبر آبادی

بُرہان

جلد ۶۶	ربیع الاول ۱۳۹۱ھ مطابق مئی ۱۹۷۱ء	شمارہ ۔ ۵-۶

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

النبأ العظیم

(۱۹)

سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بخل ہو یا اسراف بہرحال دونوں ایک عمل ہیں اور اسی بنا پر ان کا مرتکب عاصی و آثم اور گنہگار ہو سکتا ہے لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ان کو کافروں اور منکرین خدا اور رسول کے ہم رتبہ و ہمسر قرار دے دیا گیا ہے اور ان کے لے بھی اسی عذاب کی وعید ہے جو دین کی تکذیب کرتے اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں بظاہر ایک عمل ہیں لیکن درحقیقت بہت سے اعمال سیئہ کا مجموعہ ہیں۔ اور ان کی براہ راست زد ایمان اور اللہ پر یقین اور بھروسہ پر پڑتی ہے مثلاً جو شخص بخیل ہے وہ اپنا اور ان تمام لوگوں کا حق غصب کرتا ہے جن کے حقوق اللہ نے اس کے مال پر مقرر کر دیئے ہیں۔ پھر یہی نہیں! بلکہ بخیل اپنے اندوختہ پر بہ نسبت خدا کے زیادہ بھروسہ کرتا ہے اور نعیم آخرت کے مقابلہ میں سیم و زر کے انبار کو زیادہ وقیع سمجھتا ہے۔ یہی حال اسراف کا ہے جو شخص مسرف ہے وہ عُجب و خودنمائی و تکبر اور فکرِ فردا سے غافل ہوتا ہے، دوسرے لوگوں کی تحقیر کرتا ہے اور اپنی بے اعتدالیوں پر فخر کرتا ہے اس بنا پر یہ دونوں اگرچہ دیکھنے میں ایک عمل ہیں لیکن درحقیقت ان سے ایک صالح معاشرہ اور سوسائٹی کی عمارت میں ہی شگاف پیدا ہونے لگتا ہے۔ اسراف کی یہ خرابیاں تو وہ ہیں جو اسراف کی ہر شکل و صورت میں عام طور پر پائی جاتی ہیں لیکن جس اسراف کا مظاہرہ شادی بیاہ کے موقع پر ہوتا ہے اس میں ان

عام برائیوں کے علاوہ چند اور قباحتیں بھی ہیں جن کے اثرات پوری سوسائٹی اور سماج پر پڑتے ہیں۔ خود مسرف کے خاندان کے افراد اور اس کے اعزا و اقربا جو اس طرح اللے تللے نہیں کر سکتے وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے ہاں جب اسی جیسی کوئی تقریب ہوتی ہے تو انہیں سخت الجھن پیش آتی ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟ اگر وہ اپنے مسرف عزیز کے نقش قدم پر چلتے ہیں تو انہیں قرض ادھار کا ناقابل برداشت بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ اور وہ ایسا نہیں کرتے تو اہل خاندان اور دوست احباب کی نظروں میں سبک ہو جاتے اور وہ خود یک گونہ انفعال و ندامت محسوس کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ لڑکوں کا تو کیا ذکر لڑکیاں تک عمر رسیدہ ہونے کے باوجود گھر میں بن بیاہی بیٹھی رہتی ہیں۔ اور اس کی غیر محسوس نحوست اور عذابِ معنوی کے اثرات پورے گھر میں جراثیم کی طرح پھیل جاتے ہیں۔ اے کاش مسلمان محسوس کرتے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفت "یضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم" آپ لوگوں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں اور انھوں نے جو بیڑیاں پہن رکھی ہیں انہیں دور فرماتے ہیں" بیان فرمائی ہے تو اس کا منشا یہ بھی ہے کہ خاندانی فخر و غرور شخصی وجاہت و منصب کے غیر واقعی تخیل اور احساس برتری کے باعث شادی بیاہ وغیرہ کے معاملات میں ایک انسان جس کشمکش اور روحانی اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم اور پھر اپنے عمل سے ان سب کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ایک اور آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اسوہ حسنہ بتایا گیا ہے تو اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ حضور ہر شعبہ زندگی میں ہمارے لئے نمونہ عمل ہیں اور حق یہ ہے کہ کوئی معاملہ عبادات کا ہو یا معاملات کا ہر حالت میں آپ کی پیروی سر تا سر نیکی اور حسن و جمال ہے اور اس سے انحراف گمراہی اور بدنصیبی!! یہ اتباع اسوۂ نبوی بظاہر تو بہت آسان چیز نظر آتی ہے اور ہم میں بہت سے مقدسین اس غلط فہمی میں بھی ہوں گے کہ وہ اس صراط مستقیم پر گامزن بھی ہیں۔ لیکن ہے درحقیقت بڑی کٹھن اور مشکل راہ۔ اور اس پر سے گزرنے کی سعادت

انہیں خوش نصیبوں کے حصہ میں آتی ہے جو "اما من خاف مقام ربہ ونہی النفس عن الھوی" کے شرف سے مشرف ہیں۔ ورنہ حق یہ ہے کہ بڑا سے بڑا دین دار مسلمان بھی اس راہ سے کترا کر نکل جاتا ہے جب اس کے ماحول اور شخصیت۔ اس کے خاندان اور اس کے خود اپنے اندرونی جذبات کا تصادم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کے قائم کردہ نمونۂ عمل سے ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں جہاں فرمایا گیا ہے: لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ اس کے فوراً بعد ہی یہ بھی ارشاد ہے: لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر وذکر اللہ کثیراً۔ یعنی بے شبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے لئے بہترین نمونہ عمل ہیں لیکن آپ عملاً صرف انہیں لوگوں کے لیے نمونۂ عمل ہیں جو اللہ سے اور یوم آخرت سے لو لگاتے اور جو اللہ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ تم کو اگر صرف اللہ کی رضا مطلوب ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور داعیہ نہیں ہے تو اس وقت بیشک تم میں یہ حوصلہ ہو گا کہ ہر چیز سے صرفِ نظر کر کے تم اتباعِ اسوۂ نبوی کر سکو گے ورنہ نہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اتباعِ اسوۂ نبوی کے معنی ہر جگہ بعینہٖ وہی کام کرنا نہیں ہوتے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ مثلاً عبادات میں آپ کے اتباع کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح آپ نے نماز پڑھی۔ روزہ رکھا۔ حج کیا۔ ہم بھی بعینہٖ اسی طرح کریں۔ لیکن معاملات اور روزمرہ کے معمولاتِ حیات میں اسوۂ نبوی پر عمل پیرا ہونے سے مراد یہ ہے کہ آپ کے عمل سے ہم کو جو سبق ملتا ہے اور اس عمل کے پیچھے جو اسپرٹ کام کر رہی ہے ہم اس کو پیش نظر رکھیں۔ اور اس سے تجاوز نہ کریں۔ مثلاً بات بیاہ شادی کی چل رہی ہے تو اسی کو لیجئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے جو نکاح کیے اور پھر اپنی صاحبزادیوں اور سب سے زیادہ اپنی چہیتی بیٹی خاتونِ جنت حضرت فاطمہ زہرا کا عقد جس طرح کیا وہ ہمارے لئے شادی بیاہ کے معاملہ میں اسوۂ حسنہ ہے اور اس کی پیروی ہمارے لئے باعث فوز و فلاح ہے۔ لیکن اس پیروی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم بھی اپنی بیٹی کا مہر بعینہٖ مہر فاطمہ مقرر کریں۔ اور جہیز میں بھی

صرف وہ چیزیں دیں جو تاجدار دو عالم نے اپنی لخت جگر کو دی تھیں اور پھر دعوت یا ولیمہ کریں تو اس میں صرف اتنے لوگوں کو مدعو کریں اور وہی کھانا اور اسی قسم کے چمڑے کے دستر خوان پر کھلائیں جس پر حضور نے کھلایا تھا۔ ان چیزوں میں اسوۂ حسنہ کے اتباع کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے اور نہ یہ ممکن ہے۔ اور اسلام ایسے دین فطرت اور عالمگیر مذہب سے یہ توقع بھی نہیں ہو سکتی کہ وہ اس طرح کی چیزوں کو جو زمانی و مکانی حالات اور تہذیب و تمدن میں ارتقاء کے ساتھ ساتھ طبعی طور پر بدلتی رہتی ہیں نیکی اور ثواب کی بنیاد قرار دے گا۔ اس بنا پر شادی بیاہ کے معاملہ میں اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کا طریقہ یہی ہوگا کہ آپ کے عمل سے ہم کو چند سبق ملتے ہیں اور یہی سبق آپ کے عمل کی اصل اسپرٹ اور روح ہیں اور وہ یہ ہیں (الف) اس قسم کے مواقع پر اپنی آمدنی کے دائرہ میں محدود رہ کر کام کرنا چاہئے تاکہ قرض و دام کی نوبت نہ آئے۔ (ب) تقریب سادگی اور کفایت شعاری سے منائی جائے (ج) چونکہ یہ موقع خوشی کا ہے اس بنا پر اظہار مسرت کے مروجہ طریقوں میں سے جو طریقہ اسلامی تعلیمات کے ماتحت حد جواز میں آتا ہے اسے اختیار کیا جائے لیکن دھوم دھڑکا اور دکھاوا نہ ہو (د) لڑکی کا نکاح ہو تو ٹھیک نکاح کے وقت نہیں۔ جیسا کہ ہندوستان اور پاکستان میں عام رواج ہے۔ بلکہ رشتہ کرنے سے پہلے ہی بیٹی سے استیذان کیا جائے اور اس کو موقع دیا جائے کہ وہ آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرے۔ (ہ) نکاح اپنا یا لڑکے کا ہو تو ولیمہ حسب حیثیت کرنا چاہئے (و) نکاح کے بعد رخصتی میں دیر نہ ہونی چاہئے (ز) اگر نکاح ولی اقرب کر رہا ہے تو لڑکی کو پس پردہ رکھ کر ولی کے ذریعہ اس کا نکاح ہونا چاہئے (ح) مجلسِ نکاح میں مردوں اور عورتوں کا مخلوط اجتماع نہیں ہونا چاہئے (ط) بیٹے اور بیٹی کو اس موقع پر جو کچھ دینا دلانا ہے وہ سب حسب حیثیت کسی دباؤ۔ بوجھ یا گرانی کے بغیر ہونا چاہئے۔ بہرحال یہ ہیں وہ چند اصول جو اس موقع پر اسوۂ نبوی سے حاصل ہوتے ہیں۔ اوپر سادگی اور کفایت شعاری کے الفاظ آئے ہیں لیکن یہ دونوں ایسی متعین اور مشخص حقیقتیں نہیں ہیں جن کی کوئی قطعی تعریف کی جا سکے

بلکہ ایک امر اضافی ہیں۔ اور اس کا کوئی فیصلہ کوئی اور نہیں بلکہ صاحب معاملہ خود کر سکتا ہے
بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ۔ یعنی ایک شخص خواہ کتنے ہی حیلے حوالے
اور بہانے بنائے۔ لیکن حقیقت امر ہے کیا؟ اسے وہ خود جانتا ہے!!

ہمارے مسلمانوں میں قوم پنجابیان۔ یا میمن اور داؤدی بوہرے وغیرہم کچھ ایسے فرقے ہیں جنھوں نے اجتماعی طور پر اپنے ہاں شادی بیاہ وغیرہ کے معاملات کی تنظیم کر رکھی ہے تو اب دیکھ لیجئے مسلمانوں میں بحیثیت مجموعی اور جماعتی طور پر سب سے زیادہ خوش حال اور معاشی اعتبار سے مرفہ الحال اور مطمئن یہی لوگ ہیں۔ میں بعض اوقات سوچتا ہوں کہ ان لوگوں میں کوئی غریب بھی ہے یا نہیں؟ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اسی طرح کی کوئی تنظیم جماعت وار یا شہر و قصبہ وار مسلمانوں کے دوسرے طبقوں کی بھی ہو سکے تو بے شبہ سماجی اور معاشی اعتبار سے بہت کچھ اصلاح ہو سکتی ہے۔ یہاں تک محض فضول خرچی اور اسراف و تبذیر کا ذکر تھا اس کے علاوہ شادی بیاہ کے دوسرے معاملات اور رسم و رواج کے طریقوں میں جس گمراہی کا شکار ہیں وہ ایک ایسی ملت کے لئے جو الملۃ البیضاء السمحاء کے لقب سے معزز ہو حد درجہ شرمناک اور عبرت آفریں ہے۔ گھر کے اندر جو آرسی مصحف اور منھ دکھاوا وغیرہ جیسی قسم کی بیسیوں جاہلانہ اور غیر اسلامی رسومات بجالائی جاتی ہیں یہ تو مسلمانوں کا بہت پرانا مرض تھا ہی اب ہندو اور انگریزی دونوں تہذیبوں کے ملے جلے اثرات نے اپنا قدم اور آگے بڑھایا ہے تو نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ آدابِ مجلس سے متعلق قرآن مجید کا کوئی حکم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ عملاً استہزا اور توہین و تمسخر کا معاملہ نہ کیا جاتا ہو مثلاً اسلام کی طبیعت اور مزاج اس سے ابا کرتا ہے کہ اس قسم کی تقریبات میں عورتوں اور مردوں کا مخلوط اجتماع ہو لیکن یہاں کھلے بندوں ہوتا ہے۔ قرآن کا حکم ہے کہ مرد اور عورتیں دونوں غضِ بصر کریں لیکن یہاں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر بے تکلف گفتگو کرتے اور قہقہے لگاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر یہاں زیبائش و آرائش اور بناؤ سنگھار کی وہ نمائش ہوتی ہے کہ مجلس طلسم کدۂ رنگ و بو بن جاتی ہے قرآن مطالبہ کرتا ہے:

عورتیں ادناء جلباب کریں یعنی ڈھیلا ڈھالا لباس پہنیں۔ لیکن یہاں لباس اس درجہ تنگ اور کسا ہوا ہوتا ہے کہ ایک شخص بے تکلف اعضا کا خاکہ (DIAGRAM —) بنا سکتا ہے۔ قرآن نے کہا تھا: عورتیں اپنے سینہ پر دوپٹہ ڈالیں۔ یہاں اگر دوپٹہ ہے بھی تو گلوبند کی طرح۔ ورنہ سر برہنہ اور بالوں کے نئے نئے فیشن۔ کلام الٰہی کا فرمان تھا: عورتیں نرم آواز میں گفتگو کریں تاکہ فتنہ کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملے۔ لیکن یہاں شوخیٔ گفتار کا وہ عالم کہ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے۔ ارشادِ خداوندی تھا: عورتیں عہد جاہلیت کی طرح تبرج نہ کریں لیکن یہاں بغلوں تک بازو بھی عریاں اور سینہ اور کمر کا درمیانی حصہ بھی برہنہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خبردار کیا تھا: رب کاسیات عاریات۔ اور یہاں لباس کی لطافت کا یہ حال کہ — "سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا"۔

یہ تصویر اس طبقہ کی ہے جو مسلمانوں میں طبقہ خواص کہلاتا ہے۔ اس طبقہ میں چشم بد دور وہ حضرات بھی شامل ہیں جن کو قیادت کا دعویٰ ہے اور جنہیں مسلمانوں کا غم ایک دم کے لئے بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتا ان کے علاوہ اس طبقہ میں یونیورسٹیوں کے اساتذہ، سوشل ورکر، افسرانِ حکومت اور تجارت پیشہ لوگ بھی شامل ہیں اور ان میں بے شبہ ایسے حضرات بھی ہیں جن کو بے دین اور لا مذہب نہیں کہا جا سکتا اس طبقہ میں یہ سماجی تبدیلی اس سرعت سے ہو رہی ہے کہ ابھی چند برس پہلے تک جن گھرانوں کی خواتین پردہ کی سخت پابند تھیں اب ان خواتین نے پردہ کو خیر آباد کہا ہے تو اس عزم اور حوصلہ و ولولہ کے ساتھ کہ گویا صدیوں کی پردہ نشینی کا انتقام چند ہفتوں اور مہینوں میں لے لینا چاہتی ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس قوم کا حال یہ ہو کہ وہ ہر تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور چلتی ہو، جو ہوا کا رخ دیکھ کر اپنی کشتیوں کا بادبان پھیر دیتی ہو اور جو ہر موج رواں کے دھارے پر بہنا شروع کر دیتی ہو اسے اس دعوی کا کیا حق ہے کہ وہ زندگی کے ایک مخصوص نظام اور ایک اعلیٰ دستور حیات کی حامل ہے۔

قیام کلکتہ کے زمانہ میں مجھکو بعض بالکل خالص بنگالی مسلمانوں کے گھر شادی کی تقریبات میں شرکت کا موقع ملا ہے اور میں یہ دیکھ کر خونِ جگر پی کر رہ گیا ہوں کہ عورتوں اور مردوں کا بے محابا اور بے تکلف اختلاط وارتباط تو الگ رہا (اور اس پر کوئی تعجب بھی نہیں کیوں کہ یہ ایک عام بات ہے) دلہن کے گھر میں پوجا پاٹ اور دیبا کے ارد گرد پھیرے کرنے اور چکر لگانے کی وہ تمام رسوم ادا کی گئی ہیں جو ہندو گھرانوں میں انجام پذیر

ہوتی ہیں۔ یہ رسوم تو وہ ہیں جو آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ کے قیام میں میری نظر سے گذری ہیں ان کے علاوہ تقریب کی پوری مدت میں کیا کچھ ہوتا ہوگا اسے باخبر حضرات ہی جان سکتے ہیں۔ آپ کو اگر میرے بیان پر حیرت ہو تو روزنامہ اسٹیٹسمین مورخہ ۲ اپریل ۱۹۶۸ء کے میگزین سکشن کا پہلا صفحہ ملاحظہ فرمائیے اس میں ایک بنگالی مسلمان خاتون تارا علی بیگ کا ایک مضمون "میرا پیارا بنگلہ دیش" کے عنوان سے چھپا ہے۔ اس میں محترمہ مشرقی بنگال سے متعلق اپنے بچپن کی یادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں: "یہاں درگا دیوی ہندو اور مسلمان دونوں کے نزدیک نمبر اول کی دیوی تھی اور پوجا کی تقریبات کے ختم ہونے پر جب دیبیوں کا جلوس نکلتا تھا تو اس میں بھی ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے اور پھر جب ان دیبیوں کو غرق کرنے کے لئے پانی میں اترتے تھے تو دھوتیوں کے ساتھ لنگیاں بھی تر ہوتی تھیں"۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ جو بنگالی مسلمان اسلام سے واقف ہیں اور جن کی تعلیم و تربیت اسلامی قاعدہ اور ضابطہ کے ماتحت ہوئی ہے وہ اس قسم کی چیزوں سے بہت دور اور ان سے نفور ہیں لیکن محترمہ کی تحریر سے یہ اندازہ تو ہو ہی گیا کہ جو لوگ جہالت اور اسلام سے ناواقفیت کا شکار ہیں ۔۔ اور ان کی تعداد کم نہیں ۔۔ ان کا مرض کہاں تک پہنچا ہے اور قیامت کے دن اس کی باز پرس کن لوگوں سے ہوگی! یہ عجیب بات ہے کہ بنگال میں عربی اور دینیات کی تعلیم کا جو رواج عام ہے وہ کسی دوسری ریاست میں شائد ہی ہو گاؤں گاؤں مدرسے کھلے ہوئے ہیں اور ان میں درس نظامی کلاً یا جزاً پڑھایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اسلامی لٹریچر بنگالی زبان میں مفقود ہے۔ کلکتہ پہنچنے کے بعد جب یہ بات میرے علم میں آئی تو سخت افسوس اور صدمہ ہوا۔ اور میں نے مدرسہ عالیہ کے بعض بنگالی اساتذہ کو جو اپنی زبان کے اچھے مضمون نگار تھے اس پر آمادہ کیا کہ وہ مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم کی مشہور کتاب تعلیم الاسلام کے تمام حصوں کا اور ان کے علاوہ چند اور کتابوں کا جن کی فہرست میں نے بنائی تھی اردو سے بنگلہ میں ترجمہ کردیں اور ساتھ ہی ایک مشہور مقامی پبلشر کو ان کتابوں کی طباعت اور اشاعت پر آمادہ کیا۔ چنانچہ جب تک میں کلکتہ میں رہا ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ دینیات پر بنگلہ زبان میں کتابیں شائع ہو کر مقبول عوام و خواص ہو چکی تھیں اور میرے زمانہ میں ہی بعض کتابوں کے کئی کئی اڈیشن نکل چکے تھے۔ پتہ نہیں کہ یہ سلسلہ اب بھی قائم ہے یا نہیں!!

کلوروفل اور قرآن

(۲)

جناب مولوی محمد شہاب الدین ندوی ۔ فرقانیہ اکیڈمی چک باناور بنگلور۔نارتھ

دلائل آفاق کی غرض وغایت | یہ ہے سائنس اور سائنسی علوم کا ایک مختصر سا تعارف ۔ منطقی حیثیت سے ۔ ان پانچ علوم میں کائنات کی تمام چیزیں آجاتی ہیں بحث میں سورۂ روم اور سورۂ نحل کی جو آیات پیش کی گئی ہیں ان کا دوبارہ جائزہ لیجئے تو انہیں جن جن امور میں بھی غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے وہ کسی نہ کسی حیثیت سے ان ہی پانچ علوم کے دائرے میں آتے ہیں ۔ غور فرمائیے کہ موجودہ سائنسی تحقیقات قرآنی منشا اور اس کے تقاضوں سے کس قدر قریب ہیں ! اب حسب ذیل آیات میں تدبر کیجئے تو قرآن اور سائنس کے تعلق کی نوعیت پوری طرح روشنی میں آجاتی ہے ۔

طٰہٰ ۱ ما انزلنا علیک القرآن لتشقیٰ ۲ الا تذکرۃ لمن یخشیٰ ۳ تنزیلاً ممن خلق الارض والسمٰوٰتِ العُلیٰ ۴ الرحمٰن علی العرش استویٰ ۵ لہٗ ما فی السمٰوٰت وما فِی الارضِ وَمَا بَینَھُمَا وما تحت الثریٰ ۶ وان تجھر بالقول فانہٗ یعلم السرّ واخفیٰ ۷ اللہ لا الٰہ الا ھو لہ الاسماء الحسنیٰ ۸

طا ، ھا ۔ (اے محمد) ہم نے تم پر یہ قرآن اس لئے نہیں اتارا کہ تم (خواہ مخواہ) مشقت میں پڑجاؤ (اور زبردستی لوگوں کو سمجھاتے پھرو) یہ قرآن تو ایک یاددہانی ہے ہر اس شخص کے لئے جو خدا سے ڈرتا ہو ۔ (یہ قرآن) اس ہستی کی جانب سے اتارا گیا ہے جس نے (حیرتناک قسم کے نظاموں سے لیس) زمین اور بلند و بالا سماوات پیدا کردیئے وہ رحمٰن ہے جو عرش پر مستوی ہے ۔ آسمانوں میں اور زمین میں اور ان دونوں کے درمیان جتنی بھی چیزیں ہیں اور گیلی مٹی کے نیچے (پاتال میں)

جو کچھ بھی ہے سب اسی کی ملکیت ہے۔ اگر تم زور سے بات کرو (یا آہستہ) وہ ہر حال میں تمام بھید اور مخفی باتوں تک سے واقف ہو جاتا ہے۔ اللہ کے سوا دوسرا کوئی الٰہ (نرالے اور حیرتناک افعال والا) موجود نہیں ہے۔ اس کے عمدہ عمدہ نام ہیں (طہ: ۱-۸)

ان آیات میں چھٹی آیت کا دائرہ جمادات (جیولوجیکل اشیاء) سے لے کر افلاک تک وسیع ہے: "لہٗ ما فی السمٰوٰت" میں نہ صرف تمام آسمانی ستارے و سیارے آجاتے ہیں بلکہ ان میں موجود مخلوق بھی آجاتی ہے۔ "وما فی الارض" میں کرۂ ارض پر پائی جانے والی تمام چیزیں آجاتی ہیں۔ "وما بینھما" کا اطلاق خصوصیت کے ساتھ خلائیات کے مظاہر اور ان کی نیرنگیوں پر ہوتا ہے۔ اور "وما تحت الثریٰ" (پاتال) کے تحت جیالوجی کے تمام متعلقات آجاتے ہیں۔ اب اس عالم رنگ و بو کی وہ کون سی چیز اور وہ کون سا مظہر ہے جو ان چار کلیات سے باہر ہو؟

پھر غور فرمایئے کہ سیاق و سباق (نظم کلام) کے لحاظ سے اس آیت کریمہ کا مقصد کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ بیان محض قرآن کی زینت بڑھانے یا ایک بات کی نری خبر دے دینے کی خاطر نہیں لایا گیا ہے۔ بلکہ جیسا کہ آخری دو (ساتویں اور آٹھویں) آیات سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس بیان کے ذریعہ در اصل اللہ تعالیٰ کی ملکیت (تمام مظاہر کائنات اس کے قبضہ و قدرت میں ہونے) کا نظارہ کرانا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بنیادی حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ مظاہر کائنات کا جو خالق و مالک ہوگا وہ ان کی رگ رگ سے واقف بھی ہوگا۔ اور جو ان مظاہر اور انکی کارگزاریوں کا عالم ہوگا وہ ان کا خالق و مالک بھی ہوگا۔[1]

---

[1] لہٰذا اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ تمام مظاہر کائنات یا مظاہر ربوبیت کا عالم ہے تو پھر اس کے خالق و مالک ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنا چاہیئے۔ اور جو خالق و مالک ہوگا وہی معبود و مسجود بھی ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ صفت علم، صفت خلّاقیت اور صفت مالکیت کا اظہار کیا گیا ہے اور نظام کائنات کے جو اسرار بیان کیے گئے ہیں وہ بھی (باقی آگے صفحہ ۲۹۹ پر دیکھئے)

الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر: جس نے پیدا کیا ہے، کیا وہ ناواقف رہ سکتا ہے؟ حالانکہ وہ بڑا ہی باریک بین اور ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے (ملک : ۱۴)

خلق کل شیئ وھو بکل شیئ علیم: اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ (انعام : ۱۰۲)

تخلیق اور علم جس طرح لازم و ملزوم ہیں اسی طرح ملکیتِ تامہ اور علم میں بھی چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کا مالک تو ہو مگر وہ اس کی مشنری اور اس کے کل پرزوں سے ناواقف رہ جائے۔ اسی بنا پر ساتویں آیت میں کہا گیا ہے کہ وہ مخفی چیزوں اور دلوں کے اسرار اور ان کے بھیدوں تک سے واقف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم کائنات کی ہر چیز پر محیط ہے خواہ وہ افلاک میں ہو یا پاتال میں، زمین میں ہو یا آسمان میں، خشکی میں ہو یا بحر ظلمات میں، روشنی میں ہو یا تاریکی میں، ظاہر میں ہو یا باطن میں، خواہ وہ محسوسات سے ہو یا تخیلات سے افکار و خیالات سے متعلق ہو یا وارداتِ قلب سے۔ اس عالم آب و گل کی ایک ذرہ برابر چیز بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتی اور ایک تنکا تک اس کے علم ازلی و ابدی سے باہر نہیں جا سکتا۔

لا یعزب عنہ مثقال ذرۃ فی السمٰوٰت ولا فی الارض ولا اصغر من ذلک ولا اکبر الا فی کتٰب مبین: اُس (کی نظروں) سے زمین و آسمانوں کی ایک رتی برابر چیز (جیسے ایک ایٹم) بھی اوجھل نہیں ہو سکتی، نہ اس سے چھوٹی (جیسے تابکار ذرات) اور نہ بڑی (جیسے شہابیے) ان سب کا حساب ایک کھلی کتاب میں ہے (سبا: ۳)

قرآنی نصوص کی روشنی میں کائنات اور اس کی مشنری کے مطالعہ سے تمام مظاہر کائنات

(صفحہ ۱۹۸ سے آگے) اس علم ازلی کے ... اظہار و انکشاف ہی کی غرض سے ہیں! "کلوروفل" کے مباحث سے اللہ تعالیٰ کے ہمہ دان و ہمہ بین ہونے کا حال پوری طرح آشکارا ہو جاتا ہے۔

کی مخلوقیت و مملوکیت اور ان کے ایک ایک جزیہ پر علم الہٰی کی گرفت مضبوط ہونے کا آفاقی نظارہ اور اس کی صفت خلاقیت وصفت مالکیت کا بھرپور مشاہدہ ہو جاتا ہے [ك] اسی بنا پر آٹھویں آیت میں کہا گیا ہے کہ اللہ کے سوا اس کائنات میں کوئی دوسرا اِلٰہ (نرالے اور حیرتناک افعال والا) موجود نہیں ہے۔ اور اس کے اچھے اچھے نام ہیں، یعنی وہ نہایت عمدہ اور قابل ستائش صفات (خلاقیت، مالکیت، علمیت اور ربوبیت والوہیت وغیرہ) سے مزین و متصف ہے۔ لہذا عالم ارض وسماوات میں تعریف و توصیف کا اصل مستحق وہی ہے اور وہی ہونا چاہیئے۔ سائنس اور قرآن کا یہ حاصل مطالعہ اور لب لباب ہے۔ یہ اسلامی نقطۂ نظر سے مطالعہ کائنات کی بنیادی غرض و غایت ہے جو مطابق واقعہ ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی سائنس داں پوری سچائی اور غیر جانبداری کے ساتھ پوری کائنات اور اس کے مظاہر کا مطالعہ کرے اور مذکورہ بالا ثمرات و نتائج تک نہ پہنچ سکے، اور اس کی رسائی ایک نرالے اور حیرتناک افعال والی ہستی تک نہ ہو جائے۔

ان آیات کا تقاضا ہے کہ نوع انسانی ایسی زبردست ہستی کی معبودیت والوہیت کو تسلیم کر کے اس کے روبرو اپنا سر نیاز جھکا دے۔ اس لحاظ سے قرآن کریم کے نظام کائنات میں غور وخوض کی دعوت دینے اور علوم کائنات سے تعرض کرنے کے دو بنیادی مقاصد ہیں:

۱- نوع انسانی کو علم الہٰی کی ازلیت وہمہ گیری کا آفاقی مشاہدہ کرانا۔

۲- اس مشاہدہ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی الوہیت و معبودیت کو تسلیم کرانا۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ نوع انسانی اسلام کو سچا اور ابدی دین تسلیم کر کے اسکے مقرر کردہ ضابطۂ حیات کی طرف متوجہ ہو اور اس کے دستور زندگی کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال کر نجات آخروی اور حیات جاودانی کی مستحق بن جائے۔

ك۔ یہ فائدہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ قرآن اور کائنات میں تطبیق دی جائے۔ قرآن میں جتنے بھی دعوے کیے گئے ہیں کائنات میں ان کا ثبوت و شہادت موجود ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جگہ جگہ نظام کائنات کے حقائق اور اس کے اسرار و رموز بیان کر کے نوع انسانی کے ذہن و دماغ پر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت والوہیت کے نقوش مرتسم کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ وہ اسلام کے سرچشمۂ ہدایت کی طرف پورے اشتیاق اور وارفتگی کے ساتھ لپک سکے۔ اسی بنا پر قرآن حکیم میں جگہ جگہ ذکر، ذکریٰ، تذکرہ تذکر اور ان کے مشتقات لائے گئے ہیں[1] تاکہ نوع انسانی کو وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ کی ربوبیت والوہیت پر تنبیہ کیا جا سکے اس موقع پر تیسری آیت "الا تذکرۃ لمن یخشیٰ" (یہ تو ایک یاد دہانی ہے ہر اس شخص کے لئے جو خدا سے ڈرتا ہو) کا یہی مفہوم ہے۔ اسی بنا پر دوسری آیت میں کہا گیا ہے کہ اے محمد ہم نے اس قرآن کو اس لئے نازل نہیں کیا کہ تم خواہ مخواہ مشقت میں پڑ جاؤ۔ بلکہ اس قرآن کے حیرت انگیز مضامین بطور یاد دہانی بیان کر دینا کافی ہے۔ رسول کے واسطے سے یہ خطاب آج پوری امت اسلامیہ سے ہے کہ وہ اقوام عالم تک قرآن کریم کے پیغامات اور اس کے حیرت انگیز مضامین پہنچا دے۔ اس لحاظ سے قرآن مجید میں انسان کو بصیرت و یاد دہانی اور تنبیہہ و انتباہ کا پورا پورا سامان جمع کر دیا گیا ہے اور اس کو مختلف قسم کے "تذکروں" یا اسباق و بصائر سے لیس کر دیا گیا ہے تاکہ اصول دین اور ان کی حقانیت پوری طرح آشکارا ہو جائے۔

غرض علم الٰہی کی ازلیت و ہمہ گیری کا آفاقی نظارہ کرانے کی غرض سے قرآن مجید میں مظاہر کائنات اور ان کے اسرار سربستہ کا تذکرہ کیا گیا ہے یہ تذکرہ قرآن مجید میں ایک خاص اعجازی انداز میں موجود ہے۔

وما من غائبۃ فی السماء والارض الا فی کتٰب مبین: اور ارض و سما کا کوئی راز ایسا نہیں ہے جو (اس) کتاب روشن میں موجود نہ ہو (نمل: ۷۵)

---

[1] ان سب کا مادہ (ذ۔ک۔ر) مشترک ہے جس کا اطلاق یاد دہانی، نصیحت، چوکاوا اور تنبیہ وغیرہ پر ہوتا ہے۔

جب انسانی تحقیق و تفتیش کی بدولت کائنات کے اسرارِ سربستہ یا رازہائے ربوبیت کا افشا ہوتا ہے تو ربانی انکشافات (جو اسرار کائنات سے متعلق ہوں) آفاقی وانفسی دلائل کے روپ میں جلوہ گر ہوجاتے ہیں۔ آیات ذیل میں اسی رمز کی گرہ کشائی کی گئی ہے:

اَوَلَیْسَ اللہ باعلم بما فی صدور العٰلمین: کیا اللہ کائنات کے بھیدوں کو بخوبی جاننے والا نہیں ہے؟ (عنکبوت: ۱۰)

الا یسجدوا للہ الذی یخرج الخبئ فی السمٰوٰت والارض ویعلم ما تخفون وما تعلنون: کیا یہ لوگ اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز نہ ہوں گے جو زمین و آسمانوں کی پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کردیتا ہے اور ان تمام امور سے واقف ہے جن کو تم چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو؟ (نمل: ۲۵)

قل انزلہ الذی یعلم السر فی السمٰوٰت والارض انہ کان غفوراً رحیماً: کہہ دو کہ اس (کتاب) کو اس نے اتارا ہے جو زمین و آسمانوں کے اسرار کو جاننے والا ہے۔ یقیناً وہ بڑا ہی مہربان ہے (فرقان: ۶)

ان حقائق و معارف کے اظہار ہی سے حسب ذیل آیات کی صداقت ظاہر ہوسکتی ہے:

سنریھم اٰیٰتنا فی الاٰفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق: ہم ان منکرین کو اپنے نشانات و دلائل دکھادیں گے آفاق اور انفس میں یہاں تک کہ اس کلام کی حقانیت ان پر ظاہر ہوجائے (حم سجدہ: ۵۳)

ویریکم اٰیٰتہ فای اٰیٰت اللہ تنکرون: وہ تم کو اپنے علامات قدرت دکھادے گا۔ پھر تم اس کی کن کن نشانیوں کا انکار کروگے؟ (مؤمن: ۸۱)

ظاہر ہے کہ ان "آیات و نشانات" یا دلائل آفاق و انفس کا اظہار و اثبات اسی وقت ہوسکتا ہے اور نوع انسان پر یہ حجت خداوندی بھی اسی وقت پوری ہوسکتی ہے جب کہ علم انسانی یا علوم سائنس کو قابل حجت و قابل استدلال تسلیم کیا جائے۔

قوانین قدرت اور سائنسی نظریات | چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو قانون فطرت اور اسباب و علل کے روپ میں نہایت منظم و منضبط طور پر تخلیق کیا ہے۔ اس لئے وہ فطرت کے قوانین، اسکے اسباب و علل اور اس کے نظم و ضبط میں غور و فکر کر کے رازہائے فطرت (اسرار ربوبیت) کو سمجھنے اور قوانین قدرت کا کھوج لگانے کی دعوت دیتا ہے۔ کیوں کہ قوانین قدرت کی چھان بین سے اُن کے مقنن کی طرف اور مظاہر کائنات کی تحقیق و تفتیش سے ان کے خالق و ناظم اور مدبر و منتظم کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے۔ قوانین فطرت کا اجراء اور ان کا نظم و ضبط افعال الٰہی کی کارگزاریاں ہیں۔ ان قوانین کی اوٹ میں شاہد حقیقی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اور افعال الٰہی کی رازجوئی سے معرفت حق حاصل ہو جاتی ہے۔

چونکہ سائنسی افکار و نظریات عموماً تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ اس لئے اس موقع پر یہ اشکال پیش آتا ہے کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہے؟ تو اس سلسلے میں حسب ذیل اصول پر نظر رہنی چاہیئے:۔

۱۔ تبدیلی عموماً غیر ثابت شدہ اور مفروضہ نظریات میں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ثابت شدہ اور مسلمہ حقائق، جن کو قوانین قدرت (لاس آف نیچر) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے پر بہت بڑی حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ قوانین قدرت سے مراد وہ اصول فطرت ہیں۔ جو مشاہدہ و تجربہ اور اختبار و استقراء میں پوری طرح ثابت ہو چکے ہوں اور جن کی حیثیت مسلّمات کی سی ہو۔ کوئی وجہ نہیں کہ ان اصول و قوانین کو قابلِ وثوق اور قابلِ استدلال تصور نہ کیا جائے۔ اس لحاظ سے علم کیمیا، طبیعیات اور بیالوجی کے اکثر اصول و ضوابط قابلِ استدلال ہیں۔

اس کے برعکس وہ افکار و آراء جن کی حیثیت محض نظری (THEORETICAL) ہوتی ہے اور تجربہ و اختبار اور استقراء (INDUCTION) سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، تو اسی قسم کے نظریات و مسائل میں آئے دن تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ جیالوجی، فلکیات

آغاز حیات، روح اور اس کے مظاہر اور نظریۂ ارتقاء وغیرہ کے اکثر مسائل اس دائرہ میں آتے ہیں۔ اس قسم کے مسائل و مباحث کی حیثیت زیادہ تر ظن و تخمین کی ہوتی ہے۔ حتمی و یقینی نہیں لہٰذا اس قسم کے مسائل سے استدلال کرنے میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ انسان کو بعض چیزوں کا ایک حد تک قطعی علم حاصل ہو جاتا ہے اور بعض چیزوں کی حد تک وہ کسی حال میں نہیں پہنچ سکتا بلکہ اس کے مبادیات تک سے بھی واقف نہیں ہو سکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عجیب و غریب حکمت ہے۔ اس میں منشائے الٰہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اظہار ربوبیت اور اتمام حجت کی خاطر انسان کو ایک حد تک یقینی علم سے نوازے تو دوسری طرف اس کو اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کا بھی پوری شدت کے ساتھ احساس دلاتا رہے در اصل انسان اس کارخانہ فطرت کی اصل کنہ و حقیقت کو کبھی نہیں پا سکتا اور اس کائنات کے تمام اسرار کا احاطہ کبھی نہیں کر سکتا۔[1]

معرفت الٰہی کے حصول کے لئے یہ دونوں امور نہایت ضروری ہیں۔ انسان کو سوچ بچار سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ علم حقیقی کی بہ نسبت جہل سے زیادہ مشابہ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا خواہ دنیا کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اور اس توازن ہی سے انسان پر قابو اور کنٹرول کیا جا سکتا ہے ورنہ یہ منہ زور گھوڑا کبھی رام نہیں ہو سکتا۔ انہی تمام وجوہات کی بنا پر مظاہر فطرت کا جائزہ لینے کی دعوت دی گئی ہے۔

قل انظروا ماذا فی السمٰوٰت والارض وما تغنی الآیات والنذر عن قوم لا یؤمنون : کہہ دو کہ زمین و آسمانوں میں جو جو چیزیں موجود ہیں ان کا بغور مشاہدہ (و معائنہ) کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ دلائل اور تنبیہات سے بے ایمانوں کو کوئی فائدہ

---

[1] اب یہ مفسر کی ہوشمندی اور فہم و فراست پر موقوف ہے کہ وہ علوم سائنس سے کس حد تک اور کس انداز میں استدلال کرے۔

نہیں پہنچتا (یونس : ۱۰۱)

۲۔ اس سلسلے میں دوسرا اصول یہ ہے کہ قرآن حکیم نظام کائنات سے متعلق جن حقائق کا انکشاف یا پیش گوئی کر چکا ہے اگر علم انسانی اپنی تحقیق و تفتیش کے ذریعہ اس انکشاف یا پیشگوئی تک پہنچ جائے تو اس سے ظاہر ہے کہ قرآن عظیم کی تصدیق تو ہو گی ہی، مگر دوسری طرف خود علم انسانی (سائنسی انکشاف) بھی محکم اور قابل استدلال سمجھا جائے گا۔ اس کے لئے شرط صرف یہ ہے کہ قرآن حکیم کے معانی و مطالب میں خواہ مخواہ قسم کی تاویلیں اور توڑ مروڑ نہ کیا جائے بلکہ "بلسان عربی مبین" کا لحاظ رکھتے ہوئے اصول فقہ کے بیان کردہ نصوص اربعہ (عبارت النص، اشارۃ النص، دلالۃ النص اور اقتضاء النص) کی روشنی میں اور اصول بلاغت کے مطابق تشبیہ، استعارہ اور توریہ وغیرہ کی رو سے جو معانی و مطالب تحقیقات جدیدہ کے مطابق وہم آہنگ ہو جائیں، تو پھر ان کی قطعیت میں کسی قسم کا شبہ نہیں رہتا[1]۔ اور دوسری حیثیت سے قرآنی متشابہات بھی محکمات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ زیر نظر مضمون (کلوروفل) بھی "توریہ" کی ایک بہترین مثال ہے جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

خلق اللہ السمٰوٰت والارض بالحق ان فی ذلک لآیۃ للمؤمنین: اللہ نے زمین و آسمانوں کو حق ثابت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس باب میں اہل ایمان کے لئے یقیناً ایک بڑی نشانی موجود ہے (عنکبوت: ۴۴)

۳۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ نظام کائنات سے متعلق کوئی سائنٹفک تحقیق جس کی قرآن نے مذکورۂ بالا طریقے سے ۔۔۔ صراحتاً تصدیق کر رہا ہو زمانہ مستقبل میں مزید تحقیق و تفتیش اور تلاش و جستجو سے غلط

---

[1] قرآنی نصوص کی حیثیت دراصل ایسے کلیات کی ہوتی ہے جن کی لچک اور وسعت میں ہر دور کی تحقیقات سما جاتی ہیں۔ بعض آیات کے کئی کئی مصداق بھی ہو سکتے ہیں۔ تفصیلات اور مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو میری کتاب "قرآن مجید اور سائنس"

ثابت ہوجائے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی دوسرا پہلو واضح ہوجائے یا کوئی دوسرا پہلو واضح ہوجائے یا کوئی نیا مصداق ظاہر ہوجائے اس طرح کہ مفہوم اول بھی غلط نہ ہونے پائے۔

کائنات اور اس کے مظاہر خدائی صفات و افعال کے مظہر اور کارگذاریاں ہیں اور قرآن عظیم کلام الٰہی کا آئینہ اور اقوال الٰہی کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا خدا کے قول (قرآن) اور فعل (کائنات) میں تعارض و تضاد کس طرح ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اقوال الٰہی اور افعال خداوندی کی تطبیق و ہمنوائی ہی سے معرفت الٰہی حاصل ہوتی ہے۔

واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک لا مبدل لکلماتہ: اور تم کتاب ربانی کے ان مندرجات کو پڑھ کر سناؤ جو بذریعہ وحی تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے (کہف: ۲۷)

وتمت کلمت ربک صدقا وعدلا لا مبدل لکلمتہ: اور تیرے رب کی بات پوری ہوئی کیا بلحاظ سچائی اور کیا بلحاظ عدل و درستی۔ اس کی باتوں (اور دعووں) کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے (انعام: ۱۱۵)

کتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید: یہ ایسی زبردست اور غیر مغلوب کتاب ہے جس میں باطل نہ آگے سے در آسکتا ہے اور نہ پیچھے سے جگہ پا سکتا ہے (نہ ماضی میں نہ مستقبل میں) کیوں کہ یہ ایک دانشمند اور خوبیوں والے (خدائے برتر) کی جانب سے نازل کردہ ہے (حٰم سجدہ: ۴۱-۴۲)

آلٓر کتاب احکمت آیاتہ ثم فصلت من لدن حکیم خبیر: الف، لام، را۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیات مضبوط و مستحکم کی گئی ہیں (جس کی بنا پر ان میں کبھی رد و بدل نہیں ہوتا) اور ان کی خدائے دانا اور باخبر کی جانب سے تفصیل کی گئی ہے (جس کی بنا پر وہ کبھی خلاف واقعہ نہیں ہو سکتیں (ہود: ۱)

۴۔ اگر کسی مسئلہ میں سائنس داں شک وتردد میں ہوں یا کسی معاملہ میں مختلف ومتضاد رائیں رکھتے ہوں اور اس بارے میں قرآن کریم کی بھی کوئی رائے اور نظریہ موجود ہو تو ایسی صورت میں قرآن کی حیثیت ایک قاضی اور جج کی سی تصور کی جائے گی۔ کیوں کہ انسانی علم ظنی اور خدائی علم قطعی ویقینی ہوتا ہے۔ گویا کہ قرآن ایک آئینہ ہے جس میں انسانی افکار ونظریات کی خامیوں کا حال ظاہر ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ایسی کسوٹی ہے جو کھرے کھوٹے کو چھانٹ دیتی ہے "فرقان" کا ایک مصداق یہ بھی ہو سکتا ہے، جو قرآن کا ایک بہت بڑا وصف ہے۔

ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق : یہ ہماری کتاب ہے جو تم پر ٹھیک ٹھیک بول رہی ہے (جاثیہ : ۲۹)

انہ لقول فصل وما ھو بالھزل : یہ ایک فیصلہ کن کلام ہے کوئی ہنسی مذاق نہیں (طارق : ۱۳-۱۴)

۵۔ اگر قرآن کا کوئی بیان کسی دور میں بظاہر علم انسانی کے خلاف معلوم ہو یا اس کی حقیقت مستور ہو تو اس صورت میں علم انسانی کو خام وناقص اور علم الٰہی کو قطعی ویقینی تصور کیا جائے گا۔ اسکا مطلب یہ ہوگا کہ علم انسانی ابھی ناپختہ وناکمل ہے اور قرآنی بیان کی صحت وصداقت زمانۂ مستقبل میں مزید تلاش وتفحص سے ضرور ظاہر ہوگی۔ مثال کے طور پر آج سائنسی نقطۂ نظر سے آسمانوں کے ذاتی وجود کی حقیقت مستور ہے۔ جس کی اصلیت انشاء اللہ زمانۂ مستقبل میں ظاہر ہو کر رہے گی۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو میری کتاب "چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں" یا "قرآنی نظریہ سماوات"

وسع ربی کل شئی علماً افلا تتذکرون : میرا رب علمی اعتبار سے ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے کیا تم چونکتے نہیں؟ (انعام : ۸۰)

اولم یکف بربک انہ علی کل شئی شھید : کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تمہارا رب (اس کائنات کی) ہر چیز سے آگاہ وباخبر ہے؟ (حم سجدہ : ۵۳)

ولا ینبئک مثل خبیر : اور تمہیں کوئی باخبر ہی خبردار کر سکتا ہے (بے خبر و ناواقف نہیں (فاطر: ۱۴)

سائنس اور مادہ پرستی | مباحث بالا سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو چکی ہے سائنس کسی بھی طرح دین و مذہب کی ضد نہیں ہے بلکہ سائنسی تحقیقات کی بدولت مذہب کا چہرہ مزید روشن و تابناک ہو جاتا ہے اور اصول دین میں مزید حسن و نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن عظیم کا اصل مقابلہ سائنس سے نہیں بلکہ الحاد و مادیت، نام نہاد عقلیت (RATIONALISM) ریب و تشکیک (SCEPTICISM) اور کفر و شرک سے ہے۔ مادہ پرستانہ فلسفہ اور اس کی ذہنیت یہ ہے کہ مادہ (MATTER) اور اس کے مظاہر کا کوئی خالق و صانع اور ناظم و مدبر موجود نہیں ہے بلکہ یہ پورا سلسلہ تخلیق بغیر کسی مقصد و غایت کے محض بخت و اتفاق کے تحت وجود میں آگیا ہے۔ اور اس کا سارا نظام خود بخود اور آپ سے آپ رواں دواں ہے جس کا نہ تو کوئی خاص نتیجہ برآمد ہوگا نہ انجام۔ خلاصہ یہ کہ مادیت (MATERIALISM) کی نظروں میں یہ کائنات کوئی منصوبہ بند نظام نہیں ہے۔ جیسا کہ خود قرآن اس عقیدہ کو محفوظ کر کے اس پر تبصرہ کرتا ہے:

وقالوا ما ھی الا حیوتنا الدنیا نموت ونحیی وما یھلکنا الا الدھر وما لھم بذالک من علم ان ھم الا یظنون: اور ان کا کہنا ہے کہ اس دنیوی زندگی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم (یہیں) مرتے اور جیتے ہیں۔ ہمیں صرف زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے (جو کچھ ہے وہ سب زمانے کے تغیرات ہیں نہ کوئی خدا ہے اور نہ کوئی خالق و مربی) دراصل انہیں اس معاملہ میں کوئی علم ہی نہیں ہے۔ یہ تو نری قیاس آرائیاں کرتے ہیں (جاثیہ ۲۴)

یہ مادیت کے عقیدے کی صحیح ترجمانی اور اس پر بہترین تنقید و تبصرہ ہے[1] یعنی ان کے

---

[1] الحاد و دہریت کا عقیدہ زمانہ قدیم سے خال خال طور پر پایا گیا ہے۔ لیکن آج وہ جس عالمگیر شکل میں نظر آرہا ہے اس کی مثال کسی دور میں نہیں ملتی۔

پاس اس عقیدہ کی صحت و صداقت پر کوئی علمی دلیل نہیں ہے بلکہ صرف ظن وتخمین اور مغالطہ وسفسطہ (SOPHISTRY) ہے۔ ان کے تخیلات و مفروضات اندھیرے میں تیر چلانے اور ٹامک ٹوئیاں مارنے کے مترادف ہیں جس کی حیثیت علمی دنیا میں تار عنکبوت سے زیادہ پائیدار نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا ملحدین و بے دینوں کو اپنے نظریہ کی صحت وصداقت پر کوئی مثبت علمی و آفاقی دلیل پیش کرنی چاہیئے جس کو وہ قیامت تک پیش نہیں کرسکتے۔ بلکہ الٹے نظام کائنات کا ذرہ ذرہ خدا پرستی کی تصدیق و تائید کرتا نظر آئے گا اور تمام مظاہر فطرت خلاق عالم کی اطاعت وفرمانبرداری کا صاف صاف اعلان کرتے دکھائی دیں گے۔

ولہ من فی السمٰوٰت والارض کل لہ قانتون: زمین اور آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے سب اس کی ملکیت ہے۔ اور ہر ایک اسی کا فرمانبردار ہے (روم: ۲۶)

اب کائنات کے سائنٹفک جائزہ سے مظاہر کائنات کے "قنوت" یا فرمانبرداری کا حال پوری طرح آشکارا ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عالم حیوانات و عالم نباتات اور خود انسانوں تک کا ایک ایک عضو اور ایک ایک پرزہ، ایک ایک ڈالی، شگوفہ، پھول، پھل اور مختلف برگ و بار وغیرہ سب کے سب "قنوت" کا کلمہ پڑھ رہے ہیں اور ایک حیرت انگیز خودکارانہ نظام کے تحت رواں دواں ہیں۔ ان کی ساخت و پرداخت اور ان کا طبعی و فطری نشو و نما بالکل متعین اور ہمیشہ لگے بندھے اصولوں کے تحت ہوتا ہے۔ خلاق فطرت اور مدبر... کائنات نے جس جس نوع کا جو فطری ضابطہ مقرر کر دیا ہے وہ اس سے ذرہ برابر بھی تجاوز نہیں کرتی۔

وخلق کل شئی فقدرہ تقدیراً: اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کا ایک (فطری) ضابطہ مقرر کیا (فرقان: ۲)

آج مادہ پرستانہ ذہنیت اور اس کے عقیدہ کا پرچار مختلف قسم کے فلسفوں اور نظریوں کی شکل میں کچھ اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ لوگوں کو اس نظریہ کے علمی و سائنٹفک ہونے کا دھوکا

ہو جاتا ہے۔ سائنسی نظریات و اکتشافات سے مادیت کی تائید ہرگز نہیں ہوتی، بلکہ سائنس صرف کائنات کی مشنری، اس کے کل پرزوں اور اس کے رازہائے سربستہ کو بے نقاب کرتی ہے جو بالکل ایک غیر جانب دارانہ یا "سیکولر" تحقیق ہے۔ سائنس کے بے لاگ اکتشافات کے باعث آج اس کا "قیمتی ووٹ" مذہب اسلام کے بیلٹ بکس (BALLOT BOX) میں منتقل ہو رہا ہے۔ مگر مادہ پرست بالکل بازاری سیاست دانوں کی طرح اپنے خود ساختہ عقائد اور غلط و بے بنیاد قسم کی فلسفیانہ نظریات کو سائنٹفک حقائق کے ساتھ خلط ملط کر کے سائنس کا "قیمتی ووٹ" اپنی جھولی میں ڈال لینا چاہتے ہیں اور سوفسطائیت (SOPHISTRY) کا مظاہرہ کر کے پوری دنیا کو مغالطہ میں مبتلا کر دینا چاہتے ہیں مگر ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

غرض سائنس کا یہی وہ قیمتی ووٹ ہے جو قرآن کریم کے انکشافات کے مطابق آفاقی و انفسی دلائل کا روپ دھار کر ہر قسم کی باطل پرستیوں کا قلع قمع کر دیتا ہے۔

بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق و لکم الویل مما تصفون۔ بلکہ ہم حق (کی لاٹھی) کو باطل پر پھینک مارتے ہیں جو ان کا بھیجہ پھاڑ دیتی ہے جس کے نتیجے میں وہ نابود ہو جاتا ہے۔ اور تمہاری خرابی ہے جو تم طرح طرح کے بیانات دیتے رہے ہو (انبیاء: ۱۸)

سائنس کی گوشمالی مذکورہ بالا ملاحظات سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ سائنس ایک آئینہ صافی ہے جس کی روشنی میں ہر کوئی حقیقت حال کا چہرہ دیکھ سکتا ہے اور اپنے خود ساختہ افکار و خیالات کی خامیوں کا حال ایک کھلی کتاب کی طرح پڑھ سکتا ہے۔ کیوں کہ نقاش فطرت نے کائنات کے نظام اور اس کی ساخت و پرداخت میں حیران کن حد تک مختلف قسم

کی حکمتیں، مصلحتیں اور اسباق و بصائر رکھ دیئے ہیں۔ اس طرح کہ محض ذرا سی کھوج کرید تحقیق و تفتیش اور تلاش و جستجو سے یہ ابدی سچائیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔

وما خلقنا السموت والارض وما بینھما لعبین۔ وما خلقنٰھما الا بالحق ولکن اکثرھم لایعلمون: اور ہم نے زمین آسمانوں اور ان دونوں کے درمیانی مظاہر کو کھیل کود میں نہیں پیدا کیا ہے۔ (بلکہ حقیقتاً) ہم نے ان دونوں کی تخلیق حکمت و مصلحت کے ساتھ کی ہے مگر اکثر لوگ ان باتوں سے ناواقف ہیں (دخان: ۳۸-۳۹)

ہر دور میں باطل افکار و آراء کی تردید اور باطل پرستوں کی سرکوبی و گوشمالی ضروری ہے ورنہ پھر خدا پرستی کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہ سکتا اور انسانی و اخلاقی اقدار سخت خطرہ میں پڑ جائیں گی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ ہر دور میں قطعی و فیصلہ کن دلائل و بینات کے ذریعہ حق کی نصرت و حمایت اور باطل کی سرکوبی کرتا ہے۔

ان اللہ لایصلح عمل المفسدین۔ ویحق اللہ الحق بکلمٰتہ ولو کرہ المجرمون: اللہ فسادیوں کے کام کو پنپنے نہیں دیتا۔ اور اللہ اپنے کلمات (دلائل و براہین) کے ذریعہ حق کو حق کر دکھاتا ہے۔ اگرچہ مجرم اس کو ناپسند ہی کریں (یونس: ۸۲)

ویمح اللہ الباطل ویحق الحق بکلمٰتہ انہ علیم بذات الصدور: اور اللہ باطل کو مٹاتا ہے اور اپنے کلمات کے ذریعہ حق کو حق کر دکھاتا ہے۔ بیشک وہ دلوں کے حالات تک سے واقف ہے (شوریٰ: ۲۴)

سائنس کی یہ افادیت و اہمیت اپنی جگہ پر بالکل مسلّم ہے جس میں کسی شک و شبہ اور رد و قدح کی گنجائش نہیں ہے۔ مگر ہاں ایک حیثیت سے خود سائنس اور سائنس والوں کی بھی تھوڑی سی گوشمالی ضروری ہے تاکہ انسان کو خودسری و خود فریبی کے مرض سے بچایا جا سکے یعنی انسان اپنے علوم و تحقیقات پر کبھی مغرور و متکبر نہ بن جائے اپنی عقل و تدبیر پر نازاں و فرحاں نہ ہو جائے اور اس کے دماغ میں غرور و گھمنڈ کے جراثیم سرایت نہ کر جائیں۔ بلکہ

اس کو ہمیشہ اپنی بے بضاعتی و ناپختگی، خام کاری اور نامکملیت کا قوی و شدید احساس ہوتا رہے تاکہ وہ اپنے سے زیادہ قوی، مکمل، پختہ اور ہمہ داں و ہمہ بیں ہستی کی بارگاہِ الوہیت میں جھک سکے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کائنات اور اس کے مظاہر کی اصل کُنہ و حقیقت تک کبھی رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کا علم ہمیشہ سطحی اور واجبی واجبی قسم کا رہے گا جیسا کہ کلوروفل کے مباحث سے ظاہر ہوگا۔ اس قسم کا احساس مطالعہ کائنات کا لازمی نتیجہ ہے اور ہر سچا سائنس داں اس حقیقت عظمیٰ کو تسلیم کرنے پر مجبور رہے جس میں اس کو کسی قسم کا باک یا عار نہیں ہو سکتا اور نہ ہونا چاہیئے۔

انسان کا کائنات کے مکمل علم کو حاصل نہ کر سکنا دراصل اس بات کی ناقابل تردید دلیل ہے کہ ان ظواہر کے پس پردہ ایک زبردست ہستی کرسی نشین ہے جو اسکیم کے مطابق انسان کو بالکل تھوڑا سا علم عطا کرتی ہے، مکمل حقیقت تک اس کی رسائی ہونے نہیں دیتی۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

وَلَا یُحِیطُونَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ: اور یہ لوگ اس کے اتنے ہی علم کا احاطہ کر سکتے ہیں جتنا کہ وہ چاہتا ہے (بقرہ: ۲۵۵)

یہ ربانی دعویٰ عین مطابق واقعہ ہے۔ الغرض سائنس یا سائنس دانوں کی تادیب اس حیثیت سے بھی ضروری ہے کہ آج عام طور پر اس کی حیثیت ایک مہادیو یا بے تاج بادشاہ کی سی ہو چکی ہے۔ اکثر حلقوں میں سائنس ایک جدید دیوی کی حیثیت سے دھڑا دھڑ پُج رہی ہے۔ لوگ ہر معاملہ میں سائنس ہی کی طرف رجوع کرنے اور اس کی دہائی دینے کے عادی ہو چکے ہیں۔

——— باقی

لطائفِ اکبری نادر قلمی ملفوظ

خواجہ علی اکبر مودودی (م ۱۲۰۹ھ) کے احوال واقعی

(۲)

جناب مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی۔ استاد دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

احمد شاہ، درانی (یا ابدالی) متعدد بار ہندوستان آیا۔ ابتدائی دو ایک یورشیں اس کی پنجاب تک محدود رہیں۔ پہلی دفعہ اس کے دلّی آنے کا زمانہ ۱۱۷۰ھ، ۱۷۵۷ء ہے۔ آخری بار جب آیا تو ۱۱۷۵ھ، ۱۷۶۱ء تھا۔ اسی یورش میں اس نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی زبردست طاقت کو پاش پاش کیا اور فاتح و کامران دلّی میں داخل ہوا، خواجہ مودودی نے ابدالی کے دلی آنے کے زمانے کو اپنے لکھنؤ پہنچنے کی تاریخ سے مطابق بنایا ہے، یہ اس کی کون سی آمد تھی، صاف نہیں ہے۔ قیاس یہی کیا جاسکتا ہے کہ آخری آمد (۱۱۷۵ھ، ۱۷۶۱ء) مراد ہوگی۔ جب اس نے شاہ عالم کو خود غرضوں اور مفاد پرستوں کے گھیرے سے نکال کر خود مختارانہ حکمرانی کا موقعہ فراہم کیا ہے نزہۃ الخواطر کے مصنف نے ــــ اگرچہ بغیر کسی حوالے کے ــــ یہ جو لکھا ہے کہ

ثم سافر الی الہ آباد سنۃ احدی وسبعین ومأۃ والف ......

پھر خواجہ علی اکبر مودودی نے ۱۱۷۱ھ میں الہ آباد کی سمت سفر کیا......

تو اس سے ۱۱۷۵ھ میں ان کے لکھنؤ آنے پھر وہاں سے الہ آباد کی سمت سفر کرنے کا قیاس کمزور ہوجاتا ہے اور "روزیکہ داخل شدیم جزم شد کہ احمد شاہ درانی در شاہجہاں آباد شد" کا مطلب وہی لینا پڑتا ہے جو مصنف نزہۃ الخواطر کی صراحت کے مطابق ہو یعنی احمد شاہ درانی کی دلّی میں پہلی آمد (۱۱۷۰ھ) کے موقع پر خواجہ مودودی سفر کرتے لکھنؤ پہنچے تھے۔

"لطائف اکبری" ملفوظ ہے، سوانح حیات نہیں اس لئے ملفوظات کے ضمن ہی میں جابجا ان کے سوانح بھی مذکور ہوگئے ہیں، نزہتہ الخواطر کے مصنف نے لکھا ہے کہ "خواجہ مودودی کے پیرومرشد اور چچا کا جب انتقال فرخ آباد میں ہوا اور لاش بریلی لاکر دفن کی گئی تو خواجہ مودودی بھی بریلی آئے اور وہیں قیام کیا۔ پھر ۱۱۷۱ھ میں الہ آباد چلے گئے" یہ (عربی عبارت کا ترجمہ ہے۔ اصل عبارت اوپر گذر چکی ہے) لطائف اکبری میں یہ تفصیل تو نہیں ملتی۔ اتنا ضرور ملتا ہے کہ ان کے پیرومرشد کا مزار بریلی میں تھا، جیسا کہ صفحہ ۵۰۰ میں ضمناً مذکور ہے:

چوں جناب زبدۃ العرفاء در آخر ماہ ذیقعدہ برائے زیارت مرقد مبارک پیر و مرشد خود حضرت سید محمد میر قدس اللہ سرہ الکبیر رونق افزائے بریلی شدہ بودند.....	جب ذیقعدہ کے مہینے کے آخر میں جناب زبدۃ العرفا (یعنی خواجہ علی اکبر مودودیؒ) اپنے پیر و مرشد حضرت سید محمد میر قدس سرہ کے مرقد مبارک کی زیارت کے لئے شہر بریلی میں رونق افروز تھے...

بریلی کا قیام ترک کر کے خواجہ مودودی جب الہ آباد آئے اور وہاں مقیم ہو کر شیخ محی الدین ابن عربیؒ اور شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ کی تصانیف کے مطالعے میں لگ گئے تو نزہتہ الخواطر کا بیان ہے کہ یہ مطالعۂ کتب، شیخ الہ آبادی کے مزار پر جو دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے، ہوتا تھا، تو کیا قیام بھی مزار ہی پر تھا؟ اس سلسلہ میں ملفوظ میں درج ایک واقعہ سے ضمناً معلوم ہوا کہ الہ آباد میں مقام ترپولیہ کے قریب رہائشی مکان تھا۔

بیرون دروازہ خانۂ خویش کہ متصل ترپولیہ الہ آباد داشتند تشریف بردند صفحہ ۵۲۹	اپنے مکان کے دروازہ کے باہر تشریف لے گئے، اور ان کا مکان الہ آباد میں ترپولیہ کے قریب تھا۔

الہ آباد میں کب تک رہے اور وہاں سے ترک اقامت کر کے اجودھیا (فیض آباد) کب گئے۔ اس کی صراحت بھی ملفوظ میں نہیں ہے اور ہوتی بھی کیسے؟ تاریخ و سوانح کی کتاب تو یہ ہے نہیں،

ایک واقعہ کے ضمن میں اتنا مذکور ہے کہ اجودھیا میں خواجہ مودودی کا مکان اس مسجد سے فاصلہ پر تھا جس کو "مسجد فریدی" کہتے تھے :-

روزے جناب زبدۃ العرفا از مسکن	ایک روز جناب زبدۃ العرفا (خواجہ
شریف کہ در اودھ مبارک مقرر بودو	مودودی) اپنے دولت خانے سے جو
من نیز حاضر الخدمت برائے نماز جمعہ	اجودھیا شریف میں تھا اور میں بھی اس
بمسجد یکہ بمسجد فریدی مشہور است ببعدت از	وقت حاضر خدمت تھا. نماز جمعہ کو اس
مسکن شریف	مسجد تک جانے کے لئے برآمد ہوئے جو
ص ۵۵۴	مسجد فریدی کے نام سے مشہور ہے
	اور دولت خانے سے کافی فاصلہ پر ہے

اس روایت کے بیان کرنے والے حاجی شریف الدین خاں صاحب ہیں. جن کے القاب مرتب ملفوظ نے اس طرح لکھے ہیں :-

"صادق صادقان و راسخ راسخان صاحب یقین و ایمان مجمع البحرین دین و اتقان حاجی الحرمین"

یہ وہی حاجی شرف الدین خاں ہیں جن کے لئے لطائف اکبری کا زیر نظر نسخہ لکھا گیا ہے جیسا کہ اس کے ترقیمہ سے ظاہر ہے کہ :-

"برائے پاس خاطر حاجی حرمین الشریفین حاجی شرف الدین خاں کتابت (کذا) الحروف سید سبحان علی"

مرتب ملفوظ خواجہ حسن نے حاجی شرف الدین خاں کا تعارف بھی کرا دیا ہے :-

یکے از غلامان اصدق و مریدان ارسخ جناب	حاجی شرف الدین خاں، زبدۃ العرفا (خواجہ مودودی)
زبدۃ العرفا است از ابنائے یکے از رئیسان	کے سب سے سچے خادم اور سب سے زیادہ راسخ الاعتقاد
راجپوتان این دیار بود پرورش ثروت ہزار کی	مرید ہیں جوار کے رئیس راجپوتوں میں سے ایک رئیس کے

— رؤسائے ایں دیار بعد از تباہ منصب
داری منصب داران شاہ جہاں آباد
سرفراز وممتاز بود۔
بخوش استعدادی خود بعد استماع
کمالات حضرت ایشاں بسنِ دوازدہ یا سیزدہ
سالگی بحضور پرنور رسیدہ بشرف بیعت
مشرف بردست آنجناب استعداد بیعت
در طریقۂ انیقۂ چشتیہ رضی اللہ عنہم اجمعین فائز
وممتاز گشت الحمد للہ علیٰ ذلک وبہ اذن حضور
بحرمین شریفین براوضاع اہل ترک وتجرید
بعد ارتحال آنجناب شتافتہ مستفید طوافین
موصوفین شدہ بزیارت یازدہ امام بعنوان
تحقیق وتدقیق مستعد گردید الحمد للہ
ص ۵۵۴

بیٹے ہیں، ان کے باپ ہزاری ثروت رکھتے تھے۔ اور
جب یہاں کی منصب داری (جو یک ہزاری تھی) ختم
ہوگئی تو دلی کے منصب داروں میں سرفرازی پائی اور ان
میں بھی ممتاز اور سربرآوردہ رہے۔
محض اپنی خوش استعدادی سے جب زبدۃ العرفاکے
کمالات کا شہرہ سنا تو بارہ یا تیرہ سال کی عمر میں حضرت کی
خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور آنجناب کے دست حق پرست
پر سلسلہ عالیہ چشتیہ میں مرید ہوگئے الحمد للہ، اور حضرت
کی اجازت سے حضرت کے وصال کے بعد مکہ معظمہ
اور مدینہ منورہ اسی طرح روانہ ہوگئے جیسے اہل ترک و
تجرید (درویش صفت اولیاء اللہ) سفر کرتے ہیں۔
(نہ سامان سفر کی فکر نہ یار و مددگار کی خواہش) اور
دونوں مقدس مقاموں سے سعادت حاصل کرکے
بارہ اماموں کے مزارات کی تحقیق وجستجو کے ساتھ
زیارت کی الحمد للہ الحمید المجید علیٰ ذلک۔

لطائف اکبری کا جو مخطوطہ اس مضمون کے سلسلہ میں پیش نظر ہے وہ ان ہی حاجی شرف الدین خاں کے خاندان کی ملکیت بھی رہا ہے۔ کتاب کے سرورق پر جو تحریر ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے اگرچہ پوری عبارت پڑھی نہیں جاتی ہے لیکن جو پڑھنے میں آگیا وہ مطلب سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ عبارت اس طرح پر ہے: "بعد وفات حاجی شرف الدین ... ملفوظ بملک فقیر نظام الدین احمد بلیغی صاحب ملفوظ رسید و ایں فقیر بہ نور بصر ..... محمد بشیر سلمہ اللہ ..... حررہ شانزدھم ربیع ..... سنہ ۱۲ھ شہر لکھنؤ" (یعنی حاجی شرف الدین کی وفات کے بعد یہ کتاب نظام الدین احمد

کی ملکیت میں آئی جو مالک ملفوظ کے متبنیٰ ہیں اور ۱۶ ربیع الاول یا ربیع الثانی ۱۲۷۱ھ کو یہ کتاب نور چشم محمد بشیر سلمہ کو ہبہ کر دی گئی۔

خواجہ مودودی کا انتقال جیسا کہ شروع میں مذکور ہو چکا ہے۔ یکم جمادی الاول ۱۲۰۹ھ کو اجودھیا میں ہوا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔ یہ زمانہ اودھ میں آصف الدولہ کی حکمرانی کا تھا۔ اسی ملفوظ سے ضمناً یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خواجہ مودودی کی عمر کے آخری بیس پچیس سال اجودھیا میں گذرے ہیں، یہ اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے جو خواجہ مودودی نے مرتب ملفوظ خواجہ حسن کو اپنا خلیفہ مجاز بناتے ہوئے قلم بند کی تھی اور جس کو مرتب ملفوظ نے لطائف اکبری میں نقل کر دیا ہے:-

..... بعد ماذاق حلاوۃ المعرفۃ الوجدان عند التلاقی بہ سنۃ ثمان و ثمانین ومأۃ بعد الف من الھجرۃ المقدسۃ علی ماحبھا الصلوۃ واخلص ھمتہ بعد ما مرت اربع سنتہ فی الاشتغال الدائمی مع الحق سبحانہ بما امرت بہ قبل ذلک من الاشغال الی ان یبایع علی یدی فبایع والبس الخرقۃ فی التاسع من المحرم سنتہ ثلث وتسعین ومأۃ بعد الف ملکا۔

(جامع ملفوظ خواجہ حسن نے) مجھ سے ۱۱۸۸ھ میں ملاقات کے وقت سے معرفت اور وجدان کی لذت سے آشنا ہونے کے بعد، ان اعمال و اشغال پر چار سال تک مداومت کی جن کی میں نے ہدایت کی تھی، اب ان کی ہمت کا تقاضا ہوا کہ میرے ہاتھ پر بیعت کریں تو میں نے ۹ محرم ۱۱۹۳ھ کو ان کو اپنا مرید کیا اور خرقۂ خلافت بھی پہنایا ....

خواجہ حسن سے خواجہ مودودی کی ملاقات ۱۱۸۸ھ میں ہوئی جیسا کہ مذکورہ عبارت سے ظاہر ہے اور ۱۱۹۳ھ میں خواجہ حسن کو خلافت ملی۔ گلدستۂ مودودی میں (خواجہ حسن کے خاندان کے ایک فرد کی اردو تصنیف مطبوعہ ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۶ء مطبع اشاعت العلوم فرنگی محل لکھنؤ) میں لکھا ہے کہ خواجہ حسن نے "۱۱۸۹ھ میں اپنے مرشد کے حکم سے شہر فیض آباد سے ـــــ اور بروایت

دیگر دہلی سے ــ آکر محلہ رستم نگر لکھنؤ میں اپنے پیر بھائی نواب محبت خاں بہادر شہباز جنگ کے مکان پر قیام کیا۔" اس سے کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ خواجہ مودودی ۱۱۸۰ھ میں اجودھیا میں مقیم ہو چکے تھے۔ کب سے مقیم تھے؟ اس کا کوئی حوالہ اب تک نظر سے نہیں گزرا۔

اس اجازت نامہ کی عبارت سے جس کا اقتباس ابھی پیش کیا گیا ہے، یہ بھی معلوم ہو گیا کہ صاحب ملفوظ خواجہ مودودی اور مرتب ملفوظ خواجہ حسن میں ارادت و بیعت کا رشتہ تو تھا ہی، نسبتاً بھی بہت قریبی تعلق تھا۔ خواجہ مودودی نے :-

ابن خالتی ابن ابن عمتی مھبط الافضال والمنن الخواجہ محمد حسن	میرے خالہ زاد بھائی اور میری پھوپھی کے پوتے اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کے مہبط خواجہ محمد حسن، .....

کے الفاظ سے جامع ملفوظ کو یاد کیا ہے۔ "گلدستۂ مودودی" میں بہت تفصیل سے دونوں کے نسب اور رشتہ داروں کا بیان موجود ہے جس کو یہاں دہراتے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔

صاحب ملفوظ خواجہ مودودی، آخر عمر میں اجودھیا (ضلع فیض آباد) میں مقیم ہو گئے تھے۔ اور وہیں ان کے دست گرفتہ اور مریدین حاضر خدمت ہو کر فیض حاصل کیا کرتے تھے، اگرچہ لطائف اکبری میں ہر "ملفوظ" یا "مسموع" کے ساتھ لازمی طور پر محل وقوع ذکر نہیں ہے لیکن کہیں کہیں اس کی صراحت پائی جاتی ہے کہ "فلاں مرید کے یہاں تشریف رکھتے تھے۔ جب یہ گفتگو ہوئی اور یہ ارشاد فرمایا" اس صراحت سے یہ معلوم ہوا کہ اجودھیا سے گاہ گاہ لکھنؤ تشریف لایا کرتے تھے گو عموماً یہی ہوتا تھا کہ مریدین اور متوسلین، اجودھیا جا کر کسب فیض کیا کرتے تھے، بلکھنؤ آنے کے سلسلے میں لطائف اکبری میں کئی جگہ اشارہ ملتا ہے۔ مثلاً:-

حضرت زبدۃ العرفا، کلبۂ فقیر را رشک فردوس ساختند دریں روز ہمشیرۂ فقیر	ایک روز زبدۃ العرفا نے (خواجہ مودودی نے) میرے غریب خانے کو اپنی تشریف آوری سے رشک فردوس

داخل طریق گردید ..... قبل از اشتغال
بطعام برادر از جاں عزیز تر خواجہ
محمد حسین سلمہ اللہ تعالیٰ فرمودند کہ از عزیزے
شنیدہ ام کہ عزم مرزا محمدی بیگ است
سلمہ اللہ کہ از فیض آباد روانہ ایں صوب
شوند ..... بجہتہ تلافی فقیر عزم نمودہ
باشند ..... برادرم سلمہ اللہ پرسید
کہ معلوم نیست کہ کے خواہند رسید فرمودند
ہمیں امروز فردا، بعد ازیں ..... عزیزے
رسید و خبر آورد کہ مرزائے مذکور آمدند و
جائیکہ جناب ایشاں سکونت داشتند
فرود آمدہ قیام گرفتند .....

ص ۱۲

بنایا تھا اور اسی روز میری بہن حضرت کی مرید ہوئی
تھیں (مرتب ملفوظ خواجہ حسن کی بہن) ..... کھانا
نوش فرمانا شروع کرنے سے قبل میرے عزیز از
جان بھائی خواجہ محمد حسین سلمہ سے مخاطب ہو کر
فرمایا کہ، کوئی صاحب کہہ رہے تھے کہ مرزا محمدی بیگ
سلمہ فیض آباد سے یہاں آنے والے ہیں ..... میری
ملاقات کی غرض سے ..... میرے بھائی نے کہا کہ
"نہ معلوم کب آئیں گے"۔ فرمایا "آج ہی کل ہیں"
اس کے بعد .... (کھانا کھانے کے بعد
جب حضرت قیلولہ کے لئے لیٹ چکے تھے) ایک
صاحب آئے اور انھوں نے اطلاع دی کہ مرزا
محمدی بیگ آئے ہیں اور حضرت کا جہاں قیام ہے
وہیں اترے ہیں۔

یہ واقعہ لکھنؤ ہی کا ہے، مرتب ملفوظ خواجہ حسن لکھنؤ ہی میں رہتے تھے۔ خواجہ مودودی اس دن ان کے یہاں کھانے پر گئے ہوئے تھے۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگرچہ اتنی قریب کی رشتہ داری خواجہ حسن سے تھی اور مستعد مرید و خلیفہ مجاز بھی تھے لیکن خواجہ مودودی لکھنؤ آکر قیام کسی دوسری جگہ کرتے تھے۔ خواجہ حسن کے یہاں قیام نہیں ہوتا تھا، خود خواجہ حسن اپنے پیر بھائی نواب محبت خاں کے ساتھ رستم نگر (پرانے لکھنؤ) میں رہتے تھے، نواب محبت خاں کے یہاں بھی ان کے پیر و مرشد کا لکھنؤ میں قیام نہیں ہوتا تھا۔ لطائف اکبری میں کئی جگہ مرتب ملفوظ خواجہ حسن کے گھر پر خواجہ مودودی کے قدم رنجہ فرمانے کا ذکر ہے اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ قیام کہیں اور ہوتا تھا اور خواجہ حسن کے علاوہ دوسرے مریدوں اور عقیدتمندوں کے

یہاں بھی قدم رنجہ فرمایا کرتے تھے۔ جس میں نواب محبت خاں (فرزند حافظ الملک، حافظ رحمت خاں شہید) بھی شامل ہیں جیسا کہ لطائف اکبری میں ہے:-

بجناب زبدۃ العرفا کلبۂ احزان فقیر را بقدوم میمنت لزوم رشک فردوس فرمودند....... پس تشریف را بردہ متوجہ مکان محب۔ بدل و جان نواب محبت خاں سلمہ اللہ تعالیٰ شدند .....

صـ ۳۰۶

ایک روز زبدۃ العرفاء (خواجہ مودودی) نے میرے غم خانہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے رشک فردوس بنایا...... اس کے بعد میرے یہاں سے محب بدل وجان نواب محبت خاں سلمہ اللہ کے مکان کی طرف تشریف لے گئے.......

اسی طرح ایک سلسلہ میں لکھا ہے...

روز عرس حافظ الملک حافظ رحمت خاں مرحوم مغفور جناب زبدۃ العرفا فقیر خانہ را بقدوم تشریف رشک فردوس ساختند.... وبرخاستہ برائے فاتحہ خان صاحب مغفور بسمت مکان نواب صاحب محب بدل و جان نواب محبت خاں بہادر سلمہ الرحمٰن تشریف فرما شدند......

صـ ۳۵۷

حافظ رحمت خاں شہید کے عرس کے روز جناب زبدۃ العرفا نے اپنے قدم مبارک سے غریب خانہ کو رشک فردوس بنایا..... (بات چیت کے بعد) حضرت اٹھے اور حافظ شہید کے فاتحہ میں شرکت کے لئے دل وجان سے محبت کرنے والے نواب محبت خاں کے مکان کی طرف تشریف لے گئے۔

اب تک خواجہ سید علی اکبر مودودیؒ کے احوال پر جتنی روشنی ڈالی گئی ہے اس سے ضمناً اور صراحتاً جو نتائج ہاتھ آئے وہ مختصراً یہ ہیں کہ (۱) سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں مرید تھے (۲) پیر فردو کا نام خواجہ سید محمد میر حسن عرف بھلّی ہے جو پیر بھی تھے اور حقیقی چچا بھی (۳) ظاہری علوم کسی سے نہیں کیے (۴) صاحب تصانیف تھے (۵) تمام علوم ومعارف کا دروازہ ان پر

اچانک کھلا تھا (۶) جوانی میں عشق کے ہاتھوں وارستہ مزاج رہے۔ پھر پیر و مرشد کی توجہ سے عشق مجازی سے چھٹکارا نصیب ہو گیا (۷)، ۱۱۷۱ھ میں دلی سے لکھنؤ پہنچے جہاں سے بقصدِ حج و زیارت آگے روانہ ہوئے (۸)، الہ آباد تک پہنچے تھے (اسی ۱۱۷۱ھ میں) کہ ولولۂ سفر سرد ہو گیا (۹)، وہیں ٹھہر گئے کب تک وہاں رہے؟ اس کا پتہ نہیں چل سکا (۱۰) بہرحال ۱۱۸۶ھ سے قبل ہی وہ اجودھیا (فیض آباد) میں قیام پذیر ہو چکے تھے اور (۱۱) یکم جمادی الاول ۱۲۰۹ھ کو وہیں وفات پائی (۱۲) اجودھیا میں قیام کے دوران گاہے، لکھنؤ اور بریلی کا سفر کیا (۱۳) بریلی ہی میں ان کے پیر و مرشد کا مزار ہے، یہ سب امور "لطائف اکبری" کے اندراجات سے منکشف ہوئے۔

لطائف اکبری دراصل خواجہ علی اکبر مودودی کے اقوال کا مجموعہ ہے، سوانح اور سیرت کی کتاب نہیں ہے جس کے ذریعہ حالات زندگی کے تمام جزئیات معلوم ہو سکیں مجموعۂ اقوال سے حالات کے سلسلے میں جتنا کچھ ہاتھ آسکتا ہے وہ ضمناً ہی ہوگا "لطائف اکبری" کے اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ 'اقوال' یا ملفوظات کے جمع کرنے کا کام جامع ملفوظ خواجہ حسن مودودی (خلیفہ اور جانشین) نے ۱۲ ربیع الاول ۱۱۹۴ھ سہ شنبہ سے شروع کیا اور پہلا ملفوظ عصر کی نماز کے وقت کا ہے:-

(کذا)
فی التاریخ احدی و عشرین من شہر ربیع الاول من سنۃ اربع و تسعین و مأۃ بعد الالف من الھجرۃ المقدسۃ علی صاحبھا الصلوۃ والسلام یوم الثلثاء وقت العصر (ص۷)

یعنی ۱۲ ربیع الاول ۱۱۹۴ھ یوم سہ شنبہ وقت عصر....

ان ہی اندراجات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دو ڈھائی سال تک، جامع ملفوظ نے "ملفوظ" قلم بند کرنے کا کام جاری رکھا اور یہ وہی مدت معلوم ہوتی ہے جو شیخ مودودی نے لکھنؤ کے قیام میں گذاری، ان کا مستقل قیام تو اجودھیا (ضلع فیض آباد) میں رہتا تھا اور

جامع ملفوظ خواجہ حسن، لکھنؤ میں رہتے تھے گاہ گاہ پیرومرشد کی خدمت میں اجودھیا بھی حاضر ہوتے تھے، اگرچہ صراحتاً یہ نہیں ملتا کہ پورے ملفوظ کا یا اس کے مختلف اجزاء کا تعلق کس سرزمین سے ہے تاہم۔ بیشتر مقامات پر جامع ملفوظ کا یہ اظہار کہ "غریب خانہ پر تشریف لائے" یا "نواب محبت خاں کے دولت کدے پر قدم رنجہ فرمایا" وغیرہ وغیرہ، اشارہ ہے کہ قلم بند ملفوظ کا تعلق صاحبِ ملفوظ کے قیام لکھنؤ کی مدت ہی سے ہے۔

قلم بند کرنے کا طریقہ خواجہ حسن نے یہ رکھا تھا کہ جو کچھ محفل میں سنتے یا پیش آتا اسے محفل برخاست ہونے کے بعد لکھتے اور پہلی فرصت میں شیخ مودودی کی خدمت میں اپنی تحریر اصلاح وتوثیق کے لیے پیش کر دیتے۔ محفل میں بعض باتیں ایسی بھی ہوئیں جن کو قلم بند کرنے سے خود شیخ مودودی نے روک دیا مثلاً ایک کرامت کے سلسلے میں جس کے شاہد سے:۔

تعجبِ سخت بر حاضراں دریں فقیر روداد — حاضرینِ محفل اور راقم الحروف کو نہایت حیرت ہوئی۔

جامع ملفوظ خواجہ حسن کو روک دیا کہ "اس کو قلم بند کریں۔ جامع ملفوظ لکھتے ہیں کہ:۔

خواستم کہ ایں ماجرا را مرقوم سازم و بکتابتش مشغول گشتم از دور دیدہ فرمودند چہ می نویسی؟ — میں اس کرامت کی تفصیل قلم بند کرنا چاہتا تھا اور اس کے لکھنے میں مشغول تھا کہ شیخ مودی نے دور سے دیکھ لیا اور پوچھا "کیا لکھ رہے ہو؟"

خواجہ حسن نے صورت حال کے اظہار میں تامل کیا اور اصل بات کو چھپانے کی کوشش بھی کی اس پر خواجہ مودودی نے کہا:

اگر ایں مقدمہ را می نویسی قسم است بسرِ من کہ نباید نوشت چہ ایں حالات نزد ایں طائفہ خارج از مبحث اند و ایں کمال نیست بلکہ نقصان است ..... ناچار آں وقت حسب الارشاد — اگر یہی معاملہ (جو کرامت کے طور پر ابھی پیش آیا ہے) لکھ رہے ہو تو تمہیں میرے سر کی قسم ہے کہ .. .. اس کو نہ لکھو، یہ کیفیات (جن کے

وحلفِ آنجناب موقوف ساختہ۔

تحت کرامت کا صدور ہو جاتا ہے) طبقۂ اولیاء میں خارج از بحث سمجھے جاتے ہیں اور ان کو بزرگی کا کمال نہیں بلکہ بزرگی کا نقص خیال کیا جاتا ہے ... مجبوراً حسب ارشاد اور قسم دلادینے کی وجہ سے اس وقت میں نے یہ واقعہ نہیں لکھا۔

اس کے بعد جامع ملفوظ نے عرض معروض کی کہ "ہمارے بزرگوں نے اپنے بزرگوں کے ملفوظات جو جمع کیے ہیں اُن میں بھی ایسے معاملات (واقعاتِ کرامت) موجود ہیں تو اگر میں بھی اپنے چشم دید اور صادق القول دوستوں سے سنے ہوئے واقعات (کرامتوں) کو بے کم و کاست لکھ دوں تو کیا نقصان ہو جائے گا؟ خواجہ مودودی نے فرمایا:-

مقام این بزرگان والاشان دیگر است جائیکہ قدم مبارک ایشاں رسیدہ سرِ خود را بداں جا باید سائید۔ لہٰذا روزِ دوم آنچہ دیدہ بودم مرقوم ساختم۔ ص ۳۰۵

ان حضرات کا (خواجۂ اجمیر خواجہ بختیار کاکی، بابا فرید گنج شکر وغیرہ جن کا ذکر اوپر ہوا) مرتبہ اور ہی ہے جس زمین پر ان کے مبارک قدم پڑے وہاں ہمیں جبینِ نیاز رگڑنا چاہیے، اس عرض و معروض کے نتیجے میں ہوا یہ کہ بجائے اسی دن قلم بند کر لینے کے) بہرحال دوسرے دن جو کچھ دیکھا تھا وہ لکھ لیا۔

اسی طرح ایک مرید مفتی خلیل الرحمٰن بھوگانوی پر ایک واردات گزری تھی، انھوں نے دریافت کیا تھا کہ مریدوں کو توجہ دینے کا جو طریقہ ہے صرف حضرات نقش بندیہ سے مخصوص ہے یا صوفیاء کے دوسرے طریقوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ خواجہ مودودی نے فرمایا کہ ہر طریقہ میں یہ پایا جاتا ہے۔ سلسلۂ چشتیہ میں بھی ہے۔ اس کے بعد خواجہؒ اپنے مرید "فضیلت واقف پناہ، حقائق و معارف آگاہ، مفتی خلیل الرحمٰن بھوگانوی کو لے کر اپنے حجرے میں چلے گئے، جامع ملفوظ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ جن میں سے ایک کا نام شاہ عشق اللہ کابلی اور دوسرے کا شاہ تحف علی

تھا۔ حجرے کے باہر دروازے کے قریب ہی رہے خواجہؒ نے حجرے کے اندر مفتی خلیل کو توجہ دینا شروع کیا۔ اندر سے پہلے تو مفتی صاحب کی آواز آتی رہی جیسے وہ نفی و اثبات کا ذکر کر رہے ہوں۔ پھر آواز موقوف ہوگئی، تھوڑی دیر کے بعد خواجہ مودودی حجرے سے باہر تشریف لے آئے اس کے بعد جامع ملفوظ اور ان کے دونوں ساتھی حجرے کے اندر آ گئے تو دیکھا کہ مفتی خلیل مردے کی طرح پڑے ہیں۔ سر پیٹھ سے لگ گیا ہے۔ دونوں آنکھیں چھت کی طرف لگی ہیں، عمامہ سر سے الگ پڑا ہے ..... جب مفتی خلیل کا حال درست ہوا اور وہ باہر آئے خواجہ نے انہیں تلقین کی پھر اپنے حجرے میں واپس جاتے ہوئے :-

فقیر را از تحریر این معنی منع فرمودند چوں سخت طامع بود دل فقیر بر تحریر آں مکرر بعرض رسانیدم سکوت ورزیدند الاجرم بہ تحریر آوردم، دیر کتمان آں نیز مبالغہ نمودہ بودند عاقبت بہ پاسِ التماسِ فقیر ازاں ہم سکوت ورزیدند۔

ص ۳۹

راقم الحروف کو منع کر دیا کہ اس معاملے کو قلم بند مت کرنا۔ چونکہ راقم کا دل اس واقعہ کو قلم بند کرنے پر بیحد حریص تھا۔ اس لئے ان سے بار بار اجازت چاہی۔ خاموش ہو گئے۔ بہر حال اسے معرض تحریر میں لے آیا باصرار یہ بھی فرمایا تھا کہ اس معاملے کا کہیں ذکر بھی نہ کرنا، بالآخر میری التجا کا خیال کرکے اس بارے میں بھی سکوت اختیار فرمایا۔

معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ مودودی، ان معاملوں کو قلم بند کرنے سے روکتے تھے جن سے ان کی بزرگی کا براہ راست اظہار ہوتا ہو، تلقین وارشاد سے متعلق گفتگوؤں کو لکھنے کے سلسلے میں کوئی ممانعت نہیں تھی۔ بلکہ ایسی تحریروں کو وہ دوسرے تیسرے روز، جب ملاحظے میں پیش کی جاتیں تو ان میں اصلاح کر دیتے تھے بلکہ کبھی کبھی ان تحریروں کو اپنی محفل میں دوسروں کو سنوا بھی دیتے تھے۔

گفتگو کا ایک نمونہ تو مولانا محمد ولی فرنگی محلی (شاگرد ملا نظام الدین فرنگی محلی) سے طویل بات چیت کی شکل میں اوپر نقل ہو چکا ہے۔ ان کی محفلوں میں زیادہ تر گفتگو......

وحدت الوجود، شیخ محی الدین ابن عربیؒ اوران کی تصانیف فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ، شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ اوران کی شرح فصوص الحکم کے بارے میں ہوتی تھی خود بھی عقیدتِ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اور شیخ الہ آبادی کی توجہ سے اس عقیدے کے قائل ہوئے تھے۔ اس لئے قدرتاً شیخؒ کا تذکرہ محفل میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ (باقی)

معاونین کی فیس میں اضافہ

بے تحاشہ گرانی سے مجبور ہوکر حضرات ممبران کی اضافہ کیا گیا ہے یہ اضافہ جنوری ۷۱ء سے ہے

(۱) معاونین:۔ چالیس روپے سالانہ کے بجائے پچاس روپے سالانہ

(۲) معاونین عام:۔ پچیس 〃 〃 〃 تیس 〃 〃

(۳) احباء: پندرہ 〃 〃 〃 〃 بیس 〃 〃

ممبری کی قواعد ضوابط کی کاپی دفتر سے طلب فرمائیں۔

مینجر ندوۃ المصنفین۔ دہلی۔ ۶

ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹ء کی جدید مطبوعات حسب ذیل ہیں

۱۔ تفسیر مظہری اردو (نویں جلد) جلد قیمت مجلد ۔۔ ۔ ۱۷

۲۔ حیات (مولانا) سید عبدالحیؒ قیمت مجلد ۔۔ ۔ ۱۱

۳۔ احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت قیمت مجلد ۔۔ ۔ ۹

۴۔ مآثر و معارف (از مولانا قاضی محمد اطہر مبارکپوری) قیمت مجلد ۔۔ ۔ ۱۰

(ترجمہ)

ہندوستان میں اوقاف کا نظام

(مسلم عہد حکومت میں)[1]

ایس نصیر الدین احمد بی۔اے (عثمانیہ) معاون عام ندوۃ المصنفین

ہندوستان میں اوقاف سے متعلق ابتدائی تذکرے عین الملک کی لکھی ہوئی کتاب انشائے مہرو میں ملتے ہیں۔ جو برنی کے قول کے مطابق جلال الدین خلجی (۱۲۹۰ء تا ۱۲۹۶ء) کے عہدہ داروں میں سے ایک تھا۔ کتاب کا مصنف لکھتا ہے کہ سلطان معز الدین سام غوری جو ۱۲۰۶-۱۱۹۵ء میں اقتدار اعلیٰ پر فائز ہو چکا تھا ملتان کی جامع مسجد کے لئے دو گاؤں وقف کیے تھے اور ان کا انتظام شیخ الاسلام (سلطنت کے اعلیٰ مذہبی عہدہ دار) کے حوالے کیا تھا۔ ۱۲۰۶ء میں سلطنت دہلی کے قیام کے بعد بہت سے وقف وجود میں آئے۔ سلطان قطب الدین کے مقبرے کے وقف کے بارے میں ابن بطوطہ کہتا ہے:

"سلطان محمدؐ بن تغلق نے حکم دیا کہ میں سلطان قطب الدین کے مقبرہ کی نگرانی کروں۔ میں نے کہا کہ سلطان قطب الدین کے مقبرہ کے لئے میں نے چار سو ساٹھ اشخاص کو مامور کر لیا ہے۔ لیکن اوقاف کی آمدنی سے نہ تو ان کی تنخواہیں ادا کی جا سکتی ہیں اور نہ ہی ان کے کھانے پینے کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ سلطان نے وزیر سے پچاس ہزار روپے اور ایک ہزار من گیہوں اور چاول دینے کے لیے کہا جو مقبرہ سے ملحقہ اراضی سے غلہ پیدا ہونے تک کافی ہو سکتے

---

[1] (WAKF LAWS AND ADMINISTRATION IN INDIA) کے ایک باب کا ترجمہ

تھے۔"

تاریخ فیروز شاہی سے بھی کئی اوقاف کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ شمس سراج عفیف کی لکھی ہوئی کتاب سے بھی سلاطین دہلی کے قائم کردہ اوقاف کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ وہ لکھتا ہے: " بادشاہ اپنی تخت نشینی کے وقت مذہبی آدمیوں کو زمینات عطا کرتے تاکہ ان کے مقبروں کی نگہداشت اور تعمیر و ترمیم ہوسکے لیکن ایسے تمام اوقاف تباہ ہوچکے ہیں۔ سلطان علاء الدین نے تمام مقابر کی ترمیم کی اور ان سے ملحقہ زمینات و مواضعات کو بحال کیا اور تمام زمینات کو جو بنجر ہوچکی تھیں قابل کاشت بنایا۔"

۱۵۲۶ء میں جب مغلوں نے سلاطین دہلی سے اقتدار حاصل کیا تو انھوں نے بھی اپنے پیشروؤں کی روایات کو باقی رکھا۔ اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ انھوں نے بھی کثیر تعداد میں اوقاف قائم کیے۔

اوقاف کا نظام | سلاطین دہلی نے اوقاف کا جو نظام بنایا تھا۔ وہ مغلوں کے دور میں بھی باقی رہا۔ اوقاف کا انتظامی ڈھانچہ اس طرح تھا:۔

الف۔ مرکزی نظام (ا) سلطان (اا) صدر الصدور

ب۔ صوبائی نظام (ا) صدر صوبہ (اا) صدر سرکار

ج۔ مقامی نظام (ا) قاضی پرگنہ (اا) موضع کا ملّا

د۔ متولی

الف۔ مرکزی نظام | مذہبی اداروں سے اپنے تقدس کے اظہار میں مسلم بادشاہوں نے ہمیشہ پہل کی اور اوقاف قائم کرنے اور ان کو اچھی طرح چلانے میں شخصی دلچسپی لی۔ انشائے مہرو میں درج ہے کہ سلطان محمدؐ بن تغلق اوقاف کے بارے میں اکثر رپورٹیں لیا کرتا تھا۔

شیر شاہ نے اپنے ایک فرمان کے ذریعہ حکم دیا تھا کہ ہر موضع میں ایک مسجد بنائی جائے اور اسکے انتظام کے لئے ایک زرعی اراضی وقف کی جائے۔ اسی طریقہ کے احکام ہندو رعایا کو بھی

دیئے گئے تھے کہ وہ منادر کے لئے اراضی وقف کریں۔ آئین اکبری سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے کئی قاضیوں کو جنھوں نے اوقاف والوں سے رشوتیں لی تھیں برطرف کر دیا تھا۔ سلاطین دہلی اور مغل سلاطین نے اوقاف کی نگرانی کے لئے کوئی علیحدہ محکمہ قائم نہیں کیا تھا۔ بادشاہ کے بعد صدرالصدور (جو سلطنت کا سب سے بڑا مذہبی عہدہ دار ہوتا تھا) اوقاف کا انتظام دیکھا کرتا تھا۔ اس خدمت کے لئے تقدس، دیانتداری، علم شریعت کا جاننا اور اچھے خاندان سے ہونا ضروری تھا آئین اکبری میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ "اس عہدہ پر ایک تجربہ کار آدمی کو مقرر کیا جاتا ہے کیونکہ اس کو مختلف لوگوں کی درخواستوں پر غیر جانبداری سے غور کرنا پڑتا ہے اور فریقین کے ساتھ اچھے طور پر اور مہربانی سے پیش آنا پڑتا ہے اور ایسا عہدہ دار ہی صدر کہلاتا ہے"۔

صدرالصدور رعایا اور بادشاہ کے درمیان رابطہ کی حیثیت سے مستحقہ صورتوں میں وظائف وعطایا (بشمول اوقاف) دینے کی سفارش کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ خود بھی عطایا دیا کرتا تھا۔ (BLOCHMAN) نے لکھا ہے کہ صدران تمام اراضیات کا نگران ہوتا تھا۔ جو مذہبی اور مقدس مقاصد کے لئے دی جاتی تھیں اور ایسی اراضیات آزادانہ طور پر عطا کرنے کے اختیارات بھی رکھتا تھا۔ اپنے اختیارات کے استعمال میں بعض اوقات صدر سے جانب داری کا اظہار ہوتا تھا۔ چنانچہ اکبر نے صدر کے اختیارات کو گھٹا کر ۵۰۰ بیگہ اراضی دینے تک محدود کر دیا تھا۔ اس سے زائد کے لئے بادشاہ کی منظوری ضروری تھی۔ عہدہ دار تقرر کنندہ کی حیثیت سے صدرالصدور صوبہ اور ضلع کے صدور کے کاموں کی تنقیح کیا کرتا تھا جن کے ذمہ منجملہ اور کاموں کے اوقاف کے کام کی دیکھ بھال بھی تھی۔ موزوں اشخاص کو منتخب کر کے بحیثیت صدر تقرر کرنا اور ان کے کام پر اچھی نگرانی رکھنا صدرالصدور کے فرائض میں داخل تھا اور اسی لئے اوقاف کے نظام میں اس کا اہم مقام تھا۔

ب۔ صوبائی نظام | سلطنت دہلی کے زمانہ میں صوبائی نظام ابتدائی حالت میں تھا۔ یہ نظام شیر شاہ اور اکبر کے دور تک مرکوز نہیں ہوا تھا تاہم ہر شہر میں ایک قاضی ضروری

خیال کیا جاتا تھا۔ اکبر کے عہد میں جب کہ صوبائی نظام مرکوز ہو چکا تھا تمام سلطنت کو (۱۷) صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر صوبہ میں (۸) عہدہ دار ہوتے تھے جن میں سے ایک صدر صوبہ ہوتا تھا۔ اگرچہ کہ صوبائی صدر کے فرائض کے بارے میں تفصیلات نہیں ملتیں لیکن یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کے فرائض بھی صدر الصدور کے مانند ہوتے تھے جس کا وہ صوبہ میں نمائندہ ہوتا تھا۔ اوقاف کی دیکھ بھال اور ضلعی صدود پر نگرانی اس کے دو مختلف فرائض تھے۔ لیکن وہ اوقافی جائیداد وں سے بقایا جات وصول کرنے کا مجاز نہ تھا۔ یہ کام بالکلیہ دیوان کے ذمہ تھا۔ اضلاع میں صدر الصدور کی سفارش پر یا اس کی جانب سے صدر سرکار کا تقرر کیا جاتا تھا۔ میراث احمدی میں جو مغلوں کے صوبائی نظام پر ایک اہم دستاویز ہے۔ صوبائی صدور کے حسب ذیل فرائض درج ہیں :۔

(۱) قاضی، محتسب، خطیب، امام، موذن اور متولیوں کی اسناد کی تنقیح۔

(۲) مستقر اور شہروں میں وظائف اور روزینوں کی اجرائی۔

(۳) خیراتی اوقاف کی بر آوردات کی منظوری۔

ج۔ مقامی نظام | قاضی بھی اوقاف کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ نہ صرف بڑے شہروں میں بلکہ پرگنہ میں بھی ایک قاضی ہوتا تھا۔ اس کا تقرر عام طور پر صدر صوبہ کی سفارش پر صدر الصدور کی جانب سے ہوتا تھا۔ قاضی پرگنہ بھی وہ تمام اختیارات رکھتا تھا جو ضلع کے قاضی کے ہوتے تھے بجز اس کے کہ اس کو مرافعہ جات کی سماعت کا اختیار نہ تھا وہ دیوانی اور تعزیری مقدمات کی سماعت کرتا تھا۔ ہدایہ باب ۱۹ اور فقہ فیروز شاہی میں قاضیوں کے حسب ذیل فرائض خصوصی طور پر بیان کیے گئے ہیں :۔

(۱) شادیوں کا اندراج

(۲) حسب ذیل مقدمات کی سماعت :۔

الف۔ بین الریاستی جائیدادوں سے متعلق۔

ب۔ نابالغوں سے متعلق

ج۔ مفقود الخبر افراد سے متعلق

د۔ دیوانوں سے متعلق

مسٹر یم۔ بی۔ احمد نے اپنی کتاب (ADMINISTRATION OF JUSTICE IN - MEDIEVAL INDIA) میں پچھتر قاضیوں کی ایک طویل فہرست دی ہے جو قصبات میں مقرر کئے گئے تھے جس میں اکبری دور کے قاضی سید باری (۱۵۷۲ء) سے لے کر برطانوی عہد حکومت کے قاضی مولوی خیرات علی (۱۸۶۴ء) کے نام بھی درج ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبری دور کے صوبائی نظام سے لے کر برطانوی دور تک پرگنہ قاضیوں کا تقرر باضابطہ طور پر ہوتا تھا حقیقت میں قاضی ہی وہ عہدہ دار ہوتا تھا جو برسر موقع اوقاف کی نگرانی کیا کرتا تھا۔

شیر شاہ نے ایک فرمان جاری کیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوقاف کا انتظام کس طرح ملّاؤں کے ذریعہ تکمیل پاتا تھا۔ وہ کہتا ہے:۔ "گاؤں والے ہر گاؤں میں ایک مسجد تعمیر کریں اور ایک قابل کاشت زمین اس کے لئے وقف کریں۔ ملّا (موذن) اس کی نگرانی کرے۔ ہر ملّا اس کے باضابطہ حسابات رکھے اور تنقیح سازوں سے اس کی تنقیح کروائے۔ ایک اور رجسٹر میں وہ شادی اور وراثت سے متعلق معاملات کو درج کرے" موضع کے ملّا کو اوقاف کے حسابات ایک علیحدہ رجسٹر میں درج کرنا پڑتے تھے جس میں شادیوں و وراثت سے متعلق اندراجات نہ ہوتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوقاف کے حسابات کو کس قدر احتیاط کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔

متولی | متولی بھی وقف کی نگرانی کے ذمہ دار تھے جیسے کہ آج بھی ہیں۔ مسلمان بادشاہوں اور ان کے عہدہ داروں نے متولیوں کے کاموں میں اگر وہ قانون شریعت کے مطابق ہوں تو کبھی بھی مداخلت نہیں کی۔ ابن بطوطہ نے جو سلطان قطب الدین کے مقبرہ

سے ملحقہ وقف کا متولی تھا مقبرہ سے متعلق مختلف کاموں کے لئے چار سو ساٹھ اشخاص کو مامور کر لیا تھا اور اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ سلطان تغلق نے ان اشخاص کو مامور کرنے کی اسے ہدایت کی تھی۔ ابن بطوطہ کا یہ طرز بیان کہ "میرا انتظام"، "میں نے تقرر کیا"، اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ انتظامی معاملات میں اسے کسی شخص سے ہدایات نہیں ملتی تھیں بلکہ وہ خود اپنے اختیارات استعمال کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بادشاہوں نے قانونی طور پر تقرر شدہ متولیوں کو تبدیل نہیں کیا۔ جب سلطان علاء الدین نے کئی ایک تباہ شدہ اوقاف کو بحال کیا تو ان کے متولیوں اور دیگر عہدہ داروں کو بھی بحال کیا جو نکال دیئے گئے تھے لیکن خائن اور رشوت خوار متولیوں کو بادشاہ برطرف کیا کرتے تھے۔ اکبر نے ۱۵۸۰ء میں شیخ ہاشم کو متولی کے عہدہ سے ہٹا دیا تھا جس کے لئے ابوالفضل سے تحقیقات کروائی گئی تھیں اور ان کی جگہ شیخ محمد بخاری کو مامور کیا گیا تھا۔

بہرحال مسلم بادشاہوں نے ایک اچھا نظام عدل بنایا اور اوقاف کی نگرانی بھی اس سے متعلق رکھی۔ اس نظام کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف صوبہ احمد آباد میں (۱۰) سرکاریں (۱۷۹) پرگنے اور (۲۰۴۰) دیہات تھے۔ ہر سرکار اور پرگنہ میں صدر اور قاضی ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ بڑے قصبات میں بھی قاضی متعین تھے۔ ان میں سے ہر ایک صدر الصدور کے سامنے جوابدہ تھا۔ اس طرح پورا نظام عدل اور بالخصوص اوقاف کے نظام کو اس حد تک مرکوز کیا گیا تھا کہ پرگنوں کے قاضی راست صدر الصدور کی جانب سے مقرر کئے جاتے تھے۔ اس اعلیٰ رتبہ پر کبھی کبھی مشتبہ دیانتداری رکھنے والے لوگوں کی پہنچ اعتماد کرنے میں مشکلات کا باعث ہوتی تھی۔ اکبر نے صدر الصدور پر بہت سی پابندیاں عائد کی تھی اور بڑی حد تک نقائص کو دور کر سکا تھا۔

قسط ۔ ۲۸ ۔ سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو برہان مارچ ۱۹۷۱ء

ہندو تہذیب اور مسلمان

از جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب استاذ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ ۔ نئی دہلی

میرزا تقی فیض آبادی کو مرغ بازی کا بڑا شوق تھا۔ مصحفی نے اپنی مثنوی "مرغ نامہ" میں بڑی تفصیل سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ مرزا موصوف کس طرح مرغوں کے پالنے، ان کی غذا اور تربیت کا اہتمام کرتے تھے۔ اس مثنوی کے چند بند ملاحظہ ہوں

جب سے ہیں مرزا تقی کے ہم رفیق ۔۔۔ پیس کر کھاتے ہیں نت تب سے سویق

یعنی جوانی کا مداخل ہے مدام ۔۔۔ تیتر اور چوچڑے میں ہوتا ہے تمام

مرغ بازی کا انہیں ہے بسکہ شوق ۔۔۔ کردان کی رہتی ہیں سوا اہل ذوق (کذا)

کوئی کرے ہے اپنے مرغ کی ثنا ۔۔۔ کوئی کسی مرغ کا دیتا ہے پتا

ذکر ہے مرغوں کے اصل و نسل کا ۔۔۔ اور واں گویا نہیں کچھ اس سوا

رات دن پلاتے ہیں سونے کی غذا ۔۔۔ ان کی تیاری کا عالم ہے جدا

کیوں نہ وہ مرغا ہو پھر رستم تلاش ۔۔۔ اوتریں جس پہ نت اور تیل و ماش

ایک مرغ کی تعریف یوں کرتے ہیں:

اس نے جتوائی انہیں جب سہ ہزار ۔۔۔ مرگیا آخر وہ ایک ہمتک کو مار

مرغ خانے میں ہزاروں جانور رات دن کرتے رہے ہیں شور و شر
مرغ جو دو تین کشتی ہو چڑھا سمجھیے مرغوں کا اس کو بادشاہ

ہیں جو فیض آباد کے مرزا تقی دھوم ہے البتہ ان کے مرغوں کی
کیوں کہ وہ زر دینے میں ہیں بید ریغ کیوں کہ نہ مرغ ہوویں ان کے مثل تیغ

مرزا تقی کے علاوہ بھی کچھ مشہور مرغ باز تھے۔ جن کا مصحفی نے اپنے مخصوص انداز میں یوں ذکر کیا ہے۔

بعد ازاں اکبر علی اصغر علی رکھتے ہیں اس فن میں مشق پختگی
لاکھ چھل بل ان کو یاد ہیں مرغ بازوں کے بھی وہ استاد ہیں

گرچہ ہیں استاد فن مرزا شریف لیک کب رکھتے ہیں یہ طبع لطیف [۱]

مرغ بازی میں بے حد دلچسپی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ زین العابدین خاں (غالباً فیض آباد کے باشندے تھے) کے بیٹے نے مرغ بازی میں اپنی تمام دولت لگا دی تھی۔ [۲]

مرغ بازی کے علاوہ بٹیر بازی کا بھی عام چرچا تھا۔ اہلیہ میر حسن علی رقمطراز ہیں

۱۔ دیوان مصحفی (قی۔ پٹنہ) ج پنجم / ص ۱۲۵ ب۔ ۱۲۷ الف

۲۔ ایضاً۔ ص ۱۲۷ الف۔ سودا نے "در ہجو مرغ سبزواری" کے عنوان سے ایک قطعہ لکھا ہے۔ کلیات سودا ۱/ ص ۳۰۴

"بٹیر، جو کوئل کی ایک قسم ہے بہت ہی جنگجو پرندہ ہے۔ بڑی توجہ اور اہتمام سے ان کی تربیت کی جاتی ہے اور ان کی غذا کا اچھا خاصا انتظام کیا جاتا ہے۔ یہ عزیب چھوٹے پرند جب ایک مرتبہ لڑنے کے لئے چھوڑ دیئے جاتے ہیں تو وہ اپنی جان دے کر ہی بازی کے میدان سے ہٹتے ہیں[1]"

کوئلوں کو بھی لڑنے کی تعلیم دی جاتی تھی[2]

گلہریوں نے بھی مسلمانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ اور نوجوانوں کو بالخصوص ان سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ گلہریوں کو اپنی کلائیوں پر بٹھا کر میلے ٹھیلوں میں جاتے تھے[3]

پرندوں کے علاوہ سانپ بھی مسلمانوں کی تفریح کے باعث تھے۔ اژدہے کی اداکاریوں سے بھی وہ لوگ محظوظ ہوتے تھے[4]

مختصر یہ ہے کہ پرندوں میں بلبل، طوطا، مینا، کوئل[5]، لٹورہ، ابلقہ، تیتر، بٹیر، سارس، شکرا، وغیرہ پالے جاتے تھے اور ان کے کرتبوں سے حظ اٹھایا جاتا تھا[6]۔ بیا چڑیا ہر دل عزیز چڑیا تھی۔ اور اکثر عاشق پیشہ لوگ اس پرند کو پالتے تھے۔ بیا کے بارے میں پینانٹ لکھتے ہیں" یہ ایک بہت ہی ہوشیار اور چالاک پرندہ ہے۔ اس کو بڑی آسانی سے ایک کاغذ کا پرزہ یا کوئی دوسری چھوٹی سی چیز ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی تعلیم دی جاسکتی ہے

۱؎ OBSERVATIONS ETC. P.220

۲؎ کلیات نظیر اکبرآبادی۔ ص ۴۷۴-۴۷۵

۳؎ کلیات نظیر اکبرآبادی ص ۴۷۵ - ۴۷۶

۴؎ ایضاً۔ ص ۴۷۸-۴۸۰

۵؎ بیبر منڈی۔ ۲/ص ۱۲۸، بابرنامہ۔ ص ۴۳۱

۶؎ کلیات نظیر اکبرآبادی ص ۴۷۸

یہ بات تجربے میں آئی تھی کہ اگر کنویں میں ایک انگوٹھی گر پڑے اور بیا کا مالک اسے اشارہ کرے تو وہ گہرے پانی میں گھس جاتی تھی اور اس انگوٹھی کو نکال لاتی تھی۔ یہ کام حیرت سے خالی نہ تھا۔ مزید برآں اس بات کا بھی بڑے وثوق سے دعویٰ کیا جاتا تھا کہ اگر اس چڑیا کو ایک مکان ایک دو بار دکھا دیا جائے تو وہ اشارہ کرنے پر وہاں خط پہنچا سکتی تھی۔[1]

انند رام مخلص کا بیان ہے بعض رند مشرب نوجوان نے بیا چڑیوں کو میلے ٹھیلوں کے موقع پر نوجوان عورتوں کو تنگ کرنے کی تعلیم دی تھی۔ اور ان سے ان عورتوں کے ماتھے کے ٹیکے اتروامنگواتے تھے۔

"بعض از جوانان رندانہ مشرب تماشا دوست حرکات غریب بیا وش می دہند۔ یکی ازاں جملہ این است کہ بر سر دستش گرفتہ در مجمعہا و میلہای بر زند۔ ہر جا زنِ صاحب جمال دوچار می شود، پرواز می دہند و آں طائر سرتاپا باہوش ٹیکہ از پیشانی بسرعت تمام ربودہ می آورد و گاہ از لعل سرپیش حاشیے لذت گرفتہ جانب پرواز دہندہ پیغام بوسہ می گذارد۔"[2]

چوں کہ عوام کو پرند پالنے، اور ان کی تربیت کرنے کا عام شوق تھا۔ لہٰذا پرندوں کی نسلی پہچان ایک فن بن گیا تھا۔ لوگ اس فن میں بھی مہارت پیدا کرتے تھے۔ اختر علی خاں دہلوی کو پرندوں کے انواع و اقسام کی شناخت پر پوری مہارت حاصل تھی اور وہ لوگوں

---

[1] THE VIEW OF HINDOOSTAN: II, P. 266

[2] مراۃ الاصطلاح۔ ص ۱۸۲ الف۔ نیز ملاحظہ ہو۔ کلیات نظیر اکبرآبادی ص: ۲۸۰۔۲۸۲

کو پرند خریدتے وقت مشورہ بھی دیتے تھے [1]

درندوں کی لڑائیاں عہد مغلیہ میں درندوں کو لڑانا اور ان مناظر سے محظوظ ہونا ایک بہت ہی دلچسپ مشغلہ رہا ہے۔ نچلے اور متوسط طبقے کے لوگ بکروں، مینڈھوں، کتوں، سانڈوں اور بارہ سنگوں وغیرہ کو لڑاتے تھے اور خوب خوش ہوتے تھے [2] شاہان مغلیہ اور ان کے امراء ہاتھی، شیر، ہرن، چیتے، سور، تیندوے، سانڈ اور دوسرے درندوں کو لڑاتے تھے [3] جہانگیر بادشاہ کے عہد میں ایک شیر اور سانڈ کی لڑائی کا واقعہ ملتا ہے [4]۔ اونٹ بھی لڑائے جاتے تھے۔ اور اس کام کے لئے اجمیر، گجرات، جودھپور، بیکانیر سے اونٹ منگوائے جاتے تھے [5]

جانوروں کو لڑانے کے موقع پر بازی بھی لگائی جاتی تھی جب شاہی اصطبل کے ہرن لڑائے جاتے تھے تو امراء دو روپے سے آٹھ مہر تک بازی لگاتے تھے [6]

---

[1] THE VIEW OF HINDOOSTAN. II, P. 266.

TWWIING = TRAVELS IN INDIA : P. 131

[2] بابرنامہ ص ۲۵۹، بدایونی (فارسی) ص ۳۹۲

[3] بدایونی (ف) ۲/ص ۳۹۲، فیدیلیسو ص ۳۴

[4] تزک جہانگیری (انگریزی ترجمہ) ۱/ص ۱۵۰ [5] آئین اکبری (ا-ت) ج ۱، ح ۱، ص ۲۷۰۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ "جہاں پناہ اپنی عظمت وشان ونیز دیگر حاضرین کی نشاط اندوزی کے لحاظ سے ان جانوروں کی باہمی جنگ کا تماشہ ملاحظہ فرماتے ہیں اور چند بہترین شتر اس کام کے لئے ہمیشہ تیار رکھے جاتے ہیں خاصے کا بہترین جنگ آزما جانور شاہ پسند نام دوازدہ سالہ خانہ زاد جانور ہے جو اپنے ہمسروں پر ہمیشہ غالب رہتا ہے اور حریف کو پچھاڑنے میں کشتی کے داؤں پیچ اور عجیب وغریب کرتب دکھاتا ہے۔

[6] SOCIETY AND CULTURE IN MEDIEVAL INDIA P. 70

آگرہ اور دہلی کے قلعوں کے نیچے ریتیلے میدانوں میں ہاتھیوں کو لڑایا جاتا تھا[1] اور شاہان مغلیہ میں یہ شغل آخری بادشاہ، بہادر شاہ ظفر تک جاری رہا۔ بہادر شاہ اول[2] اور محمد شاہ[3] بادشاہ کو بالخصوص ہاتھیوں کی لڑائی دیکھنے کا شوق تھا۔ علاوہ ازیں آخر الذکر بادشاہ صبح سویرے بھالوؤں، ایک بھینسے، ایک مینڈھے اور ایک خوفناک سور کو شیر کی کھال پہنا کر ہاتھی پہ حملے کرنے کے لئے تیار رکھا گیا تھا[4]

---

[1] برنیر (انگریزی) ۲۷۶-۲۷۸، ٹیورنیر ۲/ص ۵۰ نیز گلدستہ منشی چیند بھان۔ ۳۴ الف و ب دریائے لطافت (فارسی) ص ۲۵ خلاصۃ التواریخ ص ۱۵-۱۷، منوچی ۲/ص ۳۶۴

[2] اروِن۔ لیٹر مغلس (انگریزی) ۱/۱۲۹، برائے جہاندار شاہ ملاحظہ ہو۔ تذکرۃ الملوک ص ۱۱۹ب

[3] تذکرۃ الملوک۔ ص ۱۱۹ ب، صحیفۂ اقبال " و بعضے از روز ہا نیلان مست کوہ شکوہ بحکم والا در کنار دریا پائی جھروکہ ہائی شاہ برج مبارک یا آئینہ محل مقدس بجنگ؟ ص ۳۴ الف FALL: 1, P. 4

[4] FALL AND THE MUGHAL EMPIRE, 1, P. 4 نیز ملاحظہ ہو۔ صحیفۂ اقبال ص/۳۴ الف۔ ٹیوننگ کا بیان ہے کہ ہندوستان کے شہزادوں میں عام طور پر شیر اور بھینسے کے لڑانے کا شوق پایا جاتا ہے۔ دونوں جانوروں کو ایک محصور میدان میں چھوڑ دیا جاتا تھا جس کے وسط میں ایک موٹی بلی گاڑ دی جاتی تھی۔ شیر بھینسے سے لڑنے میں گریز کرتا تھا اور جب بھینسا اس پہ حملہ آور ہوتا تو شیر بلی پر چڑھ جاتا تھا۔ بھینسا نیچے کھڑا اس وقت تک انتظار کرتا رہتا تھا جب شیر تھک کر نیچے اترنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ جوں ہی شیر نیچے اترتا تھا تو بھینسا اس کو اپنے سینگوں میں اٹھا کر اوپر ہوا میں اچھال دیتا تھا۔ اور جب شیر زمین پہ گرتا تو وہ دوبارہ اس پر وار کرتا۔ آخر میں بھینسے کی ہی جیت ہوتی تھی۔ ص ۲۷۸

آئین شکار میں ابوالفضل نے ان تمام جانوروں کا ذکر کیا ہے جن کو لڑنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ملاحظہ ہو آئین اکبری (ا۔ت) ج ۱، ج ۱، ص ۲۱۶ - ۲۲۹، ۲۲۵، ۲۲۸

ہاتھیوں کی لڑائی کا منظر دیکھنا صرف اختیار شاہی تھا لیکن مغلیہ سلطنت کے زوال اور شاہی رعب و دبدبہ کے انحطاط کے بعد مغلیہ امراء نے بھی اس شغل کو اپنا لیا۔[1] پیناٹ کا بیان ہے ہندوستان کے باشندے بہت ہی رحم دل معلوم ہوتے ہیں لیکن یہاں کے امراء ہاتھیوں، بھینسوں، شیروں، ہرنوں، بارہ سنگھوں، مینڈھوں، بکروں کو آپس میں لڑا کر تفریح کرتے ہیں اور ان جانوروں کو اس فن کی تربیت دی گئی ہے۔[2]

نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ،[3] دونوں کو ہاتھیوں کی لڑائیاں دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اور یہ شغل نواب سعادت علی خاں کے زمانے تک جاری رہا۔[4] ہرچرن داس نے رمضان ۱۱۸۳ھ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ نواب شجاع الدولہ نے ہاتھیوں کی جنگ کا اہتمام کیا تھا۔ اور شہزادہ عالی گوہر (شاہ عالم ثانی) نے بھی ایک تماشہ بین کی حیثیت سے اس میں شرکت کی تھی۔

"در رمضان درہمیں سال (۱۱۸۳ھ) نواب شجاع الدولہ بہادر جنگ فیلان مست در ریتی زیر حویلی خود کنانیدہ و منیر الدولہ و حسام الدین خاں فرستادہ و بادشاہ (شاہ عالم) کہ آمدہ بود حاضر بودند و دیگر خلایق از ادنیٰ تا اعلیٰ قریب پنجاہ ہزار کس دراں وقت از تماشایان حاضر بودند۔ فیلان مست در خود با جنگ نمودند و غالب و مغلوب کرد و بفرار نہادند۔"

---

[1] THE. VIEW OF HINDOOSTAN: II P. 246

[2] ایضاً ۲/ص ۲۴۶ نیز TWINING. P. 478

[3] BENGAL-PAST AND PRESENT (JAN-JUNE 1928) P. 118

[4] لکھنؤ کے نوابین کی ہاتھیوں کی جنگ سے متعلق دلچسپی کے بارے میں برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ گزشتہ لکھنؤ ص ۱۶۹-۱۷۰، چہار گلزار شجاعی ص/۱۷ (الف) VALENTIA. I, PP. 164-55

اس ہنگامے میں چھ اشخاص ہلاک ہوئے۔[۱]

بنگال کا صوبہ دار، مہابت جنگ کو ہاتھیوں کی لڑائی دیکھنے کا شوق تھا۔[۲]

ہاتھیوں کے علاوہ امرا کو دیگر جانوروں کے کرتبوں کے دیکھنے کا بھی بے حد شوق تھا امراء ہرنوں کو جنگ کے لئے تیار کراتے تھے۔[۳] ہرنوں کی لڑائی سے خواص و عوام کی دل چسپی کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ دہلی کے کچھ شکاریوں نے ہرنوں کی ایسی تربیت کی تھی کہ وہ مختلف قسم کے کرتب دکھاتے تھے۔ دہلی کے باہر رمنہ نامی مقام پر ان ہرنوں کے تماشے ہوتے تھے۔ اس تماشہ کو دیکھنے کے لئے امیر و غریب، جوان و بوڑھے، ہر طرح کے لوگ جمع ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ نظام الملک آصفجاہ (وزیر اعظم محمد شاہ بادشاہ) بھی تماشہ دیکھنے گئے تھے۔[۴]

دہلی سے زیادہ لکھنؤ میں درندوں کے لڑانے کا شوق پایا جاتا تھا۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں وحشی جانوروں کے لڑانے کیلئے بڑے بڑے میدان بانس کے ٹھاٹھر وں یا آہنی حصار سے محفوظ کئے گئے تھے جہاں نواب کے علاوہ عوام و خواص تماشہ دیکھنے

---

[۱] چہار گلزار شجاعی ص ۲۰۱ الف ۲۲۵، ۲۲۴، OBSERVATIONS ETC. مختلف جانوروں کی لڑائی

[۲] سیر المتاخرین (فارسی) ص ۵۹۹، ہاتھیوں کی لڑائی کے متعلق مزید معلومات کے لئے دیکھیے:

TWINING = TRAVELS IN INDIA: P. 478 (انگریزی) ۲/ص ۱۱۴

ORIENTAL MEMORIES II, P. 82. VALENTIA. I PP. 159-60

HABER. TRAVELS ETC: I, P. 424

[۳] وقائع بعد از وفات اورنگ زیب (ق) ص ۷۴ ب - ۷۵ ب

[۴] مخزن الطاکین - ۵۶ - اکبر بادشاہ کے زمانے میں بھی ہرنوں کے لڑانے کا شوق پایا جاتا تھا۔ اور بازی لگا کر ہرن لڑائے جاتے تھے۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ آئین اکبری (ا۔ ت) ۱۵، ج ۱، ص ۳۲۳-۳۲۰

جاتے تھے لیے اس طرح شیروں کو اکثر تیندوؤں سے لڑایا جاتا تھا۔ نواب اودھ نے بہت سے شیر جمع کر رکھے تھے۔ بعض مرتبہ شیر اور گھوڑے کو بھی لڑایا جاتا تھا[۲] مختصر یہ کہ لکھنؤ میں چیتے، تیندوے، اونٹ[۳]، گینڈے، بارہ سنگھے، اور مینڈھے بھی لڑائے جاتے تھے[۴]

نظیر اکبرآبادی نے بالخصوص ریچھ کے بچے پالے جانے کا ذکر کیا ہے اور انھوں نے بڑی تفصیل سے ریچھ کے رقص اور اس کے کرتبوں کا ذکر کیا ہے جو باعثِ تفریحِ عوام و خواص تھا۔ ریچھ کے بچے کو جھمکے، کرن پھول نامی زیورات پہنائے جاتے تھے۔ اور اس پر ریشم کی لڑیوں کی ایک جھول ڈالی جاتی تھی۔ اور اس کو اتنا سجایا جاتا تھا کہ وہ گویا پری تمثال نظر آئے۔ "ریچھ کا بچہ" ریچھ کے بچے کے رقص کو نظیر اکبرآبادی نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

مدت میں اب اس بچے کو ہم نے ہے سدھایا لڑنے کے سوا ناچ بھی اس کو ہے سکھایا
یہ کہہ کے جو ڈھپلی کے تئیں گت پہ بجایا اس ڈھب سے اسے چوک کے جمگھٹ میں نچایا
جو سب کی نگاہوں میں کھپا ریچھ کا بچہ

پھر ناچ کے وہ راگ بھی گایا تو وہاں واہ پھر کہروا ناچا تو ہر اک بولی زباں واہ
ہر چار طرف سیتی کہیں پیر و جواں واہ سب ہنس کے یہ کہتے تھے میاں واہ میاں واہ
کیا تم نے دیا خوب نچا ریچھ کا بچہ

اس ریچھ کے بچے میں تھا اس ناچ میں ایجاد کرتا تھا کوئی قدرت خالق کے تئیں یاد

---

[۱] برائے تفصیل۔ گذشتہ لکھنو۔ ص ۱۶۴ - ۱۶۶

[۲] ایضاً۔ ص ۱۶۶-۱۶۸ VALENTIA-1, TIGER FIGHT: PP. 159-60.

[۳] برائے شترخانہ۔ ملاحظہ ہو۔ آئین اکبری (ا۔ت) ج ۱، ح ۱، ص ۲۶۹ - ۲۷۰

[۴] برائے تفصیل گذشتہ لکھنؤ۔ ص ۱۶۸ - ۱۷۴، کلیات نظیر اکبرآبادی ص ۲۷۸

ہر کوئی یہ کہتا تھا "خدا تم کو رکھے شاد" اور کوئی یہ کہتا تھا "ارے واہ رے استاد
تو بھی جیئے اور تیرا سدا ریچھ کا بچّا

جب کشتی کی ٹھہری تو وہیں سر کو جو جھاڑا للکارتے ہی اس نے ہمیں آن لتھاڑا
گہہ ہم نے پچھاڑا اسے گہہ اس نے پچھاڑا اک ڈیڑھ پہر ہو گیا کشتی کا اکھاڑا
گر ہم بھی نہ ہارے نہ ہمارا ریچھ کا بچّا

یہ داؤں پیچوں میں جو کشتی میں ہوئی دیر یوں بٹتے روپے پیسے کہ آندھی میں گویا بیر
سب نقد ہوئے آ کے سوا لاکھ روپے ڈھیر جو کہتا تھا ہر ایک سے اس طرح سے منہ پھیر
یارو تو لڑا دیکھو ذرا ریچھ کا بچّا[1]

غبارہ بازی | ہندوستان میں قدیم زمانے سے ہوا میں غبارہ چھوڑنے کا رواج پایا جاتا تھا۔ غبارہ کاغذ کی ایک تھیلی ہوتی تھی جس میں دھواں یا ہوا بھر کر آسمان پر اڑاتے تھے۔ یہ رواج ہمارے زمانے میں بھی پایا جاتا ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ بالعموم ربڑ کے غبارے چھوڑے جاتے ہیں۔ آنند رام مخلص نے "احوال کرم شب چراغ" کے عنوان کے تحت غبارے بازی کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے۔

"اکثرے از قباحت نعیماں ہندوستان از بر کرم شب چراغ کہ سخت و سبز و براق مانند ورق مینا کار می باشد، مزیح و حاشیہ دامن جامہ وزیر انداز فلیتان می سازند و بال و پر جانور مردہ بہ بلند پرواز نہا می برد لفتند[52]

کشتی رانی | چوں کہ ہندوستان میں کثرت سے ندیاں اور دریا ہیں اس لئے یہاں بحری

---

[51] کلیات نظیر اکبرآبادی۔ ص ۳۷۷۔ ۳۷۸

[52] مراۃ الاصطلاح ص ۱۸۱ ب بنر رقعات مرزا قتیل۔ ص ۔ ۲۸

سفر کے لئے کشتیاں یا ناویں استعمال کی جاتی تھیں۔ مسلمانوں نے بحری سفر کے علاوہ عہد مغلیہ میں کشتی رانی کا شغل برائے تفریح اختیار کیا[۱] مورپنکھ نامی کشتی بالخصوص اس کام کے لئے استعمال کی جاتی تھی[۲] آنند رام مخلص بادشاہوں اور امراء کی کشتیوں کا، جو نوارہ کہلاتی تھیں، ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے۔

"غراب وجہاز نوارہ را اکثر بشکل وصورت جانوران دریامی سازند چنانچہ نوارہ ہائے بادشاہی وسرکار نواب صاحب وزیرالملک بہادر کہ دیدہ شد، اکثر بصورت جانوران است۔ وبہ ہندوستان کشتی عام است و آنچہ برآں ملوک وامرای عظام در دریا سوار شوند آنرا نوارہ می نامند ویک طرف سر نوارہ بنگلہ چوبی باپوشش سقرلاط می باشد ونسبت بکشتی ایں رابسیار بااستو وسبک می سازند وبرنگارنگ نقاشی ودیگر تکلف می پردازند وملاحانش اکثر کشمیری می باشند وہنگام زود غودن در روانہ کردنش بزبان کشمیری آہنگہای غریب ترنم کنند"[۳]

مخلص نے بابر بادشاہ کا ایک بیان بھی نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا تھا۔

"ہیچ سواری باآرام ترچوں سواری کشتی نیست، زیراکہ در ہیچ سواری ہنگام طے راہ خواب کردن و نوشتن بسہولت وآسانی میسر نیست، مگر سواری کشتی"[۴]

اٹھارہویں صدی کے اکثر شاہان مغلیہ اور ان کے امراء نوارہ میں سوار ہو کر تفریح کرتے

---

[۱] بابرنامہ ص ۲۸۷، ۴۰۶ خواندمیر ص ۱۳۵-۱۳۷،

[۲] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ HODGES'S TRAVELS IN INDIA: PP38, 39, 85, 86, JHON MARSHALL IN INDIA: P. 70 میراۃ الاصطلاح ص ۱۰۲ ب

[۳] میراۃ الاصطلاح ص ۱۳۴ الف، چہار چمن، ماخوذ از سفرنامہ آنند رام مخلص ص ۳۲ فٹ نوٹ ۱

تھے اور سیاسی تفکرات سے کچھ لمحات نجات حاصل کرتے تھے۔ محمد فرخ سیر[1]، محمد شاہ[2] اور احمد شاہ بادشاہ[3] اکثر و بیشتر دریا کی سیر کو جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب صفدر جنگ نے مخلص کو ایک نوارہ تیار کرانے کا حکم صادر فرمایا تھا[4]۔

ہندوستان میں کئی قسموں اور ناموں کی کشتیاں پائی جاتی تھیں، بنگرو[5]، پھلوا، پنکھ دا بجرہ، خس خانہ، پھلوارہ، سیر جگا، بھوالیہ، گلہی، گھرط، سکھا، جھبکا، پالنی، ہواس وغیرہ۔

جھولا یا ہنڈولہ قدیم زمانے سے ہندوستان میں عورتوں کے جھولا جھولنے کا رواج پایا جاتا رہا ہے۔ بالعموم ساون کے مہینے میں عورتیں جھولا جھولا کرتی تھیں جس زمانے میں "ہریالی تیج" کا تہوار منایا جاتا تھا[6]۔ منشی رام پرشاد نے اس تہوار کی تفصیل یوں بیان کی ہے "چونکہ دیو شینی ایکادشی پر سبزہ پیدا ہو کر دس پندرہ روز میں نہایت سرور کی حالت پیدا ہو جاتی ہے اس لیے ساون کے مہینہ میں عورتیں "ہریالی تیج" کا تہوار مناتی ہیں اور جھولا جھول کر حمد خدا کی اُستتی کے راگ گاتی ہیں۔"

اس تہوار کے بالخصوص عورتوں سے مخصوص ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں فنون لطیفہ

---

۱ لیٹر مخلص ۱/ص ۳۵۴

۲ سفرنامہ آنند رام مخلص "حضرت ظلِ سبحانی بتقریب شکار ماہی بر نوارۂ خاصہ سوار شدہ سیر دریا می نمودند" ص ۳۲

۳ تاریخ احمد شاہی (ق) ص ۹۰ الف، ۹۲ الف۔ اکبر بادشاہ کے عہد میں کشتیوں کی ساخت وغیرہ کے لیے ملاحظہ ہو۔ آئین اکبری (ا۔ت) ج ۱: ج ۱۔ ص ۲۱۵ - ۲۲۴

"بادشاہ بر نوارہ فرمودہ سیر دریا نمود" ۸۹ ب ۹۰ الف

۴ وقائع آنند رام مخلص (قلمی) ج ۲/ ۹۳ الف، و ب۔

۵ کتاب الہند (ا۔ت) ۲/ص ۳۶۵-۳۶۶

مثلاً موسیقی، مصوری، نقاشی، بیل بوٹے بنانا اور کشیدہ کاری وغیرہ خاص طور پر عورتوں کا حصہ رہا ہے اور وہی اس میں دسترس پیدا کرتی تھیں۔ لہذا یہ بات قدرتی ہے کہ جو شخص تصویر بنانے میں مہارت رکھتا ہے وہی قدرت کے نظارہ کی اصل خوبی پہچان کر اس سے سرور حاصل کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے سبزہ زار کا نظارہ عورتوں کے سرور کا خاص باعث ہوتا تھا اور جھولا سرور کو دوبالا کر دیتا تھا۔ جھولا جھولنے سے بغیر کسی نشہ کے خود بخود لطف و سرور محسوس ہونے لگتا ہے۔

غرض کہ آٹھ دس دن عورتیں نہایت خوشی و مسرت سے گذارتی ہیں۔ اور اس تہوار کو منا کر اور سہاگ کی دیوی یعنی پاروتی کا پوجن کر کے دعا کرتی ہیں کہ ایشور اس سرور سے ہمیشہ سب کو فیضیاب کریں۔ لڑکیاں یہ تہوار زیادہ تر اپنے والدین کے گھر مناتی ہیں کیوں کہ یہاں سسرال سے زیادہ آزادی نصیب ہوتی ہے اور مشاہدہ قدرت کا کافی موقع ملنے پر سرور دوبالا ہو جاتا ہے[1]

[1] ہندو تہواروں کی اصلیت ص ۶۷-۶۹

چند روز جاپان میں

مذہب و امن پر دوسری عالمی کانفرنس

(۲)

سعید احمد اکبر آبادی

انٹرنیشنل کانفرنس ہال کانفرنس (از ۱۶ تا ۲۲ اکتوبر) کا افتتاح اور اس کا انعقاد انٹرنیشنل کانفرنس ہال میں ہوا۔ یہ ہال جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ تعمیر ہی کیا گیا ہے بین الاقوامی کانفرنسوں اور اجتماعات کے لئے۔ یہ ایک شش منزلہ نہایت وسیع اور خوبصورت عمارت ہے جو ہمارے ہوٹل سے پندرہ سولہ کیلو میٹر کی مسافت پر ایک خوشنما اور حسین پہاڑی پر واقع ہے۔ اس عمارت کی شان و شوکت زیبائش و آرائش اور اس کا ٹھاٹ باٹ بالکل نیویارک میں مجلس اقوام متحدہ کی عمارت جیسے ہیں۔ نچلی منزل (GROUND FLOOR) میں ایک طرف نہایت عظیم الشان اسمبلی ہال ہے۔ جس میں کم و بیش ایک ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کا انتظام ہے۔ ہر سیٹ کے سامنے ایک ڈسک ہے جس پر ایرفون رکھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی ڈبیا ہے جس میں نمبر ہیں۔ جاپانی یا انگریزی ان میں سے جس زبان میں آپ تقریر سننا چاہیں ڈبیا کی سوئی کو اس کے متعلقہ نمبر پر لگا کر ایرفون کان سے لگا لیجئے۔ پوری تقریر آپ اسی زبان میں سن لیں گے۔ اسمبلی ہال کے علاوہ اس منزل میں اور دوسری منزلوں میں بڑی کثیر تعداد میں اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ و پیراستہ کمرے ہیں۔ صحن، لانج اور گیلریاں ہیں۔ عمارت سے ملحق ایک بہت وسیع باغ ہے جاپانیوں کو باغ کی ترتیب اور چمن بندی کا ایک خاص ذوق ہوتا ہے یہ باغ ان کے اسی ذوق کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ عمارت کے مختلف کمروں میں سکریٹریٹ پوسٹ آفس۔ سفری ایجنٹ کا

دفتر کیفے۔ مصنوعات جاپان کی دکان۔ غرض کہ سب ہی کچھ ہے۔ کانفرنس کا افتتاح اور اس کے جلسے سب اسمبلی ہال میں اور سب کمیٹیوں کے جلسے الگ الگ پہلی یا دوسری منزل کے کمروں میں ہوتے تھے۔

شرکائے کانفرنس | کانفرنس کے افتتاحیہ اور اختتامیہ جلسہ میں تو پورا اسمبلی ہال بھرا ہوا تھا کیوں کہ بعض مذہبی اور تعلیمی اداروں کے طلبا اور اساتذہ کو بھی ان میں شرکت کی اجازت یا دعوت دے دی گئی تھی۔ ان کو مستثنیٰ کرکے کانفرنس میں جو لوگ کمل مندوب تھے ان کی تعداد دو سو دس (۲۱۰) تھی۔ یہ اڑتالیس ملکوں اور دنیا کے دس بڑے مذاہب کے نمائندے تھے۔ تفصیل یہ ہے (۱) مندوبین کی تقسیم بربنائے مذہب: عیسائی: ۴۹۔ بدھسٹ: ۳۵۔ ہندو: ۱۹۔ مسلمان: ۱۸۔ شنتوئسٹ: ۱۷۔ یہودی: ۷۔ سکھ: ۳۔ جین: ۳۔ زردشتی یعنی پارسی: ۲۔ کنفوشین ۱۔ ان کے علاوہ گیارہ اور مختلف مذاہب کے لوگ تھے۔ (۲) مندوبین کی تقسیم بربنائے ملک: سب سے بڑا ڈیلی گیشن جاپان کا تھا جو باون (۵۲) افراد پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد دوسرا نمبر ہندوستان کا تھا جس کے ڈیلی گیشن میں پینتیس (۳۵) آدمی شامل تھے۔ ان کے علاوہ اور جن ملکوں کے ڈیلی گیشن بڑے تھے وہ یہ تھیں: امریکہ: ۲۰۔ روس: ۱۲۔ سنگاپور: ۸۔ پاکستان: ۷۔ انڈونیشیا: ۶

یہ تعداد تو خاص مندوبین کی تھی۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگ، جو مشاہدین یا کسی مندوب کی بیوی یا سکریٹری کی حیثیت سے شریک ہوئے ان کی تعداد اٹھانوے (۹۸) تھی۔ اس طرح کل تعداد تین سو آٹھ (۳۰۸) ہو جاتی ہے۔ اب اگر ان لوگوں کو بھی شامل کر لیا جائے جو پریس کے نمائندہ یا کانفرنس کے سکریٹریٹ کے عہدہ دار اور ملازمین تھے۔ اور جن کی تعداد سات سو انیس (۷۱۹) تھی تو اسکے معنی یہ ہیں کہ اسمبلی ہال میں ایک ہزار سے زیادہ لوگ موجود رہے۔

ہر مذہب کا طریق عبادت | پروگرام کے مطابق کانفرنس کا ہر اجلاس باری باری ہر مذہب کے طریق عبادت سے شروع ہوتا تھا۔ چنانچہ کانفرنس کا افتتاح بودھ مذہب کی عبادت سے ہوا اس کے بعد سہ پہر میں اجلاس کا آغاز اسلامی عبادت (PRAYER) سے ہونا تھا اس

سلسلہ میں پاکستانی وفد کے ممبر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین (برادر خورد ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم) جو کانفرنس کی تیاری کمیٹی کے ممبر بھی ہیں۔ ان دونوں نے قرآن مجید کی کچھ آیات، کچھ احادیث اور کچھ دعاؤں کا انتخاب اور انگریزی میں ان کا ترجمہ کر رکھا تھا شب میں میری ان حضرات سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اس پر نظرثانی کی فرمائش کی۔ انتخاب میں تو ظاہر ہے کیا مجال گفتگو ہو سکتی تھی۔ انگریزی ترجمہ میں البتہ کچھ ادل بدل کرنا پڑا۔ اس کے بعد ان حضرات کی خواہش ہوئی کہ میں خود ہی اس کو پڑھوں اور ترجمہ سنا دوں۔ میں اس پر رضامند ہو گیا تھا لیکن صبح کے وقت تاشقند کے میرزا عبداللہ میرزاکلان اور ان کے ایک اور نوجوان رفیق جو حافظ اور قاری تھے ان[1] سے ملاقات ہوئی تو میں نے قاری صاحب سے فرمائش کی کہ میری بجائے وہ تلاوت کریں۔ وہ بڑی خوشی سے رضامند ہو گئے۔ انگریزی ترجمہ سائیکلو اسٹائل کر کے پہلے سے تقسیم کر ہی دیا گیا تھا۔ روسی نوجوان قاری نے عربی جبہ قبہ اور دستار کے ساتھ خالص مصری لہجہ میں اس خوش الحانی سے تلاوت کی کہ پورے مجمع پر سکر کی کیفیت چھا گئی۔ مسلمانوں کا کیا ذکر! بعض عربی داں غیر مسلم جو میرے پاس بیٹھے تھے میں نے دیکھا کہ وہ بھی رومال سے آنکھیں صاف کر رہے تھے۔

کانفرنس کا افتتاح جیسا کہ ابھی عرض کیا۔ کانفرنس کا افتتاح (۱۶ر اکتوبر ۹ بجے صبح) بودھ مذہب کی عبادت سے اس طرح ہوا کہ چار بودھ پیشواؤں نے جو ایک خاص لباس میں ملبوس تھے ترنم کے ساتھ دعائیں پڑھیں۔ ساتھ ہی وقفہ وقفہ سے تالیاں بجاتے جاتے تھے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک ٹولی جو خانقاہی موسیقی کی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔

---

[1] یہ دونوں حضرات مفتی ضیاء الدین بابا خان (تاشقند) کے قریبی عزیز ہیں۔ اور ان سے میری دیرینہ ملاقات اور جان پہچان ہے۔ اسی کانفرنس میں روس سے جو وفد آیا تھا یہ دونوں اور ایک اور مسلمان اس کے ساتھ آئے تھے۔

اسٹیج کے ایک کنارہ پر بیٹھی ساز پران لوگوں کا ساتھ دے رہی تھی۔

عبادت کے بعد مسٹر کوشوا ہٹانی نے جو جاپان کے بودھ فیڈریشن کے صدر اور کانفرنس کے شریک صدر ہیں میزبان کی حیثیت سے خطبۂ افتتاحیہ میں مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور کوٹو کی نسبت پروفیسر ٹوئن بی (عہد حاضر کے نہایت عظیم مورخ) کی ایک تحریر کا یہ فقرہ نقل کیا کہ وہ دنیا کا ایک حسین ترین شہر ہے۔ کانفرنس کے انعقاد کے لئے جاپان کی دعوت کے سلسلہ میں موصوف نے کہا:

"جاپان میں اس کانفرنس کے انعقاد کی وجہ دو ہیں۔ ایک یہ کہ جاپان ہی ایسا ملک ہے جس پر ایٹم بم سے حملہ کیا گیا ہے۔ اور دوسری یہ کہ ۱۹۴۷ء سے جاپانی قوم جس ملکی دستور پر عمل کر رہی وہ درحقیقت دستور امن ہے۔ کیوں کہ اس میں کسی بھی قوم کے ساتھ جارحانہ جنگ نہ کرنے کا اعلان کر دیا گیا ہے۔"

کانفرنس کے انعقاد کی غرض و غایت سے متعلق انھوں نے جو کچھ کہا وہ آج کروروں انسانوں کے دل کی آواز ہے۔ انھوں نے کہا

"ایٹمی اسلحہ صرف مادی تہذیب اور ہماری روحانی ثقافت جو ہمارا ورثہ رہی ہے انہیں دونوں کے لیے خطرہ نہیں ہیں۔ بلکہ خود انسان کے نفس وجود کے لئے خطرہ ہیں۔ یہ سائنس کی غیر معمولی ترقی جو ہمارے خلائی عہد کی ایک خاص نشانی ہے اور اس کی ایجادات واختراعات بے شبہ نشاط انگیز ہیں لیکن یہ ایک ناگزیر حقیقت ہے کہ سائنٹفک تہذیب نے ہی نہایت خوفناک اسلحہ کی تیاری اور جنگ بندی میں مسابقت کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ سائنس نے جس تہذیب کو جنم دیا ہے اس کو ہم "گمشدہ انسانیت کی تہذیب" ہی کہہ سکتے ہیں۔ سائنس نے بے شبہ ان تمام چھوٹی بڑی چیزوں کا علم حاصل کر لیا ہے جو اس کے دائرۂ اختیار و اقتدار میں ہیں لیکن اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ "انسان کو کیوں کر رہنا چاہیے؟" اور "انسان کس طرح حقیقی امن اور مسرت حاصل کر سکتا ہے؟" جیسے سوالات کا جواب دے سکے۔ سائنس سے قیام امن میں مدد مل سکتی

تھی لیکن بدقسمتی سے وہ جتنی ترقی کرتی جا رہی ہے اسی طرح امن سوز طاقتیں مضبوط ہوتی جا رہی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ سائنٹفک تہذیب اسی وقت امن قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے جبکہ انسان کے دل میں تبدیلی پیدا ہو۔ اور دل کی تبدیلی کا یہ کام صرف مذہب ہی کر سکتا ہے۔ جیسا کہ پروفیسر ٹوئن بی نے کانفرنس کے نام اپنے پیغام میں کہا ہے۔ "جنگ اور امن ان دونوں کا اصل مقام قلب انسانی ہے۔ جب تک انسان ضبط نفس اور تزکیۂ نفس کے ذریعہ اپنے باطن کی اصلاح نہیں کرے گا جنگ کے دواعی اور اس کے اسباب قایم رہیں گے اور امن کا حصول ایک خواب پریشاں رہے گا۔ اس بنا پر سب سے مقدم اور ضروری اصلاح باطن ہے۔"

اس کے بعد ریورنڈ نکو نوانا صدر جاپان ریلیجس لیگ اور ڈاکٹر ڈانا میکلین گریلے نے کانفرنس کی تیاری کمیٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے جو تقریریں کیں ان میں قیام امن کی خاطر مذاہب عالم کی ہم آہنگی اور ان کے باہمی تعاون و اشتراک پر زور دیا گیا تھا۔ کیوں کہ صرف یہی ایک ذریعہ ہے جو انسان کو بالکل نیست نابود ہو جانے کے خطرہ سے بچا سکتا ہے۔ انھوں نے مختلف مذاہب کے ذمہ دار نمائندوں سے جو یہاں موجود تھے دردمندانہ اپیل کی کہ وہ وقت کی اس اہم ضرورت اور اس کے تقاضے کو محسوس کریں، اور اس فرصتِ اجتماع سے فائدہ اٹھا کر ایک ایسی راہ پیدا کریں کہ مذہب پہلے سے زیادہ موثر، فعال اور محرک بھی ہو۔ اور سب مذاہب میں باہم تال میل اور ربط بھی ہو۔ اس سلسلہ میں ریورنڈ نکو نوانا نے ایک دلچسپ بات یہ کہی کہ "EXPO 70 کے ختم کے دن ایک غیر ملکی مندوب نے تقریر کرتے ہوئے کیا خوب کہا تھا، اگر مجھ کو مجبور کیا جائے کہ میں "ترقی" اور "انسانی ہم آہنگی" ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر لوں تو میں انسانی ہم آہنگی بغیر ترقی کو ترقی بغیر ہم آہنگی پر ترجیح دوں گا۔"

آرک بشپ ایگو فرنانڈس کا خطبہ استقبالیہ تقریریں ختم ہو گئیں تو صدر جلسہ آرک بشپ

ایگنو فرنانڈس (دہلی) نے خطبۂ صدارت پڑھا۔ یہ خطبہ مذہب اور امن کے موضوع پر ایک مبسوط، پر مغز اور بڑا فاضلانہ مقالہ تھا۔ اس بنا پر ہم ذیل میں اس کے جستہ جستہ اقتباسات نقل کرتے ہیں:

موصوف نے شروع میں مجلس اقوام متحدہ کی تعریف کی کہ اس کی وجہ سے گذشتہ ربع صدی میں دنیا کی قوموں اور ملکوں میں تال میل بڑھا اور اقتصادی سیاسی اور سماجی اور ثقافتی معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک اور تعاون کی بڑی اچھی فضا پیدا ہوئی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ تیسری عالمگیر جنگ کو روکنے میں بھی اس نے کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا: "بہر حال ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اس مجلس نے جو وعدے کیے تھے وہ پورے نہیں ہو سکے ہیں۔ بھوک۔ غریبی بے روزگاری۔ بیماری۔ جہالت۔ حرص و استحصال بالجبر کی لعنت خوفناک حد تک ہم پر مسلط ہے۔ افراد و اشخاص اور اقوام و ممالک میں باہمی عداوت و نفرت۔ رقیبانہ کشمکش اور انسانی حقوق میں ناانصافی اور نابرابری، ظلم و عدوان۔ اور جبر و ستم۔ یہ سب چیزیں روز افزوں ہیں ابھی اساکا میں EXPO, 70 کا اختتام ہوا ہے۔ دنیا کی سب حکومتوں نے کہا کہ اس کا خاص مقصد "ترقی اور انسانی ہم آہنگی" ہے لیکن ان کی بڑی بھول یہ ہے کہ انھوں نے ترقی کا دامن صرف صنعت و حرفت اور ٹکنالوجی کی ترقی سے وابستہ کر رکھا ہے۔ چنانچہ سب لوگ امن اور ہم آہنگی کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ اور حال یہ ہے ترقی یافتہ یا ترقی پذیر سب ممالک اپنے بجٹ کا تقریباً نصف حصہ جنگ کی تیاری اور اس کے لئے نہایت خطرناک اسلحہ کی فراہمی میں خرچ کر رہے ہیں۔ ٹکنالوجی اچھی چیز ہے لیکن انسانوں کو راست باز بنانا اس کے بس میں نہیں ہے۔ یہ کام صرف مذہب ہی کر سکتا ہے جو انسان کو اعلیٰ اقدار حیات سے وابستہ کر کے زندگی میں ترفع پیدا کر دیتا ہے۔ اس بنا پر انسان کے مستقبل کے لیے خوش آیند توقعات اسی وقت قائم کی جا سکتی ہیں جب کہ سائنس اور مذہب دونوں

قدم سے قدم ملا کر چلیں۔

مذہب اور زندگی کے ربط باہمی کے متعلق انھوں نے کہا:

"مذہب اور زندگی دونوں بنیادی طاقتیں ہیں۔ ان کا دائرۂ اختیار و عمل انسان کے ہر شعبۂ حیات اور اس کے اداروں تک وسیع ہے اس بنا پر ان میں کشمکش لازمی ہے۔ دونوں کا تعلق انسانی فطرت سے ہے لیکن درحقیقت دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ کیوں کہ سچا مذہب زندگی ہے اور یہی زندگی ہی مذہب ہے۔ مذہب اور زندگی کا اتحاد سہل الحصول امر نہیں ہے۔ اس کے لئے بہت عظیم اور مسلسل جدوجہد کرنی ہوگی۔ ہمیں ایسے حالات پیدا کرنے چاہئیں جو انسان کی تمام سرگرمیوں میں مذہب کو اپنا کام کرنے کا موقع بہم پہنچائیں۔

اس سلسلہ میں اہل مذاہب کو کیا کرنا چاہئے؟ آرک بشپ نے مذہب کی زبان میں بولتے ہوئے کہا: دنیا کے موجودہ حالات مذہب کے لئے بہت بڑا چیلنج ہیں۔ ہمیں اس کا جواب دینا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے مقدم اور ضروری یہ ہے کہ ہم سب اہل مذاہب اپنی گذشتہ اور موجودہ کوتاہیوں اور بدعملیوں کے لئے خدا کے حضور میں توبہ و استغفار کریں۔ کیونکہ ہم نے دنیا کو اہل دنیا کے حوالہ کر کے ان کو اس کی اجازت دے دی ہے کہ وہ سیاہ سپید جو چاہیں کریں اور ہم زندگی سے بے تعلق ہو کر صرف ان چند چیزوں پر قناعت کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ جو مذہب کے روایاتی رسوم ہیں۔ حالانکہ مذہب کی تعلیمات کے مطابق یہ دنیا ہمارے ہاتھ میں خدا کی ایک امانت تھی اور اس کو شر و فساد سے محفوظ رکھنا اور اس کی اصلاح کرتے رہنا ہمارا فرض تھا۔ ہم نے زبان سے ہمیشہ عدل و انصاف۔ انسانی اخوت و محبت۔ مساوات حقوق اور آزادی و رواداری کا پرچار کیا ہے۔ لیکن بالواسطہ یا بلاواسطہ استعماری اور جارحانہ طاقتوں کا ساتھ دے کر عملاً ان دعاوی کی تکذیب کی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا۔ اس موقع پر جس چیز کا میں آپ سے مطالبہ کرتا

ہوں وہ یہ ہے کہ بے خوفی کی اسپرٹ پیدا کیجئے۔ یعنی قومیت، وطنیت اور رنگ ونسل ان سب چیزوں اور بندھنوں سے آزاد ہو کر وہ کہیئے اور کیجیے جس کا مطالبہ مذہب کرتا ہے۔ اگر آپکی اس حق گوئی سے آپ کی حکومت یا آپ کی قوم ناراض ہوتی ہے تو ہو آپ کو اس کی پرواہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ آسان کام نہیں ہے لیکن اس کے بغیر انسانی ضمیر بیدار بھی نہیں ہو سکتا اور جب تک ضمیر بیدار نہیں ہوگا امن کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔"

کانفرنس کی سبجکٹ کمیٹیوں میں جن موضوعات پر بحث ہونی تھی ان کا ذکر کرتے ہوئے موصوف نے اپیل کہ ان تمام مباحث اور گفتگوؤں میں آپ حضرات کو انسان پوری انسانی برادری اور انصاف اور محبت کے پس منظر میں حصول امن کی کوششوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ اور عملی طور پر ان تینوں کی تشریح و توضیح اور ان کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ کانفرنس کے دو کام ہونے چاہیے۔ ایک یہ ہم اس پر غور کریں کہ ہم کس طرح دنیا کی رائے عامہ کو اخلاقی اور روحانی اقدار کی بنیاد پر منظم کر سکتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ہم دنیا کی تمام ذمہ دار حکومتوں کو ہر ممکن طریقہ سے اس بات پر آمادہ کریں کہ ضمیر اور مذہب کی آزادی کو بغیر کسی امتیاز کے تسلیم کریں۔ جہاں تک انسانی حقوق کا تعلق ہے مجلس اقوام متحدہ کے چارٹر میں ان کی پوری وضاحت کر دی گئی ہے۔ اور اب یہ تجویز مجلس کے زیر غور ہے کہ ان حقوق کی نگرانی اور حفاظت کی غرض سے ایک ہائی کمشنر برائے حقوق انسانی کا عہدہ قائم کیا جائے۔ ہمیں اس کانفرنس میں بہر حال تمام حکومتوں سے پر زور درخواست کرنی چاہیے کہ وہ اس چارٹر کی پوری پابندی کریں اور کسی کی حق تلفی نہ ہونے دیں۔

سر ظفر اللہ خاں کا مقالہ | اس کے بعد ہیگ (ہالینڈ) کی بین الاقوامی عدالت کے صدر سر ظفر اللہ خاں نے اپنا مقالہ "امن کے بنیادی اصول" کے زیر عنوان پڑھا۔ یہ مقالہ کافی مبسوط اور بصیرت افروز تھا۔ انھوں نے کہا کہ میرا فکر جو کچھ بھی ہے اسلامی مآخذ پر مبنی ہے۔ اور اگرچہ حدیث بھی بہت اہم اور ناگزیر مآخذ اسلام ہے لیکن وہ جو کچھ بھی ہے۔

قرآن کی ہی تشریح وتبیین ہے اور قرآن میں بنیادی اور اہم اصول سب بیان کر دیئے گئے ہیں اس بنا پر میرا مقالہ پورا کا پورا قرآن پر مبنی ہے اور میں نے اسی کے حوالے دیئے ہیں۔ اس تمہید کے بعد پہلے انھوں نے اسلام کی تعریف کی اور پھر کہا: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ "امن" اپنے اصل معنی اور ماہیت کے اعتبار سے صرف جسمانی تحفظ اور فقدان جنگ کا نام نہیں ہے اگرچہ بلاشبہ یہ بھی بہت ضروری اور اہم ہے۔ لیکن یہ امن کا محدود اور یک طرفہ مفہوم ہے در اصل امن کے معنی ہیں ایک فرد کا ایک طرف اپنے خالق کے ساتھ اور دوسری جانب اپنے ابنائے جنس کے ساتھ ایسا تعلق اور ربط جو منفعت بخش اور موجب فلاح ہو۔ اس دائرے میں وہ تمام تعلقات آجاتے ہیں جو ایک فرد کے فرد کے ساتھ یا قوم کے ساتھ یا ایک قوم کے دوسری قوم کے ساتھ ہوں۔ پھر امن کسی خاص قسم کا نہیں بلکہ جسمانی۔ ذہنی۔ اخلاقی اور روحانی غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ اور مذہب کا کام انسان کے لئے اسی وسیع مفہوم میں امن کا بہم پہنچانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کانفرنس کو مذہب اور امن کی عالمی کانفرنس کہا گیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن مجید کی آیات پر آیات نقل کر کے بتایا کہ تزکیۂ نفس۔ ضبطِ نفس۔ فضائل ورذائلِ اخلاق۔ وحدتِ انسانیت۔ وحدتِ دین اور رنگ ونسل کے امتیازات۔ فساد فی الارض۔ اصلاحِ ذات البین اور حسنِ معاشرت وغیرہ کے متعلق اسلام کی تعلیمات کیا ہیں؟ اور وہ کس طرح ایک انسان میں انابت الی اللہ پیدا کر کے اس کو دنیا کا بہترین شہری اور اعلیٰ انسان بنا دیتا ہے۔ آخر میں انھوں نے کہا: الغرض امن اور سلامتی کی ضمانت ہے۔ ایمان برب العالمین ہے۔ اور اپنے مقالہ کو اس آیت پر ختم کیا:-

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا	(لوگو) تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلو
واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم	اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو اور اللہ کی اس نعمت کو
اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم	یاد کرو کہ جب تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے

بنعمتہٖ اخوانا وکنتم علیٰ شفا حفرۃ من النار فانقذکم منہا۔ کذٰلک یبین اللہ لکم آیٰتہٖ لعلکم تھتدون ٥ (آل عمران)

تو اس لئے تمہارے دل جوڑ دیئے اور تم اس کے کرم سے بھائی بھائی ہو گئے۔ اور تم دوزخ کے کنارہ پر تھے اللہ نے تم کو اس سے نجات دی۔ اللہ اسی طرح اپنی آیات تمہارے لئے بیان کرتا ہے تاکہ تم راہِ راست پر قائم رہو۔

مقالہ سب نے بڑی توجہ غور اور دلچسپی سے سنا اور جب ختم ہوا تو حاضرین کی چیرز سے ہال گونج اٹھا۔

دس ہزار ڈالر فی گھنٹہ سہ پہر کے اجلاس میں کانفرنس کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر ہوم جیک نے اپنی رپورٹ پڑھی جس میں انھوں نے کانفرنس کے اغراض و مقاصد اس کے پروگرام اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالنے کے بعد بتایا کہ اخراجات کی کیا نوعیت رہی ہر اس سلسلہ میں آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ دربیان میں ایک دن سیر و سیاحت کا تھا اس لیے کانفرنس پانچ دن رہی ہے۔ ڈاکٹر جیک نے اندازہ کر کے بتایا کہ ...... کانفرنس پر (جب تک کہ آپ کانفرنس ہال میں ہوں) دس ہزار ڈالر فی گھنٹہ کے حساب سے خرچ ہو رہا ہے۔ یہ رپورٹ آدھے گھنٹہ کی تھی اس لئے انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس حساب سے میری تقریر کی لاگت پانچ ہزار ڈالر ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بڑی خوشی کی ہے کہ ان تمام ہوش ربا مصارف کا تکفل نجی طور پر افراد و اشخاص اور مذہبی اداروں نے کیا ہے۔ کسی ملک کی حکومت، یہانتک کہ حکومتِ جاپان سے بھی کسی قسم کی مدد نہیں لی گئی۔

ہر مذہب کے لوگوں کا گروپ وار اجتماع چائے وقفہ کے بعد ۵ بجے ہر مذہب کے لوگوں کا مختلف کمروں میں الگ الگ اجتماع ہوا تاکہ وہ اپنے مذہب کی روشنی میں اس بات کا جائزہ لیں کہ کانفرنس میں جو امور زیرِ بحث آرہے ہیں اور جو اس کا سیاسی مقصد ہے اس میں اس مذہب کا کیا رول ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کے اجتماع کی صدارت کے لئے پروگرام میں

قاہرہ کے ڈاکٹر موسیٰ اسحاق الحسینی کا نام تھا لیکن صدر ناصر کے انتقال کی وجہ سے وہ نہیں آسکے تھے۔ اس لئے ہم لوگوں کی رائے سے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے صدارت کی۔ اس اجتماع میں میں نے بھی تقریر کی۔ یہ نشست دو گھنٹہ کی تھی۔

ایک مشہور سائنس داں کا مقالہ اوپر آپ نے مذہب (عیسائیت اور اسلام) کے دو نمائندوں کی تقریریں پڑھی ہیں۔ اب ڈاکٹر ہائیڈیکی یوکاوا کا مقالہ سنیے۔ یہ بین الاقوامی شہرت کے جاپانی سائنس داں ہیں۔ طبعیات (فزکس) میں تحقیقی کارناموں کی وجہ سے سنہ ۱۹۵۰ء کا نوبل پرائز انہیں کو ملا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں لارڈ برٹرنڈرسل اور ڈاکٹر البرٹ آئنسٹن نے نیوکلر جنگ کے خلاف جو اعلان مشاہیر عالم کے دستخطوں سے شائع کیا تھا۔ اس پر ڈاکٹر یوکاوا کے دستخط بھی تھے۔ ڈاکٹر ہومرجیک کی رپورٹ کے بعد ان کا مقالہ ہوا جس کا عنوان "بے ہتھیاروں کے ایک عالم کی تخلیق" تھا۔ انھوں نے کہا کہ نسل انسانی کی بقا کے لئے سب سے بڑا خطرہ نیوکلر ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی اور اس میں مسابقت ہے۔ پہلے اس میدان میں امریکہ اور روس ہی ایک دوسرے کے حریف تھے۔ لیکن اب فرانس اور چین بھی اس اکھاڑہ میں اتر آئے ہیں۔

انھوں نے مزید کہا: یہ ہتھیار کس درجہ مہلک اور تباہ کن ہیں؟ اس کا اندازہ اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ اب سے چند سال پہلے ہی امریکہ اور روس نے ان ہتھیاروں کا جو ذخیرہ جمع کر لیا تھا وہ ہماری موجودہ دنیا کو دس مرتبہ صفحۂ ہستی سے بے نام و نشان کر دینے کے لئے کافی ہے۔ پہلے "نسل انسانی کی مکمل تباہی" جیسے الفاظ اگر کوئی کہتا تھا تو اسے مبالغہ کہا جاتا تھا لیکن اب یہ مبالغہ نہیں بلکہ قرینۂ غالب بن گیا ہے۔ ایک طبقہ کا خیال ہے کہ اسلحہ بندی جس سے طاقت میں توازن برقرار ہے۔ جنگ کو روکنے کا کامیاب ذریعہ ہے۔ لیکن یہ خیال سر تا سر وہم اور غلط ہے کیوں کہ "حملہ میں پہل سب سے بہتر دفاع ہے" کا مقولہ آج بھی صادق آتا ہے۔ جو ملک بھی نیوکلر ہتھیاروں سے حملہ میں پہل کر بیٹھے گا وہ دشمن کو

تباہ کرکے دفاع کے قابل ہی نہیں رکھے گا۔ اس بنا پر جنگ سے تحفظ کی صورت بجز تخفیف اسلحہ کے کچھ اور نہیں ہے۔ جاپان نے اس حقیقت کو بہت پہلے ہی محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں جاپان کا جو دستور بنا تھا اس کی دفعہ ۹ میں جنگ سے الگ رہنے کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ جاپان کے اس جرأت مندانہ اقدام کے تیرہ برس بعد ۱۹۵۹ء میں مجلس اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے وہ ریزولیوشن منظور کیا جسے مکمل تخفیف اسلحہ پر ہیاسٹی اقوام کا رزولیوشن، کہا جاتا ہے اور جو متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا تھا۔ اس کے دو برس بعد ۱۹۶۱ء میں جنرل اسمبلی میں ایک رپورٹ پیش ہوئی جس میں تخفیف اسلحہ سے متعلق امریکہ اور روس کے باہمی سمجھوتہ اور اس کے اعلان کا ذکر کیا گیا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں ان دونوں ملکوں نے آپس میں جزوی طور پر نیوکلر ہتھیاروں کے ٹسٹ کو روک دینے کے معاہدہ پر بھی دستخط کئے۔ مجلس اقوام متحدہ کے مذکورہ بالا رزولیوشن - اعلان اور پھر امریکہ اور روس کے معاہدہ پر دنیا کی سب قوموں نے جس مسرت اور خوشی کا اظہار کیا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی رائے عامہ جنگ کے فلسفہ کے خلاف ہے۔

موصوف نے سائنس اور ٹکنالوجی کے بارہ میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ بھی سننے کے لائق ہیں۔ انھوں نے کہا: سترہویں صدی میں جب سے مغربی یورپ میں جدید سائنس کا آغاز اور اس کا نشوونما ہوا ہے لوگ اپنی مادی زندگی کو ترقی دینے کی طرف زیادہ مائل ہو گئے اور ان کی کوششیں زیادہ تر اس ایک مقصد کے حاصل کرنے پر مرکوز ہو گئی ہیں۔ یہ بجائے خود ایک اچھی بات ہے اور زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ہم کو سائنس اور ٹکنالوجی سے برابر زیادہ سے زیادہ کام لیتے رہنا چاہیے کیونکہ ہم ابھی تک صفحۂ ارض سے غریبی اور فاقہ کشی کو نیست و نابود کر دینے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں لیکن ہم کو اس حقیقت کا بھی اعتراف کر لینا چاہیے کہ نیوکلر ہتھیار اور دوسرے قسم کے سخت مہلک اسلحہ بھی سائنس اور ٹکنالوجی کی ہی دین ہیں اور صرف یہ اسلحہ نہیں بلکہ فضا کا تعفن اور گندگی POLLUTION جو ٹکنالوجی میں ترقی یافتہ ملکوں میں پائی جاتی ہے یہ خود ایک بہت بڑی مصیبت بن گئی ہے۔ آخر میں موصوف نے عالمگیر امن کے قیام کے لئے عالمی وفاق اور بین الاقوامی قانون کی سفارش کی۔

(باقی)

تبصرے

چندر بھان برہمن اور اس کا دیوان از ڈاکٹر محمد عبدالحمید فاروقی صدر شعبہ فارسی و اردو گجرات کالج۔ احمد آباد تقطیع خورد ضخامت ۳۲۵ صفحات ٹائپ روشن قیمت ۶/۵۰۔
پتہ: خالد شاہین فاروقی۔ نندگا گیکواڑ حویلی۔ رائے کھڈ احمد آباد۔

چندر بھان برہمن عہد شاہجہانی کا مشہور شاعر ہے۔ اگرچہ تذکرہ نویسوں نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ استاد فن تھا۔ نثر و نظم دونوں پر اس کو بڑی قدرت حاصل تھی اور اس کی شاعرانہ خصوصیات اس دور کے شعراء میں اس کو ایک ممتاز مقام کا مستحق بنا دیتی ہیں۔ اس حق تلفی کی تلافی کرنے کی غرض سے ڈاکٹر فاروقی نے یہ قابلِ قدر کتاب ترتیب دی ہے جو شاعر کے حالات اور سوانح اور اس کے فارسی دیوان پر مشتمل ہے۔ یہ دیوان اگرچہ ۱۸۲۹ء میں شائع ہو چکا تھا لیکن اغلاط سے پر تھا۔ اب موصوف نے تین مخطوطہ نسخوں کی مدد سے اس کو بڑی کاوش اور محنت سے مرتب کیا ہے جو ۲۰۷ صفحات پر تمام ہوا ہے۔ سوانح و حالات کا حصہ جو انگریزی میں ہے ۱۲۸ صفحات میں آیا ہے۔ اس حصہ میں پہلے شاہ جہاں کے عہد کی سیاسی علمی اور ادبی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اور اس کے بعد برہمن کے آباو اجداد اس کی تعلیم و تربیت۔ مختلف امراء اور رؤوسا جن سے اس کے تعلقات تھے، اس کی شاعری کی خصوصیات۔ نثری اور شعری تصنیفات اخلاق و عادات، رجحانات و میلانات ان سب چیزوں کا تذکرہ مفصل اور شستہ زبان میں کیا گیا ہے۔ جو کچھ لکھا ہے بڑی تحقیق اور ژرف نگاہی سے لکھا ہے۔ اس بنا پر وہ جگہ جگہ ان بیانات کی مدلل تردید کرتے چلے گئے ہیں جو ان کے پیش رو حضرات نے برہمن کی زندگی یا اس کے کلام کے کسی پہلو

کے متعلق اپنی کتابوں یا مقالات میں کئے تھے۔ اسی بنا پر فارسی زبان وادب کے طلبا اور اساتذہ کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بصیرت افروز اور مفید ثابت ہوگا۔

النبی الامی۔ مرتبہ جناب مختار احمد صاحب سلفی تقطیع خورد ضخامت ۲۲۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت درج نہیں۔ پتہ: مکتبہ دینیہ۔ مومن پورہ بمبئی۔ ۱۱

ریاست قطر کے محکمہ شرعیہ کے قاضی شیخ احمد بن حجر نے عربی میں ایک کتاب ان حضرات کی تردید میں لکھی تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت کا انکار کرتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے پہلے سیرت نبوی مختصراً بیان کی ہے اور اس کے بعد لفظ "امی" کے معنی کی لغوی تحقیق کی ہے اور تفاسیر سے عبارتیں نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ پھر علمار اسلام میں جو حضرات اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ مصنف نے ان کے دلائل نقل کر کے ان کا رد کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اس کا اردو ترجمہ شستہ وشگفتہ زبان میں ہے لیکن اس بحث کے ذیل میں مصنف کو ان چیزوں پر غور کرنا چاہئے:۔

(۱) "امی" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ صفت ہے جو قرآن مجید میں بالتصریح موجود ہے اس لئے کوئی مسلمان اس کا منکر نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر مصنف کا کتاب کے نام میں "من نفی امیۃ سید...... " کہنا الزام مالا یلزم سے نہیں ہے البتہ اختلاف اس میں ہے۔ کہ امی کے معنی کیا ہیں؟،

(۲) ہمارے نزدیک "امی" کے معنی ہیں: وہ شخص جس کو دین اور یوم آخرت اور رسالت وغیرہ کا کوئی تخیل نہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور بعض اور حضرات سے یہی معنی منقول ہیں اور اس کا کوئی تعلق خواندگی یا ناخواندگی سے بالکل نہیں ہے۔ یعنی "امی" ایک خواندہ شخص بھی ہو سکتا ہے اور ایک ناخواندہ بھی۔

(۳) قرآن مجید میں "امی" صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی نہیں کہا گیا ہے۔ بلکہ جن لوگوں میں آپ پیدا ہوئے اور پلے بڑھے ان کو بھی "امیون" فرمایا گیا۔ اور ان امیوں کو

اہل کتاب کے ایک فریق مقابل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اور اہل کتاب اپنے علم اور اہل کتاب ہونے کے زعم میں امیوں کو ذرا نظر میں نہیں لاتے اور انہیں حقیر سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہ طور اپنی نشانی اور قدرت کے بیان فرمایا: ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً ..... الآیۃ۔

(۴) پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ اور دلیلِ نبوت یہ نہیں ہے کہ آپ نوشت وخواند سے آشنا نہیں تھے۔ کیوں کہ ایک شخص لکھنا پڑھنا نہ جانتے ہوئے بھی اپنے حافظہ اور ذہانت اور علماء وفضلا کی صحبت ومحبت کے باعث بہت بڑا عالم ہو سکتا ہے۔ بلکہ آپ کا معجزہ اور دلیلِ نبوت یہ ہے کہ آپ بجائے اہل کتاب کے ان لوگوں میں پیدا ہوئے جن کو دین کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ اور خود آپ بھی ایسے ہی تھے (چنانچہ غار حرا میں پہلی وحی کے نزول کے وقت جو آپ کو سخت اچنبھا اور صدمہ ہوا تھا اس کی وجہ بھی یہی ناواقفیت تھی) لیکن اللہ کی قدرت دیکھو! اس نے ان لوگوں میں ہی ایک ایسا شخص پیدا کر دیا جو دین کا مکمل ہوا۔

(۵) ان وجوہ کی بنا پر ہم کو ہرگز اس بات پر اصرار نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خواندہ تھے۔ جیسا کہ ہم نے اپنے مقالہ "الامیون" (چار علمی مقالات مطبوعہ مسلم یونیورسٹی) میں لکھا بھی ہے۔ البتہ اس پر اصرار ضرور ہے کہ "الامی" کے معنی ناخواندہ نہیں ہیں۔ اور قرآن مجید کے متعدد بیانات کو سامنے رکھ کر جب ان پر اک ساتھ غور کیا جاتا ہے تو اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

<u>دورِ حاضر کے سیاسی اور اقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات</u> | از مولانا محمد میاں مدرسہ امینیہ دہلی۔ تقطیع کلاں۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت پانچ روپیہ۔ پتہ: کتابستان۔ گلی قاسم جان۔ دہلی ۶

اس کتاب میں مولانا نے دورِ حاضر کے مختلف مسائل بحث وگفتگو مثلاً جمہوریت۔ ملکیت سوشلزم سرمایہ داری اور قیامت کے دن اعضا کی شہادت وغیرہ ان پر گفتگو کی ہے۔ ان میں سے اکثر مسائل

وہ ہیں جن پر انگریزی۔ عربی اور اردو میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور ان میں محققانہ کلام کیا گیا ہے۔ لیکن مولانا نے اس کتاب میں ان مسائل پر اپنے مخصوص انداز میں اسلامی تعلیمات کے ماتحت اظہار خیال کیا ہے۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں :۔ یہ منتشر مضامین جو آپ کے سامنے ہیں۔ انہیں (اسلامی) مشوروں کے ترجمان ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بات بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ جو کچھ ترجمانی ہوئی وہ حرف آخر نہیں ہے بلکہ نقش اول ہے۔ ہمیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ جہاں تک ترجمانی کا تعلق ہے وہ بالکل صحیح ہے اور اسلام کی تعلیمات یہی ہیں۔ پھر طرز بیان دل چسپ موثر اور دل نشین ہے۔ اس کا مطالعہ مفید اور بصیرت افروز ہوگا۔

تفسیر رشیدی از مولانا مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تقطیع خورد۔ ضخامت ۱۰۴ صفحات۔ کتابت وطباعت عمدہ۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ : مدنی دار التالیف۔ بجنور۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے عہد کے عظیم المرتبت عالم۔ فقیہہ اور عارف باللہ تھے آپ نے قرآن مجید کی بیس صورتوں کی مختلف آیات پر جو تفسیری کلام کیا تھا اس کا مجموعہ ۱۳۰۴ھ میں آپ کی حیات میں ہی شائع ہو گیا تھا۔ اب فاضل مرتب نے حضرت مرحوم کی تصنیفات وملفوظات سے اخذ و اقتباس کر کے اسی مجموعہ کو مزید اضافہ اور اہتمام کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ شروع میں حضرت شیخ کے مختصر حالات و سوانح اور ایک قصیدہ جو حضرت شیخ الہند نے مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی دونوں کی شان میں لکھا تھا مندرج ہیں۔ یہ تفسیر اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن مولانا نے مختصر مختصر طور پر آیات متعلقہ پر جو کلام کیا ہے وہ بڑا حکیمانہ اور فقیہانہ ہے۔ قرآن مجید کے طلبا کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

بُرہان

جلد ۶۶	ربیع الثانی ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۱ء	شمارہ ۶

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؒ

نظرات

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ سنی دینیات کے لکچرر ڈاکٹر حافظ قاری محمد رضوان اللہ اب سے چار برس پہلے حکومت ہند کے وظیفہ پر جامع ازہر سے پی۔ ایچ ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے قاہرہ گئے تھے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب وہ اپنے مقصد میں بہمہ وجوہ کامیاب ہوکر واپس آگئے اور شعبہ میں اپنی جگہ کا چارج لے لیا ہے۔ موصوف نے علی گڈھ سے ڈاکٹریٹ کی جو ڈگری لی تھی اس کا موضوع تھا "مولانا محمد انور شاہ کشمیری: حیات اور کارنامے" اسی مناسبت سے انھوں نے قاہرہ میں تحقیقی مقالہ کے لئے جو موضوع پسند کیا وہ تھا "دارالعلوم دیوبند اور اس کے اسلامی اثرات ہندوستان میں"۔ موصوف نے جامع ازہر کے پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم علی شعوط کی نگرانی اور رہنمائی میں یہ مقالہ جو تین سو صفحات پر مشتمل ہے کس محنت اور تحقیق سے مرتب کیا ہے اس کا اندازہ اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ مقالہ کے آخر میں انھوں نے مقالہ کے ماخذ اور مراجع کی جو طویل فہرست درج کی ہے وہ عربی۔ انگریزی اور اردو کی تین سو کتابوں اور مجلات ورسائل کے ناموں پر مشتمل ہے۔ مقالہ کے امتحان کے سلسلہ میں جب اس کا زبانی امتحان (جس کو وہاں کی اصطلاح میں مناقشہ کہتے ہیں) ہوا تو وہ ۲/۱ ۴ گھنٹہ جاری رہا اور اس میں کم وبیش ایک سو اساتذہ و عمائد جامعہ ازہر اور دوسرے ارباب علم وادب نے شرکت کی۔ مناقشہ میں مقالہ پر جو اعتراضات یا جو شکوک و شبہات ظاہر کئے گئے صاحب مقالہ یا ان کے نگران ڈاکٹر شعوط نے ان سب کے جوابات تسلی بخش دیئے

اور مقالہ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے تسلیم کر لیا گیا۔ فالحمدللہ علی ذالک "برہان موصوف کو اس کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

رویت ہلال کا مسئلہ آج کل کے ان مسائل و معاملات میں سے ہے جو مسلمان ارباب علم و فضل کے حلقہ میں بہت دنوں سے موضوع فکر و بحث بنے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف نے یہ ضروری خیال کیا کہ برہان میں دو قسم کے مقالات شائع کئے جائیں۔ ایک مقالہ ایسا ہو جس میں شرعی اور فقہی طور پر موضوع بحث کا نہایت بسط اور تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہو۔ اور دوسری قسم کے مقالہ میں خالص فنی اور ٹکنکل بحث ہو تاکہ مسئلہ کی دونوں حیثیتیں کھل کر سامنے آجائیں اور علمائے کرام ان کی روشنی میں کسی قطعی نتیجہ تک پہنچ سکیں۔ جہاں تک پہلی قسم کے مقالہ کا تعلق ہے تو ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میں خود لکھوں یا کسی سے لکھواؤں۔ اور کس سے لکھواؤں تو کس سے؟ کہ اتنے میں اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی کو! ان کا مبسوط و مفصل اور محققانہ مقالہ موصول ہو گیا اور وہ چند قسطوں میں شائع کر دیا گیا۔ یوں تو علماء جو قیل و قال کے عادی ہیں کسی مسئلہ میں بھی ان کی بحثیں قیامت تک ختم نہیں ہوں گی لیکن یہ واقعہ ہے کہ موضوع بحث پر شرعی اور فقہی گفتگو کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی نے سیر حاصل بحث نہ کی ہو اور تنقیح کر کے اس پر کلام نہ کیا ہو۔ اب رہا دوسرا مقالہ! تو میں نے اس کے لئے اپنے محترم دوست حاجی احسان الحق صاحب بجنوری کو اس طرف متوجہ کیا۔ جو لوگ حاجی صاحب سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ موصوف عجیب و غریب خصوصیات کے بزرگ ہیں۔ ایک تو ان کی فنی بصیرت اور مہارت کا یہ عالم ہے کہ علی گڈھ کے بہت پرانے ایم۔ ایس۔ سی۔ ہیں۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم کے تلمیذ خاص ہیں۔ اور سالہائے دراز تک اس یونیورسٹی میں طبیعیات کے نامور اور ہر دلعزیز استاد رہے ہیں اور اسی عہدہ سے کبرسنی کے باعث ریٹائرڈ ہو کر اب خانہ نشین ہیں دوسری جانب یہ شروع سے کٹر بلکہ نہایت عابد و زاہد اور متقی مسلمان کی زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ علوم دینیہ کے مطالعہ کا شوق طبعی اور فطری ہے ان کے خاندان کو اور خود

۱؎ اس شمارہ میں بھی موصوف کا ایک مختصر سا مضمون "شرعی احکام کے لئے توقیت کا معیار" شامل ہے

ان کو بھی دیوبند کے علما اور مشائخ سے ربط و تعلق خاص رہا ہے۔ اس بنا پر اس پیش نظر مقالہ کے لئے حاجی صاحب سے زیادہ مناسب اور موزوں کوئی دوسرا شخص ہو نہیں سکتا تھا۔ مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ اب سے ڈیڑھ دو برس پہلے جب میں نے حاجی صاحب سے یہ درخواست کی تو انھوں نے بڑی خوشی سے اسے منظور کر لیا اور یہ بھی کہا کہ وہ عرصہ سے اس مسئلہ پر غور و خوض کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں انھوں نے بہت کچھ مواد جمع کر لیا ہے۔ چنانچہ مولانا محمد برہان الدین صاحب سنبھلی کے مقالہ کے بعد حاجی صاحب کا مقالہ شائع ہوا اور علمی حلقوں میں بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس مضمون سے بعض غلط فہمیاں بھی پیدا ہو گئیں اور میرے نزدیک اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حاجی صاحب کی ساری عمر طبیعات اور ریاضیات کے درس و تدریس میں گذری ہے اور وہ میدان تحریر کے شہسوار کبھی نہیں رہے۔ جن لوگوں کو اس میدان کے پیچ و خم اور اس کے نشیب و فراز کا تجربہ ہوتا ہے وہ جانتے ہیں کہ اصل مغز سخن کیا ہے۔ اسے کس طرح اس انداز میں کہنا چاہیئے کہ اپنی بات پوری بھی ہو جائے اور کوئی اپنے آپ کو اس کا نشانہ بنتے ہوئے دیکھ کر مشتعل بھی نہ ہو چنانچہ حاجی صاحب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کا نام لئے اور ان سے اپنی ملاقات کا ذکر کیے بغیر بھی اپنی پوری بات کہہ سکتے تھے لیکن انھوں نے مولانا کے نام کی تصریح کے ساتھ ان سے اپنی ایک گفتگو کا ذکر بھی کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا موصوف کو اپنے متعلق غلط فہمی دور کرنے کی غرض سے ایک مراسلہ لکھنا پڑا جو اپریل کے برہان میں شائع ہو چکا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اگر یہ صحیح ہے کہ حاجی صاحب کو مولانا کی نسبت غلط فہمی ہوئی ہے تو یہ بھی درست ہے کہ مولانا بھی حاجی صاحب کے متعلق یک گونہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ حاجی صاحب کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ حجاز مقدس میں حج کی تاریخوں کا تعین رویت ہلال پر مبنی نہیں ہوتا ہے! بلکہ ہوتا ہے۔ البتہ حاجی صاحب کا خیال یہ ہے کہ رویت ہلال کا انتظام خاطر خواہ طور پر مربوط اور اصول فن کے مطابق نہیں ہے سخت تعب اور مشقت اٹھانے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ متعدد بار ایسا ہوا ہے کہ چاند علم ہیئت کی رو سے ابھی قمر جدید بنا بھی نہیں ہے یا بن گیا ہے لیکن ابھی اس پر بیس گھنٹے نہیں گذرے

ہیں جس کے بعد وہ قابل رویت ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود حجاز میں رویت کا اعلان ہوگیا ہے یہ بات بہت صاف اور سیدھی ہے اس کو ثابت کرنے کے لئے نہ مولانا نعمانی کے حوالہ کی ضرورت تھی اور نہ مولانا علی میاں یا کسی اور شخص کے تذکرہ کی۔ اسی طرح اس دعویٰ کی تردید کے لئے اِدھر اُدھر کی لایعنی بات کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ معترض کو صاف طور پر دعویٰ کے اول جز کی تردید کرنی چاہئے یا دوسرے جز کی اور تردید دلائل اور حقائق کے ساتھ ہونی چاہئے یعنی یا یہ ثابت کیجئے کہ (۱) اس تاریخ پر قمر جدید بن چکا اور اس پر بیس گھنٹے گذر چکے تھے۔ یا یہ کہ (۲) اس تاریخ کے مطابق حج ہی نہیں ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حج جس میں لاکھوں انسان شریک ہوتے ہیں اور جس کا ذکر تمام اخبارات میں اور ریڈیو پر بھی ہو جاتا ہے۔ اس کے ثبوت یا تردید کے لئے اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ فلاں نے یہ کہا تھا اور فلاں نے یہ فرمایا تھا۔ حاجی صاحب اور مولانا نعمانی دونوں نے علی میاں کا ذکر کیا ہے۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ حاجی صاحب نے یہ کیسے لکھ دیا کہ "علی میاں نے وہاں تذکرہ چھیڑا"، لیکن میں نے خود حاجی صاحب کے نام علی میاں کی طرف سے لکھے ہوئے دو خط دیکھے ہیں جن میں لکھا ہے کہ "حجاز میں جو کچھ ہوتا ہے حضرت مولانا (علی میاں) کو خود اس پر بڑی تشویش ہے وہ خود اس سلسلہ میں وہاں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اپنا مقالہ فوراً بھیج دیجئے اس سے گفتگو کرنے میں مدد ملے گی"۔ اس سے معلوم ہوا کہ مولانا علی میاں نے رابطہ میں یہ ذکر اٹھایا یا نہیں! بہرحال اس صورت حال پر تشویش مولانا کو بھی تھی اور وہ اس پر گفتگو کرنا چاہتے تھے۔

اب میں نفس مسئلہ پر بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی لکھتے ہیں:

"علمائے نجد جو سعودی حکومت میں امور مذہبی کے عموماً ذمہ دار ہیں اور ذمہ دارانہ مناصب پر فائز ہیں وہ حنبلی المذہب ہیں اور متاخرین میں خاص طور پر قاضی شوکانی کی تحقیقات پر ان کا اعتماد ہے اور جس طرح حنفیہ کا اصل مشہور

مذہب (جو فقہ حنفی کی تقریباً سب ہی کتابوں میں لکھا ہے) یہ ہے کہ رویت ہلال میں اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں (اور اس بنا پر دنیا کے کسی حصہ میں بھی رویت ثابت ہو جائے تو معلوم ہو جانے پر ساری دنیا میں اس کے مطابق عمل ہوگا اور ہر جگہ رویت تسلیم کی جائے گی) یہی مذہب حنابلہ کا بھی ہے۔ قاضی شوکانی نے نیل الاوطار میں اسی کو ترجیح دی ہے۔"

(برہان ص ۲۷۵)

گذارش یہ ہے کہ بے شک امام ابوحنیفہ کی رائے یہی ہے کہ اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں لیکن اس سے یہ مراد لینا کہ " دنیا کے کسی حصہ میں بھی رویت ثابت ہو جائے تو ساری دنیا میں اس کے مطابق عمل ہوگا اور ہر جگہ رویت تسلیم کی جائے گی۔ ایک ایسی ناقابل فہم اور لغو بات ہے جسے کم از کم موجودہ زمانہ کا کوئی بھی پڑھا لکھا آدمی تسلیم نہیں کر سکتا۔ پھر امامِ عالی مقام کا اس قول سے یہ مطلب کس طرح ہو سکتا ہے۔ اور ہمیں خوب اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمتہ اللہ علیہ بھی امام صاحب کا یہ مقولہ نقل کر کے یہی فرماتے تھے کہ لوگوں نے امام صاحب کا مطلب غلط سمجھا ہے۔ حسنِ اتفاق سے ابھی یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ برادر محترم مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اچانک علی گڈھ آپہنچے اور ان سے ذکر آیا تو انھوں نے بھی حضرت شاہ صاحب کی اس رائے کی تصدیق فرمائی۔ (مفصل بحث کے لئے ملاحظہ فرمائیے العرف الشذی علی جامع الترمذی ص ۳۰۲)

علاوہ ازیں فقہاء کے اقوال اور ان کے باہمی اختلافات تو ایک ایسا دلدل ہیں جن میں ایک مرتبہ پھنس جانے کے بعد صحیح سلامت نکل آنا امرِ دشوار ہے۔ اس بنا پر اصل میں دیکھنا یہ چاہئے کہ شریعت کا حقیقی منشا اور اس سلسلہ میں ارشادِ نبوی کیا ہے اور اس کی روح کیا ہے! اس نقطہ نظر سے جب ہم غور کرتے ہیں تو مندرجہ ذیل چند باتیں صاف نظر آتی ہیں:

(۱) اول یہ کہ روزہ اور اس کے افطار کا دار و مدار صرف رویت ہلال پر ہوگا شمسی حساب یا کسی اور حساب پر ہرگز نہیں ہوگا۔"

(۲) رویت دو قسم کی ہے (الف) حسی اور ظاہری اور (ب) معنوی اور معہود۔

(۳) ظاہری رویت تو کھلی ہوئی رویت ہے۔ اس کے متعلق کسی بحث و گفتگو کی ضرورت ہی نہیں۔ البتہ معنوی رویت کے معنی یہ ہیں کہ طول بلد اور عرض البلد کے حساب سے کسی ایک مقام پر چاند کے مرئی ہو جانے کے بعد کسی دوسرے مقام پر بھی خواہ ان میں مسافت اور بعد کتنا ہی ہو رویت ہونی چاہیئے۔ مگر کسی سبب سے نہیں ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے صوموا لرویتہ وافطروا لرویتہ۔ فان غم علیکم فاقدروا لہ۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے جو روایت مروی ہے اس میں بجائے "فاقدروا لہ" کے "فاکملوا العدۃ ثلاثین کے الفاظ ہیں۔ علماء نے ان دونوں میں تضاد سمجھا ہے اور اس لئے طرح طرح کی باتیں کہی ہیں۔ ہمارے نزدیک دونوں قول صحیح ہیں اور ان کا محل الگ الگ ہے۔ یعنی اگر فضا ابر آلود ہے اور کہیں سے رویت کی خبر نہیں آئی ہے تو تیس دن پورے کر لینے چاہئیں لیکن اگر کہیں سے خبر آ گئی ہے تو تم حساب لگا کر دیکھو کہ یہاں چاند ہو سکتا تھا یا نہیں! اگر حساب سے معلوم ہو کہ مقام رویت سے عرض البلد میں اشتراک یا قرب کے باعث یہاں بھی رویت متحقق ہو سکتی تھی تو بس اب صرف خبر کے متعلق تحقیق کر لو کہ وہ کیسی ہے؟ اگر عرف عام میں اس طرح کی خبر کو سچا سمجھا جاتا ہے تو زیادہ کنج وکاو کی ضرورت نہیں۔ اس خبر کی بنیاد پر تم بھی رویت تسلیم کر لو۔ اس بنا پر میرے نزدیک ٹیلی فون اور ریڈیو کی خبر کا اعتبار چند شرائط کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ بہرحال جس مقام پر رویت نہیں ہوئی ہے اس مقام پر از روے حساب چاند کا مرئی ہو سکنا ایک امر قطعی ہونا چاہیئے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ساری دنیا میں ایک ہی دن رمضان یا عید کرنے کا جذبہ شریعت میں ہرگز نا قابل عمل ہے اور نہ مستحسن! بلکہ ایک ایسی بدعت ہے جس سے اسلام بری ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مولانا نعمانی کے بقول حجاز میں علمائے نجد کا جو معمول ہے وہ سر تا سر غلط اور نامشروع ہے۔ علماء کا فرض ہے کہ وہ اس اہم مسئلہ کی طرف ان کو اور حکومت حجاز کو متوجہ کریں جن دو ملکوں میں غروب آفتاب کا فصل تین چار گھنٹہ ہو

ان میں ایک کی رویت دوسرے کے لئے کس طرح حجت بن سکتی ہے؟
سطور بالا میں ہم نے فاقدروا لہ کے معنی جو حساب کے لئے ہیں تو اس کے لئے
ملاحظہ فرمایئے (بدایۃ المجتہد ابن رشد ج ۱ ۔ ص ۲۹۲)

ایڈیٹر برہان کو آئندہ ماہ جولائی میں "اسلام اور عہدِ جدید" کے موضوع پر پانچ لکچر انگریزی زبان میں مدراس میں دینے ہیں۔ ان کے لکھنے میں مصروفیت کے باعث افسوس ہے کہ اس مرتبہ نہ "النبأ العظیم" کی بیسویں قسط لکھی جاسکی اور نہ سفرنامہ جاپان کی تیسری قسط۔ اللہ نے چاہا تو آئندہ ماہ سے ان دونوں کا سلسلہ پھر شروع ہوجائے گا۔

حسبنا اللہ ونعم الوکیل

کلوروفل اور قرآن

(۳)

جناب مولوی محمد شہاب الدین ندوی فرقانیہ اکیڈمی چک، باناور بنگلور نارتھ

کائنات کی منصوبہ بندی خلاصہ بحث یہ کہ اس وقت میرا موضوع بحث کلوروفل سے متعلق ایک اہم ترین قرآنی انکشاف اور چند ضمنی حقائق کا اظہار کرکے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ یہ کائنات بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک منظم پلان اور زبردست خدائی منصوبہ بندی کے تحت جاری و ساری ہے اور اس منصوبہ بندی کے جائزہ سے توحید، رسالت اور یوم جزاء کے حقائق پر بالکل نئے اور اچھوتے انداز سے روشنی پڑتی ہے۔ جن کے لحاظ سے بے بنیاد قسم کے مادہ پرستانہ نظریات اپنی موت آپ مرجاتے ہیں اور مزید لب کشائی کا موقع باقی نہیں رہتا۔ اس حیثیت سے بھی یہ کتاب عظیم ایک زبردست ہادی و رہنما ہے جو قیامت تک نوع انسانی کی ہر رنگ میں ہدایت و رہنمائی کرے اور اسکو جادۂ حق پر قائم رکھنے میں بڑا مثبت اور فعال رول ادا کرتی ہے۔

خلق اللّٰہ السمٰوٰت والارض بالحق ان فی ذٰلک لاٰیۃ للمؤمنین: اللّٰہ نے زمین و آسمان کو حقانیت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اہل ایمان کے لئے بلاشبہ اس باب میں ایک بڑی نشانی موجود ہے (عنکبوت: ۴۴)

"حق" کے اولین معنی مطابقت اور سچائی کے ہیں۔ اور بالکل یہی لفظ قرآن کے لئے بھی بولا گیا ہے:

انا انزلنا الیک الکتٰب بالحق: ہم نے یہ کتاب یقیناً تیرے پاس حقانیت کے ساتھ بھیجی ہے (زمر: ۲)

وبالحق انزلنٰہ وبالحق نزل : اور ہم نے اس کو پوری سچائی کے ساتھ اتارا ہے۔
اور یہ سراسر حقانیت کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ (اسراء، ۱۰۵)

تنزیل الکتٰب من اللہ العزیز الحکیم : یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے جو بڑا ہی غالب اور نہایت درجہ حکمت والا ہے (لہٰذا یہ کتاب بھی حکمت سے پر ہے جو کبھی مغلوب نہیں ہو سکتی (زمر: ۱)

خدائی حکمت و دانش اور اس کی انوکھی ولاجواب اسکیم کے مطابق مظاہر فطرت کی تخلیق و آفرینش اور ان کی ساخت وپرداخت میں جو جو مصالح اور خوبیاں رکھ دی گئی ہیں۔ ان کا ٹھیک ٹھیک حال اجمالاً قرآن حکیم میں مذکور ہے۔ جس سے اس حقیقت کو بے نقاب کرنا مقصود ہے کہ یہ عالم رنگ وبو اور قرآن مجید دونوں ایک ہی سرچشمہ کے پرتو ہیں۔ اگر قرآن خدائی تصنیف نہ ہوتا بلکہ کسی انسان کا ساختہ کلام ہوتا اور اس طرح کائنات خدا کی تخلیق نہ ہوتی بلکہ بخت و اتفاق کا نتیجہ ہوتی تو پھر نا ممکن تھا کہ ان دونوں میں اس قدر زبردست مطابقت و ہمنوائی پائی جاتی۔ یہی وہ ابدی صداقت ہے جو لفظ "الحق" کے ذریعہ ظاہر کی گئی ہے۔ اس ربانی پلان اور منصوبہ پر حسب ذیل آیات مہر تصدیق ثبت کر رہی ہیں۔

انا کل شئی خلقنٰہ بقدر : ہم نے ہر چیز یقیناً ایک منصوبہ کے ساتھ پیدا کی ہے۔ (قمر: ۴۹)

وخلق کل شئی فقدرہ تقدیراً : اور اس نے ہر چیز کی تخلیق کی پھر ہر ایک کا ایک ضابطہ مقرر کیا۔ (فرقان: ۲)

وکان امر اللہ قدراً مقدوراً : اور اللہ کا معاملہ بالکل مقررہ منصوبہ ہے۔ (احزاب: ۳۸)

یدبر الامر من السماء الی الارض : وہ آسمان سے زمین تک (ہر) معاملہ کی تدبیر کرتا رہتا ہے (سجدہ: ۵)

اس مختصر تمہید و جائزہ کے بعد اب اصل موضوع کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور خدائی اسکیم و منصوبہ بندی کے مطابق چند ابدی حقائق کا اظہار کیا جاتا ہے جو نوع انسانی کے لئے بصیرت کا سرمہ بن سکتے ہیں۔

۲- کلوروفل کی داستان

بیالوجی کا موضوع اور اس کے مباحث | زیر بحث مضمون نباتات سے متعلق ہے۔ اور نباتات کا تعلق علم الحیات یا حیاتیات (بیالوجی) سے ہے۔ حیاتیات کی دو شاخیں ہیں۔

۱- علم حیوانات یا زولوجی (ZOOLOGY)

۲- علم نباتات یا باٹنی (BOTANY)

ان دونوں کا مطالعہ ایک علم مشترک (علم الحیات) کے تحت "زندگی" کی مشترک اساسی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ یعنی حیوانات و نباتات دونوں ذی روح مظاہر ہیں اور ان دونوں طبقوں میں زندگی کے ہنگامے مشترکہ طور پر جاری و ساری ہیں۔ (لفظ " BIOS " یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی زندگی کے ہیں۔ " BIOLOGY " اسی سے مشتق ہے جس کے معنی "علم الحیات" کے ہیں۔

انسان اور دیگر حیوانات جس طرح صفت حیات سے متصف ہو کر ایک مخصوص طبعی و فطری ماحول میں نشو و نما پاتے اور چند مخصوص طبعی افعال ظاہر کرتے ہیں بالکل اسی طرح نباتات بھی زندگی کی نعمت سے بہرہ ور، ایک خاص طبعی ماحول (— ENVIRONMENT) میں پروان چڑھتے اور چند مخصوص "عادات و اطوار" کے تحت اپنی زندگی کا سفر ایک مقررہ وقت تک جاری رکھتے ہیں۔

غرض بیالوجی کا موضوع "حیات" ہے اور اس کے مباحث "انواع حیات" کے طبعی و فطری مظاہر، ان کی ساخت و پرداخت اور ان کے اوصاف و خصائص ہیں۔

حیوانات و نباتات کے مشترکہ خصائص | حیوانات و نباتات کی زندگی میں بہت سی باتوں میں اتحاد و اشتراک اور مشابہت و یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس موقع پر چند اہم خصوصیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ خلیہ اور پروٹو پلازم۔ ان خصوصیات میں سب سے اہم اور بنیادی چیز نخرمایہ یا پروٹو پلازم (ایک زندہ، متحرک اور لیس دار مادہ) کا وجود ہے۔ حیوانات و نباتات کے اجسام کی تشکیل اسی مادہ سے ہوئی ہے۔ مختلف انواعِ حیات میں اس مشترکہ مادہ کی صرف شکل و صورت بدل جاتی ہے۔ اگرچہ ہر ایک کی اصل ایک ہے۔

کوئی بھی جسم ـــ خواہ وہ حیوانی ہو یا نباتاتی ـــ نہایت چھوٹے چھوٹے متعدد ولاتعداد خوردبین خانوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ان خانوں کو اصطلاح میں "خلیات" (CELLS) کہتے ہیں۔ جن کی شکل و صورت مختلف اجسام میں مختلف ہوتی ہے۔ ہر خانہ چاروں طرف سے ایک دیوار نما پردے سے گھرا رہتا ہے، جس کے اندر نخرمایہ (پروٹو پلازم) بھرا رہتا ہے۔ یہ "خلیات" گویا کہ "زندگی" کی بنیادی اینٹیں ہیں جن سے تمام حیاتیاتی اجسام کی تعمیر و تشکیل ہوئی ہے۔

روح اور نخرمایہ میں بہت گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ جب تک یہ مادہ متحرک رہتا ہے روح بھی برقرار رہتی ہے۔ مگر یہ جیسے ہی ساکن ہوتا ہے روح بھی پرواز کر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے کسی بھی چیز کے ذی روح یا غیر ذی روح ہونے کا فیصلہ اس حیرت انگیز مادہ کے وجود و عدم ہی پر منحصر ہے۔

۲۔ نشو و نما۔ حیوانات و نباتات دونوں میں نشو و نما کا عمل مشترک ہے۔ ہر ایک کی ابتدا ایک خلیہ (CELL) سے شروع ہوتی ہے۔ پھر بتدریج خلیوں کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ وہ کروڑوں اربوں تک جا پہنچتی ہے۔ کسی حیوان کا گوشت پوست، ہڈیاں، خون اور بال وغیرہ غرض پورا جسم انہی خلیات سے مرکب ہوتا ہے۔ جس طرح کہ کسی پودے

کی جڑ، تنا، ڈالیاں، شاخیں، شگوفے، پھل پھول اور برگ و بار وغیرہ سب انہی خلیات پر مشتمل ہوتے ہیں۔

۳۔ تنفس: جس طرح حیوانات سانس لیتے ہیں اسی طرح پیڑ پودے بھی سانس لیتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ہم آزاد فضا سے آکسیجن (صاف ہوا) لیتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ (گندہ ہوا) خارج کرتے ہیں۔ اس کے برعکس پیڑ پودے فضا سے کاربن آکسائیڈ (حیوانات کی خارج کی ہوئی گندہ ہوا) لیتے ہیں اور آکسیجن خارج کرتے ہیں[1]۔ حیوانات اور نباتات کے اس مشترکہ فعل کو "عمل تنفس" (RESPIRATION) کہا جاتا ہے۔

۴۔ تحوّل: جس طرح حیوانات میں ایک مقررہ کیمیائی عمل کے تحت اجسام کی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے۔ بالکل اسی قسم کا عمل نباتات میں بھی انجام پاتا ہے۔ غرض ہر ایک حیاتیاتی جسم میں مسلسل تعمیری و تخریبی یا بننے اور بگڑنے کا عمل برابر جاری رہتا ہے۔ تعمیری عمل سے مراد ہے ہوا، پانی اور غذا کے ذریعہ نیا مادہ اور نئے خلیے (CELLS) پیدا ہونا۔ اور تخریبی عمل سے مراد ہے۔ فاسد اور غیر ضروری مادہ خارج کرنا جیسے بول و براز وغیرہ۔ اس عمل کو مجموعی طور پر "نظام تحوّل" (METABOLISM) کہتے ہیں۔

۵۔ احساس: جس طرح حیوانات کسی چوٹ وغیرہ کے لگنے سے مختلف قسم کے احساسات سے دوچار ہوتے ہیں اسی طرح نباتات بھی صفت احساس سے متصف ہیں اور وہ بھی دکھ درد اور رنج و راحت وغیرہ محسوس کرتے ہیں۔ اس خصوصیت کو نظام احساس ...... (IRRITABILITY) کہا جاتا ہے۔

۶۔ افزائش نسل: حیوانات ہی کی طرح نباتات میں بھی افزائش نسل ——— (REPRODUCTION) کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ نباتات کے بیج در اصل ان کے

---

[1] یہ خدائے رحمان کی ربوبیت اور عدل الٰہی کا ایک حیرت ناک منظر ہے۔

نکلے، پھل اور میوے ہیں جن سے ان کی نسل کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس عمل کے اظہار کے لئے نباتات میں "شادی بیاہ" کے مختلف رسم و رواج اور بڑے منظم قوانین پائے جاتے ہیں جن کا مطالعہ سب سے زیادہ دلچسپ اور تحیر خیز ہے۔

پودوں کی زندگی کا مقصد اور ان کا نصب العین پھل اور بیج پیدا کرنا ہے۔ جن سے نئے پودے جنم لے سکیں اور ربوبیت کے تقاضے پورے ہو سکیں۔ پیڑ پودے اسی مقصد کی خاطر جیتے ہیں۔ اور جب یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو راہی عدم ہو جاتے ہیں۔ موت و حیات کا یہ سلسلہ حیوانات و نباتات دونوں میں مشترک ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی چند مشترکہ حیاتیاتی خصوصیات ہیں۔ جن کا تذکرہ اس موقع پر طوالت کا باعث ہوگا۔ حاصل یہ کہ نباتات بھی حیوانات ہی کی طرح کھاتے پیتے، رنج و راحت محسوس کرتے اور آپس میں شادی بیاہ کر کے اپنی نسل بڑھاتے رہتے ہیں۔

قرآن اور بیالوجی | خواہ حیوانات ہوں یا نباتات ہر ایک طبقہ کا مطالعہ اصولاً دو خاص صورتوں سے کیا جاتا ہے:

۱۔ ظاہری شکل و صورت اور اعضاء کی اندرونی و بیرونی ساخت و بناوٹ کا معائینہ۔ اس کو علم اشکال الاعضاء یا عضویات (MORPHOLOGY) کہا جاتا ہے۔

۲۔ مذکورہ بالا اعضاء میں سے ہر ہر عضو کے اعمال و وظائف یا ان کی کارگزاریوں کا جائزہ۔ اس کو علم افعال اعضاء (PHYSIOLOGY) کہتے ہیں۔

حیوانات اور نباتات کے ان مخصوص طبعی و فطری نظامات، ان کے جبلی احوال و کوائف اور ان کی حقیقت و ماہیت کے مطالعہ کا نام حیاتیات (BIOLOGY) ہے۔ بالفاظ صریح بیالوجی نام ہے۔ حیوانات و نباتات کی "صورتوں اور سیرتوں" کے مطالعہ کا۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسب ذیل قرآنی آیات کا مطالعہ فرمائیے:

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى۔ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى۔ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى۔

پاکی بیان کر اس رب برتر کی جس نے (تمام مخلوقات کو) پیدا کیا پھر ان کا تسویہ کیا (ہر ایک اعضاء کو درست اور ٹھیک ٹھاک کیا) اور وہ جس نے (ہر ایک کا ایک طبعی نظام) مقرر کیا۔ پھر (ہر ایک کو اپنے نظام اور ضابطہ کے مطابق چلنے کی) توفیق دی۔

(سورۂ اعلیٰ)

ان آیات میں بتا گیا ہے کہ "ربوبیت" چار نظاموں کا نام ہے: (۱) نظام تخلیق (۲) نظام تسویہ (۳) نظام تقدیر (۴) اور نظام ہدایت۔ اس لحاظ سے علم اشکال الاعضاء (مارفالوجی) پہلے دو نظاموں (تخلیق و تسویہ) پر مشتمل ہے اور علم افعال الاعضاء (فزیالوجی) میں آخری دو نظاموں (تقدیر و ہدایت) سے بحث کی جاتی ہے[ل] ان چاروں نظاموں کے مطالعہ سے ایک "رب برتر کا وجود ثابت ہوتا ہے جو مظاہر حیات اور انواع زندگی کے حقیقت پسندانہ جائزہ کا لازمی نتیجہ اور حاصل مطالعہ ہے۔ اس لحاظ سے "سبح اسم ربک الاعلیٰ" ایک بلند آہنگ اور معرکہ آراء دعویٰ ہے۔

نباتات کی اہمیت حیوانات کی زندگی کا دار و مدار تمام تر نباتات کے وجود پر منحصر ہے نباتات کے بغیر نہ کوئی حیوان زندہ رہ سکتا ہے نہ انسان۔ ہماری بنیادی غذا گیہوں، چاول جوار، مکئی اور باجرہ وغیرہ نباتات ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ دالیں، ترکاریاں اور مختلف قسم کے ساگ پات پودوں ہی کا کرشمہ ہیں۔ قسم ہا قسم کے خوشبودار اور چٹ پٹے مسالے پودوں

ل تقدیر کے لغوی معنی مقرر کرنے اور قدرت عطا کرنے کے ہیں۔ اور ہدایت کے معنی رہبری و رہنمائی کے ہیں۔ "ہدایت" کے وسیع مفہوم میں فطری و تشریعی ہر قسم کی وحی والہام شامل ہے۔

ہی کا نتیجہ ہیں۔ انواع و اقسام کے خوش رنگ و خوش ذائقہ پھل، پھول اور میوے پیڑ پودوں ہی کی بدولت میسر آتے ہیں۔ مختلف قسم کی خوشبوئیں، دوائیں اور جڑی بوٹیاں پودوں ہی سے فراہم کی جاتی ہیں۔ ہماری روزمرہ زندگی کے عام اور دل پسند مشروبات یعنی چائے اور کافی وغیرہ پودوں ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ مختلف قسم کا تیل اور رنگ و روغن بھی نباتات ہی کی دین ہے۔

ایک اور قدم آگے بڑھایئے تو آپ کے مکان اور دفتر کی میز کرسیاں اور دیگر فرنیچر میں بھی درختوں (لکڑی) ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ گھروں اور مکانوں میں ایندھن کے طور پر جو لکڑی اور کوئلہ استعمال کیا جاتا ہے وہ درختوں ہی کے طفیل میں حاصل ہوتا ہے۔ خود عمارت سازی اور مکانوں کی تعمیر میں جو لکڑی دروازوں، کھڑکیوں اور شہتیروں وغیرہ کی شکل میں استعمال کی جاتی ہے اس کا ماخذ بھی درخت ہی ہیں۔ سب سے بڑھ کر وہ ربڑ (RUBBER) جس کی اہمیت تمدن جدید میں مسلّم ہے اور جس سے قسم ہا قسم کے سامان کے علاوہ موٹروں، کاروں، ٹرکوں اور سائیکلوں کے ٹائر ٹیوب وغیرہ تیار کئے جاتے ہیں وہ پیڑوں ہی سے حاصل ہوتا ہے اگر آج کے تمدن سے ربڑ کو ہٹا دیا جائے تو ہمارے تمدن کے ڈانڈے ہزاروں سال قدیم قسم کے تمدن سے مل جاتے ہیں۔

اس وقت آپ جو سوتی لباس زیب تن کئے ہوئے ہیں۔ یہ بھی روئی کے پودے کا کرشمہ ہے۔ ریلوے انجنوں اور مختلف قسم کے کارخانوں میں استعمال ہونے والا حجری کوئلہ اور موٹروں، ہوائی جہازوں اور راکٹوں کو حرکت اور تیز گامی عطا کرنے والا پٹرول اور مٹی کا تیل بھی نباتات ہی کا عطیہ ہے جو قرن ہا قرن قبل زمین کے اندر دب جانے کی بنا پر معرض وجود میں آیا تھا۔ اسی طرح راکٹوں میں استعمال ہونے والے گیسولین اور سیال آکسیجن کے حصول میں بھی نباتات کا بڑا عمل دخل ہے وہ کتابیں جو تمدن کی جان تصور کی جاتی ہیں۔ ان کا کاغذ بھی نباتات ہی سے تیار کیا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ آپ کسی بھی حیثیت سے غور کیجئے آپ کو نباتات کی ہمہ گیری مسلم نظر آئے گی۔ نباتات اہم ہی نہیں بلکہ ہوا اور پانی کے بعد انسانوں اور حیوانوں کے لئے اہم ترین متاع زندگی ہیں جن کے بغیر زندگی کا تصور بھی ناممکن اور محال ہے۔ اور دوسری حیثیت سے دیکھیے تو نباتات کا ہر ہر حصہ ــ پھل، پھول، پتیاں، شاخیں، ڈالیاں، تنا اور جڑیں وغیرہ ہر چیز کام میں لائی جاتی ہے اور کوئی بھی چیز بے کار نہیں جاتی۔ ایک ایک قسم کے درخت سے ہمیں بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں جنہیں شمار کرنا بھی مشکل ہے۔ حد یہ ہے کہ مختلف قسم کی رسیاں، ٹوکریاں، جھاڑو، برتن، برش، خس کی ٹٹیاں، پنکھے، قلم، پنسل، کنگھے، گوند، کاغذ اور کتابیں وغیرہ وغیرہ نباتات ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ خود ایک ناریل کے درخت کے فوائد ہی پر غور کریجئے جو قدرت کا ایک عجوبۂ روزگار ہے۔ ان حقائق کے ملاحظہ کے بعد حسب ذیل آیات کتنی بلیغ اور معنی خیز معلوم ہوتی ہیں۔

واٰتٰکم من کل ما سألتموہ وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا ان الانسان لظلوم کفار: اور اللہ نے تم کو وہ سب کچھ دیا جو تم نے مانگا (تمہاری فطرت کے تقاضے کے مطابق تمہارے تمام مطالبات پورے کئے) اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا بھی چاہو تو شمار نہ کر سکو گے۔ یقیناً انسان بڑا ہی ستمگار اور ناشکرا ہے۔ (جو ان نعمتوں سے متمتع ہونے کے باوجود بھی اس کے وجود میں جھگڑنے لگتا ہے۔ (ابراہیم: ۳۴)

<u>کلوروفل اور اس کی اہمیت</u>| نباتات کی اس اہمیت کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب نباتات کی سیر تول اور ان کی چند خصوصیات کا جائزہ لیجئے۔ یوں تو پیڑ پودوں کی زندگی کے تمام مظاہر اور ان کے کل حرکات و سکنات کا شمار عجائبات قدرت ہی میں ہوتا ہے۔ مگر خصوصیت کے ساتھ کلوروفل (خضرہ یا ہرا رنگ) اور عمل زیرگی (قانون ازدواج) کا مظاہرہ اور ان کی کارگزاریاں نہایت ہی عجیب و غریب اور حیرت انگیز ہیں۔ اور اس گورکھ دھندے کے مقابلے میں دنیا کے سات عجائبات بھی ہیچ دکھائی دیتے ہیں۔

فنی اعتبار سے پیڑ پودوں کی زندگی کا مطالعہ مختلف حیثیتوں سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً جڑ
اور اس کے کام، تنا اور اس کا عمل، شاخیں اور ان کی کارکردگی، پتیاں اور ان کے افعال، پھول
اور ان کے عجیب وغریب کرتب وغیرہ۔ مگر ان سب میں جیسا کہ ابھی کہا گیا کلوروفل (خضرہ) اور عمل زیرگی
(قانون ازدواج) کا عمل سب سے زیادہ دلچسپ اور تحیر خیز ہے۔ کلوروفل کا عمل پتیوں میں اور عمل
زیرگی (POLLINATION) کی کارکردگی پھولوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر پتیاں کلو
(CHLOROPHYLL) کی اعجوبگی کے کرتب دکھاتی ہیں تو پھولوں کی کارستانیوں سے "ربوبیت
کے تماشے ظاہر ہوتے ہیں، جن کے ملاحظہ سے انسان کی سبق آوری اور بصیرت افروزی کا ساما
بہت بڑی حد تک فراہم ہو جاتا ہے۔

پھولوں کے افعال کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے[1] اس وقت میں
کلوروفل یا پتیوں کے عمل سے بحث کروں گا۔

نباتات کے ارکان اربعہ یعنی جڑ، تنا، پتیاں اور پھولوں کے مشترکہ اعمال و افعا
اور سرگرم جدوجہد اور ایک دوسرے کے تعاون واشتراک ہی کی بدولت پھل وجود میں آتا ہے

---

[1] ملاحظہ ہو میری کتاب "نباتات سے انسانیت تک"، جس میں پھولوں کے اعمال و نباتات کے
قانون ازدواج (POLLINATION) کا جائزہ لے کر مختلف حیثیتوں سے فطرت و شریعت
کی مطابقت دکھائی گئی ہے۔ اور قانون فطرت کے جائزہ سے عفت و پاکیزگ
کے نباتاتی تصور کی معرکہ آراء تشریح، نباتات کی تسبیح و تہلیل اور ان کے مسلما
صوفی ہونے کی بحث کے علاوہ اسلامی عبادت نماز، اسلامی پرسنل لا، نکاح، طلاق
اور تعدد ازدواج کی حقانیت اور اسلامی پردہ کی تمدنی ضرورت و اہمیت
...... نباتات کی سیرتوں کی روشنی میں بڑے دلچسپ اور انوکھے انداز میں روش
ڈالی گئی ہے۔

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان "ارکین بیت" میں سب سے زیادہ اہمیت پتیوں اور ان کے عجیب و غریب فعل کی ہے۔ کسی بھی درخت یا پودے کی زندگی کا دارومدار پتیوں کے فعل پر ہی منحصر ہے۔ پتیوں میں نہ صرف نباتات کی بلکہ تمام حیوانات کی مرغوب غذا تیار ہوتی ہے۔ ہر پتی دراصل ایک مکمل کارخانہ ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

پتیوں کا یہ عمل محض ہرے رنگ کے ایک مادہ کے وجود پر منحصر ہے جس کو علم نباتات کی اصطلاح میں خضرہ یا کلوروفل (CHLOROPHYLL) کہتے ہیں۔ یہ خضرہ یا سبز مادہ دنیا بھر کے تمام نباتات کا جزو لاینفک ہوتا ہے جس کی بدولت پتیاں ہری دکھائی دیتی ہیں۔[1] اس سبز مادہ کے بغیر کسی پیڑ پودے کی نشوونما ہو سکتی ہے، اور نہ وہ اس کے بغیر اپنی غذا حاصل کر سکتا ہے۔ بعض طفیلی پودے اس ہمہ گیر قانون خداوندی سے مستثنیٰ ہیں۔ مگر ان کی زندگی کا دارومدار بھی دراصل سبز پودوں کے وجود پر منحصر ہے۔ جن میں یہ اپنی جڑیں اتار کر ان سے غذا حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی بنا پر انہیں طفیلی پودوں کا نام دیا گیا ہے۔ گویا کہ کلوروفل نباتات کی جان ہے۔ کلوروفل کی یہ اہمیت استقراء اور سائنٹفک تجربات کی رو سے پوری طرح سے ثابت اور مسلّم ہے جس کو ایک "قانون قدرت" کہا جا سکتا ہے۔

---

[1] جس طرح حیوانات و نباتات کی چند مشترکہ خصوصیات ہیں اسی طرح ان دونوں طبقوں میں بعض حیثیتوں سے تباین و اختلاف بھی ہے اور چند امتیازی خصائص بھی ہیں۔ جو ایک دوسرے کو جدا کرتے ہیں۔ ان اختلافات میں سب سے اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ تمام نباتات ایک ہرے رنگ کے مادے (کلوروفل) پر مشتمل ہوتے ہیں جب کہ حیوانات میں ایک سرخ مادہ (خون) رواں دواں رہتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ ہرا رنگ (کلوروفل) ٹھوس قسم کے ذرات پر مشتمل ہوتا ہے۔ جب کہ خون سیال شکل میں نظر آتا ہے۔

کلوروفل کی کارکردگی | جیسا کہ عرض کیا جا چکا پودوں کی غذا پتیوں میں تیار ہوتی ہے اور پتیوں کی کارکردگی کلوروفل کی بدولت ہے۔ کلوروفل کا عمل بالکل مشینی اور طلسمی نوعیت کا ہے جس کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔

کلوروفل اپنے طبعی ماحول سے چند سادہ عناصر کو لے کر مرکب غذائی مادہ میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک طرف پتیاں عمل تنفس (RESPIRATION—) کے ذریعہ بیرونی ہوا کی کاربن ڈائی آکسائیڈ[1] جذب کر کے کلوروفل تک پہنچاتی ہیں تو دوسری طرف جڑ اپنے تنے اور ڈالیوں کی مدد سے زمین کے پانی اور مختلف قسم کے نمکیات مثلاً کیلشیم، سوڈیم، لوہا اور فاسفورس وغیرہ کو اوپر پہنچاتی یا اس کی "ضیافت" کرتی ہے۔ اب کلوروفل اپنے "دسترخوان" پر ان سادہ عناصر کو جمع کر کے ایک عجیب وغریب کرتب دکھاتا ہے۔ یعنی سورج کی روشنی کی مدد سے مذکورۂ بالا کاربن ڈائی آکسائیڈ جیسی زہریلی گیس اور دیگر نمکیات کو پانی میں گھول کر ایک لذیذ و فرحت بخش غذائی مادہ یعنی مواد نشائیہ (CARBOHYDRATES) میں تبدیل کر دیتا ہے۔

---

[1] ہوا میں ۷۸.۰۳ فی صد نائٹروجن، ۲۰.۹۹ فی صد آکسیجن اور صرف ۰.۰۴ فی صد کاربن ڈائی آکسائیڈ ہوتی ہے۔ حیوانات سانس کے ذریعہ آکسیجن اپنے پھیپھڑوں میں پہونچاتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائڈ خارج کرتے ہیں۔ اب خلاق عالم کی حکمت تخلیق ملاحظہ ہو۔ جس زہریلی گیس کو حیوانات خارج کرتے ہیں اسی چیز کو نباتات کی بنیادی غذا بنا دیا گیا ہے۔ اور جو چیز حیوانات کے لئے ضروری تھی وہ نباتات کے ذریعہ پیدا کر دی۔ چنانچہ نباتات آکسیجن خارج کرتے رہتے ہیں۔ ان دونوں کے توازن ہی سے فضا میں مذکورہ بالا شرح کے حساب سے تناسب قائم ہے ورنہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کی زیادتی سے حیوانات کی زندگی کو خطرہ پیدا ہوجاتا۔

جو ربوبیت کا ایک شاندار معجزہ ہے[1]۔ چاول، گیہوں، جوار، باجرا اور مختلف قسم کی دالوں

---

[1] سائنس کہتی ہے کہ کلوروفل کا یہ عمل صرف دن کے وقت اور سورج کی روشنی ہی میں عمل پاتا ہے۔ جیسا کہ سائنس لیبارٹریوں میں مسلسل تجربات سے پوری طرح ثابت ہو چکا ہے۔ مگر اہل اسلام کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کیوں کہ قرآن میں بصراحت کہا گیا ہے:

وجعلنا النهار معاشاً..... وجعلنا سراجاً وهاجاً: ہم نے دن کو (ذریعہ) زندگی بنایا اور ایک خوب بھڑکدار سورج بنایا (نبا: ۱۱ اور ۱۳)

یہاں پر "معاش" اور "وهاج" کے الفاظ قابل غور اور معنی خیز ہیں۔ معاش کے معنی اسم یا حاصل مصدر ہونے کی صورت میں زندگی کے آتے ہیں اور مصدر میمی ہونے کی صورت میں زندگی سے متصف ہونے کے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہر قسم کی زندگی کا قیام یا "زندگی" کے ہنگامے صرف دن ہی میں عمل پذیر ہوتے ہیں۔ اور کلوروفل بھی پروٹوپلازم (زندہ و متحرک مادہ) کا ایک جزو اور حصہ ہے جو اپنی یا پودے کی زندگی کے لئے کارزار حیات میں ہاتھ پیر مارتا ہے —— غرض لفظ "معاش" کی وسعت میں حیوانات و نباتات کی سرگرمی اور جدوجہد کے تمام مظاہر آجاتے ہیں جو اپنی بقا اور نشو و نما کے لئے ہاتھ پیر مارتے ہیں۔

معاش کے تذکرہ کے بعد سورج کا ذکر کر کے اس کو "وهاج" (بہت زیادہ بھڑکدار) قرار دینا اس بات کی طرف صاف اشارہ ہے کہ "معاش" کے یہ سارے کرشمے محض آفتاب ہی کی بدولت جاری و ساری ہیں جو اپنی بھڑک یا تپش و حرارت سے نہ صرف نباتات کو غذا کی تیاری میں مدد دیتا ہے بلکہ اپنی گرم گرم کرنوں کے ڈول سمندروں میں ڈال کر پانی کو بھاپ بنا کر اوپر اٹھاتا ہے۔ جو بادلوں کا روپ دھار کر مردہ و خشک خطۂ ارض کو جل تھل کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ مردہ زمین جاگ اٹھتی ہے اور اس کے سینے پر رونق اور ہلچل شروع ہو جاتی ہے۔ سبزہ زاروں کے آنچل اس کی زلفوں سے اٹھکھیلیاں کرنے لگتے ہیں۔ اس لحاظ سے آفتاب ایک عظیم "باورچی" اور ایک ناقابل فراموش "بھشتی" ہے جو ربوبیت کے اشاروں پر اپنا خزانہ لٹاتا چلا جا رہا ہے

پھلوں، میووں وغیرہ کا اکثر حصہ مواد نشائیہ (میٹھا اور خوش گوار مادہ) پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو انسانی جسم کو قوت اور گرمی پہنچاتا ہے۔ ہمارے جسم میں جو گرمی و حرارت پائی جاتی ہے وہ اسی مادہ کی کیمیائی (کیمیکل) تحلیل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس بنا پر اس کو "مولد حرارت" بھی کہا جاتا ہے اس عمل میں ہوتا یہ ہے کہ سانس کے ذریعہ جو آکسیجن جسم کے اندر جاتی ہے وہ مواد نشائیہ کو جلا دیتی ہے جس کے نتیجہ میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اس بنا پر موسم سرما میں بھی ہمارا جسم اندر سے گرم رہتا ہے اس موسم میں ہم اونی لباس اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ اندر کی گرمی و حرارت باہر نکلنے نہ پائے۔ ہمارے جسم سے گرمی کے اخراج ہی کی بدولت ہمیں سردی محسوس ہوتی ہے۔ سردی نام ہے بیرونی فضا کی خنکی یا ٹھنڈک کی اثر اندازی کا۔

کلوروفل یا پتیوں کے اس بنیادی عمل ہی کی بدولت پودے کی بھی نشو و نما اور اس کی بڑھوتری ہوتی ہے اور اس عمل کے نتیجے ہی میں پھول اور پھل بھی نمودار ہوتے ہیں۔ یہ پتیاں جو پورے درخت میں چاروں طرف پھیلتی رہتی ہیں، مسلسل اور پیہم مصروف عمل رہ کر اپنا تیار کردہ سارا غذائی مادہ یا اپنا کل "سرمایۂ حیات" درخت کے چند مخصوص مقامات پر اکٹھا کرتی رہتی ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ بنیوں اور مہاجنوں کی طرح اس غذائی سرمایہ کو بڑی حفاظت کے ساتھ چند "بینکوں" میں "ڈپازٹ" (ذخیرہ) کرتی رہتی ہیں۔ یہی وہ "غذائی بینک" ہوتے ہیں جو بالآخر مختلف قسم کے غلّوں اور خوبصورت و خوش رنگ اور کاربوہائیڈریٹ سے بھرپور پھلوں کی شکل میں نمودار ہو کر انسانوں اور حیوانوں کی زندگی برقرار رکھنے کا باعث بنتے ہیں۔ اس کی مثال بس ایسی ہی ہے جیسے آپ کسی مشین میں ایک طرف پانی اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کو آمیزہ کر کے ڈال دیں تو دوسری طرف سے وہ بالکل خودکارانہ طریقے سے ایک میٹھے اور خوش نما آم یا امرود یا سیب یا سنترہ وغیرہ کی شکل میں نمودار ہو جائیں۔ کیا یہ عجوبہ ربوبیت کا معجزہ نہیں ہے؟

اگر پتیوں میں یہ حیرتناک عمل نہ ہوتا اور ربوبیت کی کارفرمائیاں سرگرم عمل نہ ہوتیں تو پھر

انسان اور تمام حیوانات بھوک سے بلک بلک کر اور تڑپ تڑپ کر جان دے دیتے۔ پتیوں کا یہ عمل اتنا انوکھا اور عجیب وغریب ہے کہ نقاش فطرت کی کرشمہ سازیوں کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے حقیقت یہ ہے کہ انسانی صنعت سازی میں اس قسم کے کسی طلسمی نوعیت کے کارخانے کا وجود تو درکنار اس کا تصور بھی نہیں پایا جاتا جو سراسر عقل انسانی سے بالاتر اور ظاہری اسباب وعلل سے ماوراء ہے۔ (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

کلوروفل کی سینچائی | اگر آپ کسی پودے اور درخت میں اس کے طلسمی مادہ (کلوروفل) کی سینچائی کا نظام ملاحظہ فرمائیں گے تو قدرت خداوندی کی پیچیدہ مشنری کو دیکھ کر محوحیرت ہوجائیں گے۔ اور آپ کو بالکل ایسے محسوس ہوگا کہ آپ راستہ بھول کر کسی جادو کی نگری یا "قلعہ افراسیاب" میں پہنچ گئے۔ یہ کارخانہ قدرت کچھ ایسا پرپیچ اور دقت انگیز نظام کا حامل ہے کہ علامہ اقبال تک کو کہنا پڑا ع

خداوندا خدائی درد سر ہے

پودے میں جڑ سے پتیوں تک پانی کی سپلائی کا ایک عجیب نظام جاری کیا گیا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ کسی ٹیوب ویل کے ذریعہ نیچے کا پانی اوپر کھینچا جاتا ہے یا کسی پمپ کے ذریعہ پانی کو اوپر ٹینکوں اور آبی ذخیروں میں پہنچایا جاتا ہے۔ مگر ایک فرق یہ ہے کہ انسان پمپ کے ذریعہ تیس ۳۰ فیٹ سے زیادہ اونچائی تک پانی نہیں پہنچا سکتا کیوں کہ ہوا کا قدرتی دباؤ صرف تیس فیٹ تک ہی اثر انداز ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے برعکس قدرت خداوندی ملاحظہ ہو کہ بغیر کسی ہوا کے دباؤ اور پمپ کے اثر اندازی کے خودکارانہ طریقہ سے چالیس پچاس فیٹ بلکہ اس سے بھی زیادہ بلندی تک پانی آسانی سے ساتھ پہنچ کر پتیوں میں دوڑتا رہتا ہے اور اس کی راہ میں کوئی روکاوٹ نہیں ہوتی (ناریل وغیرہ کے درخت چالیس پچاس فیٹ تک بلند ہوتے ہیں)

نیز انسان اس حقیقت کی اب تک گرہ کشائی نہیں کر سکا ہے کہ آیا جڑیں پانی کو پمپ

کرکے ڈالیوں اور پتیوں تک پہنچاتی ہیں یا خود پتیوں میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ زمین کا پانی چوس کر اوپر کھینچ سکیں!

بہرحال پورے درخت اور اس کی ڈالیوں اور شاخوں میں آبی گزرگاہوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ جس طرح انسانی جسم میں خون کی شریانوں اور وریدوں کا ایک منظم جال پھیلا ہوا ہوتا ہے جو خون کو دل کے ہیڈ کوارٹر سے سارے جسم تک پہنچاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح پتیاں بھی درخت کی جڑوں سے ایک قسم کی رگوں اور نالیوں کے ذریعہ[1] جڑی ہوتی ہیں۔ جن کو...... ڈالیاں اور شاخیں آپس میں جوڑ دیتی ہیں۔ گویا کہ جڑوں سے لے کر پتیوں تک پورے درخت میں ایک قسم کی پائپ لائنیں بچھی ہوئی ہیں۔ جن کے ذریعہ زمین کا پانی مسلسل پتیوں اور کلوروفل تک پہنچتا رہتا ہے۔ اگر آپ کسی پتی کو ہاتھ میں لے کر دیکھیں تو آپ کو اس کی پشت پر ابھری ہوئی بے شمار آڑی ترچھی رگوں کی مانند نسیں (VEINS) دکھائی دیں گی جن کو ایک بڑی درمیانی نس (MIDRIB) جوڑے رہتی ہے۔ یہ نسیں عموماً دھاگے سے زیادہ باریک ہوتی ہیں۔ جو سطحی نظر سے پوری طرح مشاہدہ میں نہیں آتیں۔ اس کے باوجود وہ ایک پائپ کی طرح اندر سے کھوکھلی ہوتی ہیں جن میں پانی وغیرہ برابر گزرتا رہتا ہے۔

الغرض ان نسوں کے ذریعہ زمین کا پانی کلوروفل تک پہنچتا ہے۔ پھر کلوروفل کے ذریعہ مواد نشاستہ (کاربوہائیڈریٹ) کی تیاری کے بعد یہی نسیں اس قیمتی غذائی مادہ کو بحفاظت تمام پھولوں اور پھلوں کے ظاہر ہونے والے مقامات تک مسلسل منتقل کرتی رہتی ہیں۔ پھول جب بار آور ہو جاتے ہیں تو یہی مادہ پھولوں کی بیضہ دانی (OVARY) میں جمع ہونے لگتا ہے جو بالآخر بڑھتے بڑھتے پھل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مگر "الذی احسن کل شئ خلقہ" (اس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی) کے ہمہ گیر کلیہ کے مطابق صنعت ربانی کی داد دیجئے

---

[1] ان کو نباتیات کی اصطلاح میں VASCULAR BUNDLES کہا جاتا ہے۔

کہ یہ دونوں نظامات (پانی کی آمد اور مواد نشائیہ کی رفت) نزاکت اور پیچیدہ کاریگری کا شاندار نمونہ پیش کرتے ہیں۔ کیا مجال ہے کہ پانی اور مواد نشائیہ دونوں آپس میں خلط ملط ہو کر نظام ربوبیت کو بگاڑ دیں! "بینھما برزخ لا یبغین" (ان دونوں کے درمیان ایک پردہ پڑا ہوا ہے جس کو کوئی پھاند نہیں سکتا) کا یہ بھی ایک شاندار نظارہ ہے[1]۔ کیا ایسا نازک اور حکیمانہ نظام بغیر کسی خالق و مربی اور مدبر و منتظم کے چل بھی سکتا ہے؟ کیا یہ "کل لہ قانتون" (سب کے سب اس کی بارگاہ میں جھکے ہوئے ہیں) کا ایک بے مثال آفاقی مشاہدہ نہیں ہے؟ آپ نے رگ گل سے بلبل کے پر باندھنے کی شاعرانہ خیال آرائی تو سنی ہو گی۔ مگر کلوروفل اور پتیوں کے دقت انگیز نظام ربوبیت میں یہ داستان سرائی ایک حقیقت ہے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

(باقی)

---

[1] جڑوں سے پتیوں تک تنے اور ڈالیوں میں دو قسم کی نالیاں بنی ہوئی ہیں: (۱) وہ نالیاں جو زمین کا پانی اور دیگر نمکیات اوپر پتیوں تک پہنچاتی ہیں ان نالیوں کو چوبی ریشہ (XYLEM) کہا جاتا ہے (۲) دوسری قسم کی نالیاں وہ ہیں جو پتیوں میں تیار شدہ مادہ (مواد نشائیہ) جڑوں اور دیگر مقامات تک واپس لاتی ہیں۔ ان نالیوں کو رس ریشہ (PHLOEM) کہتے ہیں۔ اسی طرح پتیوں میں بھی دو قسم کی نسیں ہوتی ہیں۔ مگر نظام ربوبیت کی داد دیجئے کہ کبھی بھول چوک کر بھی پانی اور سادہ نمکیات "اس ریشہ" میں یا تیار شدہ غذائی مواد "چوبی ریشہ" میں جا نہیں سکتا۔ کیا یہ حیرتناک نظام بغیر کسی نگرانی اور انتظام کے ممکن ہے! اللہ خالق کل شئی و ھو علی کل شئی وکیل (اللہ ہر چیز کی تخلیق کرنیوالا ہے اور ہر چیز کا نگران وہی ہے)۔

لطائف اکبری نادر قلمی ملفوظ
خواجہ علی اکبر مودودی (م ۱۲۰۹ھ) کے احوال و اقوال
(۳)

از مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی۔ استاذ شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

شیخ محب اللہ الہ آبادی ایک روز شیخ ابوالفتح محب اللہی (سلمہ اللہ تعالیٰ) نماز عصر سے پہلے حاضر خدمت ہوئے اور حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ کے تصنیف کردہ رسالہ "تسویہ" کا ذکر چھڑ گیا۔ خواجہ مودودی نے فرمایا کہ "فقیر نے اس رسالہ کی بڑی مفصل شرح لکھی ہے جو بہت طویل ہو گئی ہے، شرح لکھنے کے محرک حضرت شیخ الہ آبادیؒ کے فرزندوں میں سے ایک صاحب ہوئے تھے۔ ایک ہفتہ کے اندر یہ تشریح لکھ گئی تھی .... اس زمانے میں فقیر الہ آباد میں دائرہ شاہ محب اللہ ہی میں قیام پذیر تھا، نماز جمعہ کے بعد تشریح لکھنا شروع کی تھی اور دوسرے جمعہ کو وہ پایہ تکمیل کو پہنچ گئی ...." اس کے بعد شیخ ابوالفتح سے پوچھا "آپ کا اس سلسلہ سے تعلق کے واسطوں سے ہے؟" انھوں نے بتایا کہ اپنے والد کے مرید ہیں وہ اپنے دادا مولوی عبدالشکور محمد آبادی سے بیعت تھے اور مولوی عبدالشکور کو حضرت شیخ الہ آبادی سے بیعت تھی،

خواجہ مودودی نے فرمایا "مولوی عبدالشکور مغفور نے "تسویہ" کی بعض عبارتوں کا جو حل تحریر کیا ہے وہ فقیر نے دیکھا ہے اور شاہ حبیب اللہ عظیم آبادی نے بھی جو حضرت شاہ محب اللہؒ کے خلفاء میں سے تھے، دو ایک ورق "تسویہ" کی تشریح میں تحریر کئے ہیں"

اس کے بعد حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ کے احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ حضرت شیخ الہ آبادی نے لاہور میں ..... ملا عبدالسلام

لاہوری سے[1] جو اصلاً دیوہ کے رہنے والے تھے اور لاہور میں درس و تدریس کے سلسلے میں قیام پذیر ہو گئے تھے علوم رسمیہ حاصل کیے، فارغ التحصیل ہونے کے بعد لاہور سے دہلی آئے۔ جہاں سعد اللہ خاں کے یہاں، جو اس زمانے میں شغلِ وزارت رکھتے تھے۔ اپنی سابقہ دوستی کی بنا پر قیام کیا۔ دہلی میں قیام کے دوران ایک روز حضرت نظام الدین اولیا (سلطان المشائخ محبوب الٰہی رضی اللہ عنہ) کے مرقدِ منورہ کی زیارت کو گئے، عین عتبہ بوسی میں ان پر ایک کیفیت (بیخودی کی) طاری ہوئی جس میں انھوں نے دیکھا کہ اس سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ایک شیخ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک اور صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا اور فرمایا کہ ان کی تربیت تم کرو، اسی عالم میں جو محفل ان کے پیش نظر تھی اس کے حاضرین میں سے ایک سے انھوں نے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں (جن کے ہاتھ میں ہاتھ تھمایا گیا ہے) جواب ملا، ابوسعید گنگوہی، جب ہوش میں آئے تو حضرت شیخ ابوسعید گنگوہی کی خدمت میں حاضری کا رجحان پوری طرح غالب تھا، اور اسی رات کو دہلی سے گنگوہ روانہ ہو گئے اور بطور قطع ارض، کے ایسے وقت گنگوہ پہنچے کہ فجر کی سنتیں شیخ کی مسجد میں پڑھیں اور شیخ کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ شیخ ابوسعید گنگوہیؒ نے فجر کی نماز کے لیے۔۔۔۔ وضو کرتے ہوئے اس کنیز سے جو کھانا تیار کرنے کی ذمہ دار تھی فرمایا کہ "آج حلوہ خوب گھی ڈال کر تیار کرنا ایک نازک مزاج شکار میرے دام میں آگیا ہے" گھر ہی میں سنتیں پڑھ کر مسجد میں آئے اور فجر کی نماز جماعت سے ادا کی، اشراق کی نماز کے بعد حضرت شیخ اپنے مریدوں کی طرف متوجہ ہوئے

---

[1] یہ بیان تذکرہ نویسوں کے بیان سے مختلف ہے۔ تذکرہ نگار ملا عبد السلام لاہوری اور ملا عبد السلام دیوی کو نہ صرف الگ الگ شخصیت قرار دیتے ہیں بلکہ دونوں میں استادی اور شاگردی کا رشتہ مانتے ہیں ملا عبد السلام لاہوری کی وفات ۱۰۳۷ھ میں عہد جہانگیری میں ہوئی۔ اور ملا عبد السلام دیوی عہد شاہ جہانی میں اپنے استاد کے مدرسہ میں ان کے قائم مقام تھے۔ ملا دیوی کا سن وفات معلوم نہیں ہوسکا۔ ان کا مزار دیوہ میں ہے۔ (محمد رضا انصاری)

شیخ محب اللہ الہ آبادی بھی شرف ملاقات سے مشرف ہوئے، شیخ کے مریدوں میں سے ایک نے عراقی کی کتاب لمعات، شیخ کے آگے رکھ دی، اور شیخ اس کے پڑھانے میں اور شیخ محب اللہ درس کے سننے میں مشغول ہو گئے۔ درس کے بعد شیخ محب اللہ الہ آبادی نے شیخ گنگوہی سے التجا کی کہ مجھے اپنی غلامی میں قبول فرما کر داخل سلسلہ فرمائیں، شیخ گنگوہی نے دریافت کیا کہ تم عالم فارغ التحصیل ہو؟، شیخ الہ آبادی نے عرض کیا "حضور بطور عرفان صورت حال جانتے ہی ہیں" فرمایا" ایک شرط ہے، جو تم سے کہوں اس میں بحث اور چون و چرا نہ کرنا؟، شیخ الہ آبادی نے عرض کیا۔" اگر کوئی بات بفرض محال، خلاف واقعہ اور خلاف عقل و فکر معلوم ہو گی اس کی صحت چاہ لوں گا۔"

شیخ ابوسعید گنگوہی نے ان کو مریدوں میں داخل کر لیا اور فرمایا کہ تین روز لگاتار روزے رکھو اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو ذرا سی کسی چیز سے افطار کر لینا اور ایک ایک ہزار بار استغفر اللہ درود شریف اور لا الہ الا اللہ کا ورد کرو۔ تین دن کے بعد غسل کر کے میرے پاس آجاؤ، شیخ نے جیسا حکم دیا تھا شیخ الہ آبادی نے کیا۔ تین روز کے بعد شیخ گنگوہی نے ایک حجرہ ان کو دیا اور اپنے مریدوں میں سے ایک درویش کو ان کے ساتھ کر کے حکم دیا کہ ذکر جہری اس درویش کے ہمراہ کرو، ابھی ایک چلہ (چالیس دن) پورا ہونے میں چند روز باقی تھے کہ شیخ الہ آبادی نے اپنے شیخ سے خلافت کی خواہش کی، شیخ نے فرمایا "ابھی کے دن گذارے ہیں؛ علوم رسمیہ کے حاصل کرتے ہیں جو اس علم سے کہیں کم تر ہیں، کتنا لمبا زمانہ صرف کیا اور اس علم کا حصول اتنا آسان سمجھ بیٹھے؟"

اس اثناء میں شیخ الہ آبادی کے والدین نے اپنے وطن صدپور سے (صدپور حسب صراحت تذکرۂ علمائے ہند مضافات خیرآباد اودھ کا ایک قصبہ تھا) بار بار شیخ گنگوہی کی خدمت میں درخواست کی کہ ان کے بیٹے کو گھر آنے کی اجازت دی جائے، شیخ گنگوہی نے ان کو گھر جانے کی اجازت دے دی، چونکہ بے حد نازک طبع تھے اس لئے ان ریاضتوں کو

برداشت نہ کرسکے، بہرحال شیخ نے رخصت کرتے ہوئے اپنی کلاہ اور خرقۂ مبارک بطور خلافت عطا فرمایا اور اجازت خلافت بھی چند شرطوں کے ساتھ لکھ دی۔ فقیر نے حضرت شیخ ابوسعید کے ہاتھ اور قلم کی لکھی یہ تحریر بچشم خود دیکھی ہے اور وہ وطن آکر تدریس اور ارشاد میں مشغول ہوگئے، کچھ عرصہ قیام رہا بھائیوں کی جلن کی وجہ سے چونکہ حد درجہ نازک طبع تھے وطن سے بارادۂ حج روانہ ہوگئے۔ اتفاقاً الہ آباد پہنچے اور وہاں دریائے جمنا کے کنارے قیام فرمایا، قاضی شہر کے بیٹے جن کا نام صدر الدین تھا اور جو قاضی گھاسی کے نام سے مشہور ہیں، خدمت میں حاضر ہوکر مرید ہوئے۔ قاضی گھاسی کم عمر اور انتہائی خوب صورت تھے۔ شیخ الہ آبادی کو ان کی طرف بے حد التفات ہوگیا اور اسی کے نتیجہ میں الہ آباد ہی میں سکونت اختیار کرلی، اور وہیں انتقال فرمایا۔ حضرت شیخ الہ آبادی کے اولاد میں بعض صاحبزادوں سے میں نے سنا ہے کہ جب قاضی زادہ (قاضی گھاسی)، نے آکر بیعت کی تو شیخ الہ آبادی نے فرمایا کہ میرا حج مجھے حاصل ہوگیا، رحمتہ اللہ علیہ رحمتہً واسعۃً، صفحہ ۵۰ سے ۶۰ تک)

صاحب ملفوظ خواجہ مودودی شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ کے مزار پر ایک عرصہ تک قیام کرکے شیخ محی الدین ابن عربی اور شیخ الہ آبادی کی تصانیف کا جو وحدۃ الوجود کے فلسفے کی بنیاد ہی تصانیف ہیں مطالعہ کرتے رہے تھے۔ صاحب نزہتہ الخواطر کا بیان ہے:

فرأی الشیخ محب اللہ المذکور فی المنام ووقع بینہما کلام علی من ھبہ فاعترف بما اعترف واعطاہ الخرقۃ التی کانت علیہ فلما افاق لاقاہ غلام محب اللہ ابن حبیب اللہ بن سیف اللہ بن تاج الدین بن محب اللہ المذکور واخبرہ انہ رائ فی منامہ جدہ ہٗ	خواجہ علی اکبر مودودی (صاحب ملفوظ) نے الہ آباد میں شیخ محب اللہ الہ آبادی کو خواب میں دیکھا، خواب ہی میں دونوں میں شیخ کے مسلک (وحدۃ الوجود) پر تبادلۂ خیال ہوا اور خواجہ مودودی نے شیخ کے ارشادات کو صحیح مان لیا۔ شیخ الہ آبادی نے خواب ہی میں اپنا خرقہ جسے وہ پہنے ہوئے تھے اتار کر خواجہ کو عطا فرمادیا خواجہ مودودی خواب سے بیدار ہوئے تو شیخ محب اللہ

فامرہ ان یخرج الخرقۃ التی کان یلبسھا فی حیاتہ الیہ فاتی بھا لسدیدہ فاخذ ھا،
ص ۳۲۸ ج ۲

الہ آبادی کے پرپوتے کے صاحبزادے غلام محب اللہ جن کا نام تھا آئے اور انھوں نے بتایا کہ ان کے جدامجد نے خواب میں انہیں حکم دیا ہے کہ جو خرقہ وہ اپنی زندگی میں پہنا کرتے تھے وہ نکالا جائے اور خواجہ مودودی کو دے دیا جائے چنانچہ وہ خرقہ غلام محب اللہ نے خواجہ مودودی کو پیش کیا اور انھوں نے لے لیا۔

شیخ محب اللہ الہ آبادی کے مسلک سے ہم آہنگ ہو جانے کے بعد خواجہ مودودی ان کے خیالات اور نظریات کے بڑے مبلغ بن گئے تھے۔ ملفوظ میں جابجا شیخ کے اس نظریۂ وحدۃ الوجود کی تشریح اور تفسیر ان کی زبانی ملتی ہے مثلاً، خواجہ مودودی نے بیان کیا:

کہتے ہیں کہ ایک گویا، محمد داراشکوہ کے دربار میں حاضر تھا، وہیں حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی کے اوصاف و کمالات کا شہرہ اس کے کانوں تک پہنچا اور اس کے دل میں شیخ کی عقیدت کی آگ بھڑک اٹھی۔ وہاں سے روانہ ہو کر شیخ محب اللہ الہ آبادی کی خدمت میں اس طرح پہنچا کہ راستہ میں بہت سے درویشوں سے بھی شرف ملاقات حاصل کرتا گیا۔ جب شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھنے پر اس نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو شیخ نے فرمایا "اس مسلک میں اشغال و اعمال کا جو دستور ہے اور وہ یہ ہیں ان پر سختی سے عمل پیرا ہو گے،" اس نے اعمال و اشغال کی جو تفصیل سنی تو کہنے لگا، "اتنی ریاضت اور محنت مجھ سے نہ ہو سکے گی،" شیخ نے دریافت فرمایا "کچھ پڑھے ہو" گویے نے عرض کیا "نہیں" شیخ نے فرمایا "پھر کیسے اپنا مقصود حاصل کر پاؤ گے،" اس کے بعد شیخ نے

دریافت کیا۔ "اچھا تمہیں کسی کام میں مہارت حاصل ہے؟" اس نے عرض کیا۔
"گویّا ہوں۔ نغمہ اور سرود میں کافی مہارت رکھتا ہوں۔" شیخ نے پوچھا "اس فن میں کتنے راگنی راگ ہیں؟" گوّیے کو جو کچھ معلوم تھا اور جو موسیقی کے ماہرین کا معمول تھا بیان کر دیا۔ شیخ نے دریافت فرمایا کہ "ان تمام راگوں کی اصل کیا ہے؟" اس نے کہا "آواز"۔ شیخؒ نے فرمایا کہ "آواز تو ایک ہی ہے پھر یہ راگوں اور راگنیوں میں اختلاف کیسے ہوتا ہے؟" اس نے جواب دیا کہ "اسی آواز کے گھٹاؤ بڑھاؤ سے اختلاف ہوتا ہے۔"

حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی نے فرمایا "بس اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات واحد ہے جو ہر شے میں ساری ہے، چیزوں کا اختلاف اور ان کی کثرت کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ رنگ کا فرق ہے ایک کا رنگ دوسرے سے جدا گانہ ہے بس الگ الگ چیز معلوم ہوتی ہے۔" شیخ الہ آبادی نے اس کے بعد اس گوّیے کو توجہ دی اور چشم زدن میں وحدۃ الوجود کا مسئلہ اس پر منکشف ہو گیا۔ وہ بیہوش ہو کر گر گیا اور اسی حال میں تین روز گذار کر اس کا انتقال ہو گیا۔ خواجہ مودودی نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا "ہر ذی روح کی زندگی اس کے اکل و شرب پر جسے غذا کہتے ہیں موقوف ہوتی ہے، یہ غذا چاہے روحانی ہو یا جسمانی، تو جب اس گوّیے کی غذائے روحی پوری ہو گئی تو وہ بھی ختم ہو گیا۔" ص ۱۸۹

دارا شکوہ | دارا شکوہ کا ذکر اس گوّیے کے ضمن میں آیا ہے، خواجہ مودودی نے دارا شکوہ کے بارے میں بھی اپنے خیالات ظاہر فرمائے ہیں۔

جامع ملفوظ خواجہ حسن کے حقیقی بھائی خواجہ حسین نے عرض کیا کہ "کچھ لوگ دارا شکوہ کو عارفین میں شمار کرتے ہیں؟" خواجہ مودودی نے فرمایا "دارا شکوہ کو اس فن کی صحیح سمجھ بھی نصیب نہیں ہوئی تھی عرفان تک پہنچنے کا کیا سوال، مہمل گو اور خلاف شرع باتیں کرنے والا جس کے نزدیک اسلام اور کفر یکساں تھے صرف نام کا فرق، اس کے خیال میں تھا، چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اسے

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتوں میں سے بندگی شیخ داؤد سے بے حد عقیدت تھی، شاہجہان نے اپنی ایک نوعمر کنیز کو جو بہت خوب صورت تھی اور جس سے اس کو بہت محبت تھی. پھونک جھڑوانے کے لئے (اس لئے کہ وہ کچھ بیمار ہو گئی تھی) بندگی شیخ داؤد کی خدمت میں بھیجا۔ شاہجہاں نے اس کنیز کی کم سنی کی وجہ سے اس پر کوئی تصرف نہیں کیا تھا اور اس کی پوری عمر تک پہنچنے کا منتظر تھا۔ بندگی شیخ داؤد نے جب اس کنیز کو دیکھا تو فریفتہ ہو گئے اور داراشکوہ سے کہلوا بھیجا کہ اگر فلاں کنیز کو جس پر میں فریفتہ ہوں اپنے باپ (شاہجہاں) سے مجھے دلوا دو تو میں اس کے ساتھ نکاح کر لوں؛ داراشکوہ چونکہ ان کا بے حد معتقد تھا فوراً اپنے بیٹے کو اپنے باپ کی خدمت میں بھیجا کہ ان سے اس کنیز کو مانگ لو۔ داراشکوہ کا بیٹا (یعنی شاہ جہاں کا پوتا) گیا اور بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے پوچھا "کیا کہنا ہے؟" اس نے عرض کیا "اگر مان لیا جائے تو عرض کروں"! بادشاہ نے مان لینے کا اقرار کیا تب پوتے نے انکی منظور نظر کنیز کو مانگا، بادشاہ نے کہا "خیر اس کو تو لے جاؤ لیکن آئندہ سے میرے سامنے مت آنا" وہ کنیز کو لے کر اپنے باپ (داراشکوہ) کے پاس آیا اور داراشکوہ نے اسی وقت کنیز کو بندگی شیخ داؤد کی خدمت میں بھیج دیا۔ انھوں نے اس سے نکاح کر لیا۔ اس قصّے کے بیان کرنے کا مدعا یہ تھا کہ داراشکوہ کو اتنی زیادہ عقیدت بندگی شیخ داؤد سے تھی مگر بندگی شیخ داؤد ہمیشہ یہ دعا کیا کرتے تھے اور اپنے مریدوں سے بھی کہتے تھے کہ یہی دعا کریں کہ داراشکوہ کو سلطنت نصیب نہ ہو۔ جب مریدوں نے پوچھا کہ وہ تو اتنی عقیدت رکھتا ہے اور آپ اس کے حق میں یہ دعا کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟" بندگی شیخ نے فرمایا " داراشکوہ شرع کے خلاف ہے۔ اگر اس کو سلطنت مل گئی تو شرع شریف میں بڑا فساد اور رخنہ پیدا کر دے گا" اس کے بعد خواجہ مودودی نے فرمایا کہ شیخ داؤد کو زیبا نہ تھا کہ اس کنیز سے نکاح کریں۔ ایسی حرکت درویشی کے مقام سے کوسوں دور ہے، نواب محبت خاں نے عرض کیا " اس سے عشق تھا اس لئے مجبور ہو گئے"، خواجہ مودودی نے فرمایا۔ " درویش کو حق سبحانہ کے عشق کے علاوہ ماسوا سے عشق کرنیکا

کیا حق ہے؟" ص۳۴۹

ایک دوسرے موقعہ پر مولوی برکت اللہ جون پوری نے داراشکوہ کی تصنیف کردہ سفینۃ الاولیاء کے ایک واقعہ کا ذکر کیا، خواجۂ مودودی نے فرمایا: "داراشکوہ وہ باتیں لکھ جاتا ہے جن کا حقیقت میں وجود ہی نہیں ہے۔ فقیر نے اس کی تالیفات کو کبھی نہیں پڑھا" سلسلۂ گفتگو میں مولوی برکت اللہ جون پوری نے عرض کیا "داراشکوہ نے جو "شطحیات" لکھے ہیں وہ ملاحظہ سے گذرے" خواجۂ مودودی نے فرمایا "نہیں، فقیر نے داراشکوہ کی کتاب مجمع البحرین جب سے دیکھی ہے اس کی تالیف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اس لئے کہ اس کو صوفیا کی اصطلاحات کا علم تک نہیں ہے۔ اس نے شطح کے ایک معنی لکھے ہیں۔ فتوحات مکیہ میں شطح کے جو معنی بیان کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔ "نفس کی رعونت کی حالت میں کلمۂ حق کا صدور" شطح کے جو یہ معنی شیخ ابن عربی نے لکھے ہیں یہی معنی صوفیا کی کتابوں میں بھی ہیں۔ داراشکوہ نے جو معنی لکھے ہیں وہ کہیں اور نظر سے نہیں گذرے،..... ص۵۲۴

علماء کا احتجاج | اس وحدۃ الوجود کے نظریے کی بنا پر خواجۂ مودودی کو ایک دفعہ محکمۂ احتساب سے دوچار ہونا پڑا۔ جامع ملفوظ خواجہ حسن کا بیان ہے کہ معتبر روایتوں سے میں نے سنا ہے کہ جب زبدۃ العرفاء (خواجۂ مودودی) الہ آباد میں قیام پذیر تھے۔ ایک روز عالم بے خودی و سُکر (بے خبری) میں ایک غزل ارشاد فرمائی جس کے دو تین اشعار یہ ہیں:

صوفی باصفا منم عرش منم سرا منم ارض منم سما منم بندہ منم خدا منم
بے من و بے تو من توام، در من و در تو تو منی نے من و نے تو در میاں را منم و شما منم
من کہ علیِ اکبرم مظہر نور حیدرم گرچہ بہ جرم اصغرم جام جہاں نما منم

اطراف کے علما نے خواجۂ مودودی کے ساتھ اس غزل کی بدولت بے ادبی کرنے کا ارادہ کیا اور قاضی القضاۃ کے پاس دوڑے گئے جو اس زمانے میں بادشاہ وقت کے ساتھ رہتا

تھا، اور بادشاہ وقت کا بڑا ڈیرہ ایک عرصے سے الہ آباد ہی میں تھا، علمار نے قاضی القضاۃ سے مافی الضمیر بیان کیا۔ وہ خواجہ مودودی کے احوال سے پوری طرح باخبر تھا اور پوری عقیدت رکھتا تھا، اس نے علمار سے کہا: "عارفین کے احوال میں مزاحمت مناسب نہیں ہے"۔ اس کے بعد قاضی نے کہا "اوّل بات یہ کہ یہ خواجہ مودودی کا قول ہی نہیں ہے جو آپ لوگ کہہ رہے ہیں، ان کا ظاہر شریعت سے اور باطن شریعت سے آراستہ ہے (وہ ایسی بات کیسے کہہ سکتے ہیں) اگر مان لیا جائے کہ ان ہی کے یہ اقوال (اشعار) ہیں تو کسی خاص "حالت" اور کسی "خاص مقام" کی سیر کے دوران انھوں نے کہے ہوں گے، اور اگر آپ لوگوں کا کہنا مان بھی لیا جائے تو اس صورت میں آپ کیا فرمائیں گے اگر خواجہ مودودی نے یہ کہا "میں نے تو یہ اشعار نہیں کہے ہیں" اور انھوں نے انکار ہی کر دیا؛ علما کسی طرح نہ مانے اور قاضی القضاۃ کا پیچھا اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک کہ وہ خواجہ مودودی کے پاس آ نہیں گیا۔ علما نے اب خواجہ سے غزل کا مطلع پڑھ کر پوچھا "یہ آپ کا کہا شعر ہے؟" خواجہ کو معاملے کی کوئی خبر نہ تھی۔ انھوں نے فرمایا "میں نے نہیں کہا ہے" قاضی القضاۃ نے علمار کی طرف دیکھا اور بولا "سن لیا جو میں کہہ رہا تھا"۔ اس کے بعد خواجہ مودودی نے کہا "یہی سہی کہ میں نے کہا ہے تو اس میں برائی کیا ہے؟" علما نے کہا "خدا جو دنیا کو پیدا کرنے والا ہے اس کا نام اس کی پیدا کی ہوئی کسی فنا ہو جانے والی شئے کو دینا خلاف شرع ہے"۔ خواجہ نے فرمایا "خدا بمعنی خداوند ہے اور اس لفظ کا غیر خدا کے لئے استعمال بہتوں سے وقوع میں آیا ہے جیسا کہ نفحات الانس میں ابوسعید خرانہ کے احوال میں شیخ الاسلام نے کہا ہے "وے اگرچہ خویشتن را شاگردانِ جنید فرامی نمود اما بار خدائے جنید بود" (وہ اگرچہ اپنے کو جنید بغدادی کے شاگردوں میں سمجھتے تھے لیکن وہ جنید کے خداوند تھے) تو ایسی صورت میں (جب "خدا" بمعنی خداوند کا استعمال بہتوں سے وقوع میں آیا ہے) اس شعر میں کوئی خاص برائی نہیں رہتی بلکہ نفحات میں جو ہے وہ تو اس شعر سے بھی بڑھ کر ہے اس لئے کہ "بار خدا" کا کثرت استعمال میں ذات خداوندی کے لئے بولا جاتا ہے، عبدالغفور (لاری)

سے نے حاشیہ میں (جو نفحات الانس پران کا ہے) لکھا ہے کہ "یار" کے معنی غالب کے ہیں اور "خدا" کے معنی خداوند کے ہیں۔۔۔ " صفحہ ۳۸۶

حضور انور صلعم کا تصور "میں (جامع ملفوظات خواجہ حسن) حاضر خدمت تھا ایک زن بازی گر (نٹنی) حجرہ شریف کے دروازے پر آئی اور گانے لگی سے

ہوسانورا موری گلی مت آیو یاروں کی نیناں گھایو

خواجہ مودودی کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا، فرمانے لگے "جب کبھی موجودہ زمانے میں رائج موسیقی کے کسی بھی انداز میں کوئی شخص "سانورا" زبان سے ادا کرتا ہے تو حضور انور (رسول خدا) صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حلیہ اور صورت کے تصور میں گم ہو جاتا ہوں اس وقت بجز جمال باکمال آل سرور علیہ السلام، آئینہ خیال میں اور کسی چیز کا عکس نہیں نظر آتا"۔۔۔۔۔۔۔۔۔ چوں کہ خواجہ مودودی کا معمول تھا کہ خواتین پر خواہ وہ پردہ نشین ہوں یا نہ ہوں دوبارہ نظر نہیں ڈالتے تھے اسی بنا پر عورتوں کا گانا بھی نہیں سنتے تھے۔ سوائے اس صورت کے کہ مستورات میں ہو۔ اس لئے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) ازواج مطہرات کے درمیان خواتین کے نغموں سے قریب ہوئے ہیں۔

ایک روز ایک رقاصہ آئی، اس وقت خواجہ مودودی مستورات کے درمیان تشریف رکھتے تھے، اس نے آپ کے سامنے گانا شروع کر دیا:

مینو چھٹک دے گیا سانورا، سو پیارا میرا، لعل لعل چیرا باندھوں سبز دوشالہ

وارے میاں تو میرا، سولی وار دے سانورا الخ

خواجہ مودودی نے فرمایا "سانورا" اشارہ ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف کہ آپ گندم گوں تھے انتہائی ملاحت (نمکینی) کے ساتھ خود حضور صلعم نے فرمایا ہے "انا املح واخی یوسف اصبح" (میں ملیح ہوں اور میرے بھائی (حضرت) یوسف ؑ صبیح تھے) اور "لال چیرا" اشارہ ہے امر توحید کی طرف کہ یہ امر "خوں ریز" ہے۔ اور

"سبز دوشالہ" ان امر و نہی کی طرف اشارہ ہے جو آنحضرتؐ لائے تھے ....." ص ۳۸۸

کبیر کا دوہا | اس گفتگو کے دوران کہ سیر سلوک میں دو حالتیں پیدا ہوتی ہیں، ایک یہ کہ خود حق سبحانہ میں فنا ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ حق کو اپنے میں گم پائے اور یہ کیفیت قرب نوافل کی مستلزم ہے، شیخ مودودی نے کہا "کبیر جلاہے کا اسی مطلب کا ایک "دوہرا" ہے ؎

آپ کو مار جگت کو مارا نیک ـــــ رام پہ باہی

بھرم کی مونڈی کاٹ کے سادھو ہم بھی سپاہی ،" ص ۱۶۱

مشرکوں کے میلے | ...... اس کے بعد یہ گفتگو ہونے لگی کہ کفار کے میلوں میں جانا جائز ہے یا نہیں۔ خواجہ مودودی نے فرمایا" ظاہر شرع میں تو ممنوع ہے۔ مگر بعض مشائخ نے ہندوؤں کی پرستش گاہوں (مقدس مقاموں) میں قدم رنجہ فرمایا ہے چنانچہ شیخ (سید) عبدالرزاق ہانسویؒ اور شیخ عبدالرشید جون پوری قدس اللہ سرہما ماگھ کے میلے میں الہ آباد میں ہندوؤں کے مجمع میں تشریف لے گئے ہیں، اور شیخ (سید) عبدالرزاق (ہانسوی) حبس نفس کے طریقے کی تربیت حاصل کرنے بعض جوگیوں کے یہاں تشریف لے گئے ہیں، فقیر نے یہ بات مولانا جمال الدین احمد ابن شیخ افضل الہ آبادی سے سنی ہے مولانا جمال نے شیخ (سید) عبدالرزاق (ہانسوی) کی زیارت کی تھی، شیخ ہانسوی جب الہ آباد تشریف لے گئے تھے تو مولانا جمال سے ملنے کے لئے انکے مدرسے گئے تھے۔ شیخ عبدالرشید جون پوری کے مریدوں میں سے کسی نے ان سے دریافت کیا کہ باوجود اس شرع کے پاس و لحاظ کے اس میلے (ماگھ کے میلے) میں کس لئے تشریف لے گئے فرمایا" اس لئے کہ نمونۂ قیامت میری نگاہوں کے سامنے آجائے۔ یہیں سے دنیا کی بے بنیادی پر نظر جاتی ہے اس لئے وہاں کی سیر کرتا ہوں۔"

اس کے بعد خواجہ مودودی نے فرمایا کہ ایک درویش کا ایک لڑکا تھا جو اچھی خاصی اہلیت رکھتا تھا۔ لڑکے کے دوستوں نے محفل غنا اور رقص آراستہ کی اور لڑکے کو مدعو کیا اس نے اس خیال سے انکار کیا کہ کہیں یہ خبر درویش تک گئی تو برا ہوگا، جب دوستوں نے

بہت اصرار کیا تو وہ محفل میں شریک ہوگیا اُس وقت بہروپیہ (نقال) بھیس بدل بدل کر تماشا دکھا رہا تھا، درویش کو بیٹے کے جانے کی خبر لگ گئی۔ بلا کر پوچھا کہ تم بھی اس محفل میں شریک تھے؟ اس نے اقرار کیا اس لئے کہ بزرگوں کے سامنے جھوٹ کا گذر نہیں، پوچھا "جب تم وہاں گئے تو تم نے کیا دیکھا؟" بیٹے نے جواب دیا کہ "ایک آدمی کو دیکھا جو بھیس بدل بدل کر آتا تھا حالانکہ وہ ایک ہی آدمی تھا" درویش نے جواب سنا اور نعرہ مار کر بے ہوش ہوگیا۔ جب ہوش میں آیا تو اس نے بیٹے سے کہا "جب تجھے یہ سمجھ حاصل ہے تو پھر ایسی چیزوں کے دیکھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔" صفہ ۶

حضور انورؐ اور فارسی ...... فرمایا "بعض علما کا خیال ہے کہ جناب حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فارسی زبان میں گفتگو فرمائی ہے۔ لیکن قاموس کے مصنف مجدالدین فیروزآبادی نے اپنی کتاب "سفرالسعادت" میں لکھا ہے کہ اس سلسلے میں جتنی حدیثوں کا حوالہ یہ لوگ دیتے ہیں ان کی صحت ثابت نہیں ہے"۔ فقیر (جامع ملفوظ خواجہ حسن) نے عرض کیا کہ افغانی علماء کی لکھی بعض کتابوں میں درج ہے کہ جناب آں سرور صلی اللہ علیہ وسلم نے افغانی زبان کے بعض الفاظ بھی ارشاد فرمائے ہیں، فرمایا "اگر اخوند درویز (ایک افغانی مصنف) نے لکھا ہے تو صحیح ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ وہ بادیانت اور پابند شریعت آدمی تھے۔"

باقی

زجاجۃ المصابیح

مؤلفہ حضرت مولانا ابوالحسنات سید عبداللہ شاہ حنفی حیدرآبادی کتاب زجاجۃ المصابیح مولانا نے پانچ جلدوں میں مشکوۃ المصابیح کے اسلوب پر حنفی نقطۂ نظر کی پوری رعایت کے ساتھ احادیث نبوی کا مستند ذخیرہ شائع کیا ہے۔ فقہ حنفی پر اعتراضات کے مدلل جواب اور احادیث کی صحیح تعبیر کے بعد حنفی مسائل کی وضاحت کے سلسلہ میں حواشی بھی نوٹ فرمائے ہیں احناف کے لئے احادیث کا یہ مجموعہ بے نظیر اور نادر تحفہ ہے۔ کتاب عرصے سے نایاب ہے چند نسخے حاصل ہوگئے ہیں جلد طلب فرمایئے۔ قیمت ... ساٹھ روپے

شرعی احکام کے لئے توقیت کا معیار

از:- محمد برہان الدین سنبھلی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

اسلامی تعلیمات سے معمولی واقفیت رکھنے والوں پر بھی یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ تمام احکام شرعیہ کا دارومدار، فطری اور سادہ طریقوں پہ رکھا گیا ہے۔ اسلام کی ہمہ گیری کا یہی تقاضہ بھی ہے۔ کیوں کہ مصنوعی آلات اور فنی چیزیں ہر جگہ مہیا نہیں ہوسکتیں یا اُن کا فراہم ہوجانا یقینی نہیں ہوتا۔

اگر ایسی چیزوں پہ احکام کا دارومدار رکھ دیا جائے تو وہ بہت سے لوگوں بلکہ اکثریت کے لئے ناقابل عمل بن جائیں، چونکہ "اسلام" کے مخاطب اسود و احمر، شہری و دیہاتی، آبادیوں سے دور اور وسائل آسودگی سے مہجور، صحرا نورد و بادیہ نشین، خلا باز و کوہ پیما، یعنی ہر جگہ، ہر طبقہ اور ہر طرح کے لوگ ہیں، اس لیے اس کے قوانین میں سب کی ہی رعایت کی جانی چاہیئے" اسی بنا پر عمل کے لئے وہ طریقے بتائے گئے جن کا حصول تمام لوگوں کے لئے آسان ہو اور کسی کے لئے بھی عمل کرنا تکلیف مالا یُطاق کا مصداق نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کے وہ احکام جن کا تعلق خاص وقت سے ہے۔ (نماز وغیرہ) ان کے لئے سورج کے مختلف حالات واثرات کو (یعنی طلوع وغروب اور اس کے مابعد وماقبل کے اثرات) کو معیار بنایا گیا ہے۔ اسی طرح "مہینوں" سے وابستہ امور کے لئے چاند کی رویت کو (چاند کے افق پر موجود ہونے کو نہیں) مدار حکم قرار دیا گیا۔ کیوں کہ سورج وچاند ہی روشنی کے وہ منارے ہیں جن کی تابانی وضیاء پاشی اور ان کے وجود سے سارا عالم اور اس کا ہر ہر گوشہ منور ومستفید ہو رہا ہے اور ان کا اثر ہر جگہ

پہونچ رہا ہے۔ " ھوالذی جعل الشمس ضیاءً والقمر نورًا وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب ما خلق اللہ ذلک إلا بالحق "۔ ؎۱

چنانچہ رمضان وعید کی آمد و رفت کی تعیین کے لئے بھی صحیح احادیث میں وہی فطری اور سادہ اصول بتایا گیا ہے۔ جو اسلام کی روح کے عین مطابق ہے۔ کہ فنی چیزوں کی فراہمی، آلات رصدیہ اور علم حساب کی احتیاج کے بغیر اس مسئلہ کو حل کیا جائے اس لیے یہ حکم دیا گیا۔

"صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ فإن اغمی علیکم فاقدروا لہ ثلثین" ؎۲

مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو کسی پریشانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں، نہ دوربین و دیگر آلات رصدیہ و قواعد حسابیہ سے مدد لینے کی حاجت، بس جب چاند (۲۹ تاریخ کو) نظر آجائے تب روزہ رکھنا شروع کردیں (اگر رمضان کا چاند ہے) اور عید کرلیں (اگر عید کا مہینہ ہے) اور نظر نہ آئے تو تیس دن پورے کرنے کے بعد اگلا دن اس کے لیے خود ہی متعین ہے۔ اب اس کی بھی ضرورت نہیں کہ چاند دیکھا جائے۔

اور پھر مزید آسانی یہ کہ ہر شخص پر چاند دیکھنا لازم نہیں کیا بلکہ بتا دیا گیا کہ اگر ۲ ایک (عید کے لیے کم از کم ۲) معتبر و دیندار مسلمان (بحالت ابر و غبار) چاند دیکھ کر گواہی دیدیں تو سب کے لیے یہی کافی ہے۔ اور محض اتنی سی بات سے مہینہ کی آمد ثابت ہوجائیگی۔ لہٰذا اس کے تقاضے پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔

؎۱ سورہ یونس آیت ۵

؎۲ مسلم شریف صفحہ ۳۴۷ ج ۱۔

اس امر کے لئے حوالے پیش کرنے کی چنداں حاجت تو نہیں ہے۔ (کیوں کہ ہر ذی علم کو اس اصل کا اور اس سلسلے کی احادیث کا علم ہے) تاہم یہاں صرف ایک جلیل القدر اور وسیع النظر عالم (محی الدین نووی رحمۃ اللہ علیہ) کا قول پیش کیا جارہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

(قولہ صلی اللہ علیہ وسلم صوموا لرویتہ وافطروا لرویتہ) المراد رویۃ بعض المسلمین ولا یشترط رویۃ کل انسان بل یکفی جمیع الناس رویۃ عدلین وکذا عدل علی الاصح ھذا فی الصوم واما الفطر فلا یجوز لشہادۃ عدل واحد علی ہلال شوال عند جمیع العلماء الا اباثور[1]

غور فرمایئے! حدیث مذکور میں فیصلہ اور اس کے بعد عمل کرنے کا دارومدار چاند کی رویت پر رکھا گیا ہے۔ چاند کے افق پر محض موجود ہونے کو معیار نہیں بنایا گیا۔ گہری نظر سے دیکھا جائے تو حدیث کے الفاظ (اغمی علیکم، غمی علیکم، غبی علیکم) سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ بالکل ممکن ہے کہ چاند افق پر موجود ہو مگر نظر نہیں آئے (کسی علت کی وجہ سے) دریں صورت یہی حکم ہے کہ تیس[30] کی گنتی پوری کی جائے (اکملوا عدۃ ثلاثین[2]) حدیث کی مشہور کتاب صحیح ترمذی میں موجود ایک حدیث کے الفاظ سے یہ پہلو اور نمایاں ہو گیا ہے۔ دیکھئے شارع نے فرمایا:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تصوموا قبل رمضان صوموا لرویتہ وافطروا لرویتہ فان حالت دونہ

---

[1] مسلم شریف مع شرح للنووی ج صـ ۳۴۷ ج ۱۔ ناشر کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

[2] بخاری صـ ۲۵۶ ج ۱۔

غیایۃ[1] فاکملوا ثلثین یوما[2]

(یعنی رمضان کی آمد سے قبل روزہ نہ رکھو۔ چاند دیکھنے کے بعد روزہ رکھو اور چاند نظر آنے کے بعد عید مناؤ۔ اگر چاند نظر آنے میں کوئی حجاب حائل ہو جائے تو تیس ۳۰ دن پورے کر لو)

خط کشیدہ الفاظ پر بار بار نظر ڈالئے اور غور فرمایئے ان الفاظ سے کیا اس کے علاوہ کوئی اور مفہوم بھی نکل سکتا ہے کہ چاند (افق پر تو موجود ہے لیکن اس کے) نظر آنے میں بادل یا کوئی اور پردہ حائل ہو گیا اس وجہ سے دیکھا نہ جا سکا) اس حالت میں بھی یہی حکم ہے کہ تیس ۳۰ دن پورے کئے جائیں ان امور سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ اصل چیز رویت ہے نہ کہ "وجودِ ہلال بر افق"

ان وجوہ کی بنا پر بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ ہوائی جہاز سے بادل کے اوپر چاند دیکھنا یا جنتری کی بنیاد پر یا اور کسی آلہ کے ذریعہ بتکلف اس پر زور لگانا کہ کسی طرح چاند ہو جائے یا حسابی قواعد اور علم ہیئت کے اصول سے ہلال کا ثبوت مان کر اس کے مطابق عمل کرنا یہ تمام طریقے روحِ شریعت سے میل نہیں کھاتے۔ بلکہ مؤخر الذکر طریقے کو "رویت" کے باب میں گویا ناقابل اعتبار قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں موجود ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے:۔ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ انہ

---

[1] "الغیایۃ"۔ کل ما ظل الانسان فوق رأسہ کالسحابۃ ونحوھا (قاموس ربع رابع ص۳۸۲ مطبع نول کشور لکھنئو) "فان حالت (دونہ غیایۃ) ای دون الھلال سحابۃ او غبرۃ ھی بتحتیتین کلما أظلک (مجمع بحار الانوار ص۵۱ ج۔۳ "الغیایۃ" کل ما اظل الانسان کالسحابۃ او الغبرۃ (المنجد مادہ غي ص۵۶۵)

[2] ترمذی ص۱۰۲ ج۔۱ ناشر مکتبۂ رحیمیہ دیوبند۔

قال أنا امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب الشہر ھکذا وھکذا۔ یعنی مرۃ تسعاً وعشرین ومرۃ ثلثین [۱]

احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور شارح علامہ طیبیؒ اس حدیث کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں۔ إن الاستقصاء فی معرفۃ الشہر لا إلی الکتاب والحساب کما علیہ اہل النجامۃ۔ [۲]

شرح حدیث کے سلسلہ میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ یوں رقمطراز ہیں۔ [۳]

"إنما بالغ فی البیان مع الاشارۃ المذکورۃ لیبطل الرجوع إلی ما علیہ الحساب والمنجمون"

ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کی شرح بایں الفاظ فرمائی۔

وإن العمل ما یعتادہ المنجمون لیس من ھدینا وسنتنا بل علمنا یتعلق برؤیۃ الھلال فانا نراہ مرۃ تسعاً وعشرین ومرۃ ثلثین۔ [۴]

پوری امت میں صرف چند اکابر سے اصول حساب پر اعتماد کر کے فیصلہ رویت کرنے کی بات منقول ہے، مگر ان میں سے بعض کی طرف اس قول کی نسبت ہی محل نظر ہے جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں نقل کیا ہے:۔

قال ابن عبد البر لا یصح عن مطرف واما قتیبۃ فلیس ھو ممن یعرج علیہ فی مثل ھذا۔ [۵] اس طرح لے دے کے اس کے قائل بس اب صرف ایک دو فرد

---

[۱] بخاری شریف ص ۲۵۶ ج۔۱ مسلم شریف ص ۳۴۷ ج۔۱

[۲] مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ص ۲۴۳ ج۔۴ مکتبہ امدادیہ ملتان۔

[۳] ایضاً [۴] ایضاً

[۵] فتح الباری ص ۱۰۴ ج۔۴

اتے ہیں۔

(ابن سریجؒ، وسبکیؒ) سوان کی بات جماعت علماء نے رد کردی (حدیث نبی کی وجہ

ہے) جیساکہ علامہ ابن عابدینؒ نے ذکر کیا لا یعتبر قولهم (قول الموقتين) بالاجماع

...... ان الشارع لم يعتمد الحساب بل الغاه بالكلية[۱] خلاصہ یہ کہ حساب، یا

یگر آلات پر اعتماد شرعاً معتبر نہیں ہے۔ رویت کے لئے غیر ضروری تکلف سے بچنے کا یہ مطلب

ہیں ہے کہ لوگ گھروں میں بیٹھے رہیں اور چاند دیکھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھیں، حالانکہ رسول

لله صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند دیکھنے کی تاکید فرمائی ہے اور رمضان المبارک کے چاند کا،

عبان سے ہی اہتمام کرنے کا حکم دیا۔

"احصوا هلال شعبان لرمضان"[۲]

اس لئے سادہ طریقوں سے چاند دیکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے اور جس شخص کو چاند

ظر آجائے اس کی شرعی ذمہ داری ہے کہ مفتی یا قاضی یا ہلال کمیٹی کے روبرو جاکر شہادت

ے اور اپنا فرض ادا کرے۔

شرعی طریقہ پر رؤیت ثابت ہوجانے کے بعد اس کے مطابق عمل کرنا ضروری

ہے اور ممکن ذرائع سے اس فیصلہ کا اعلان، اور اس کی اشاعت بھی مطلوب ہے تا

کہ لوگ (جو رویت کے بعد عمل کے مکلف ہیں) عدم علم کی بنا پر امتثال حکم سے

نہ جائیں۔

موجودہ زمانے میں نشر واشاعت اور خبر رسانی کے ذرائع بہت متنوع اور کثیر التعداد

یں۔ ان تمام وسائل کا شرعی حکم دریافت کرکے عوام کو اس سے آگاہ کرنا علمائے عصر کی ذمہ داری

---

[۱] ردالمحتار ص۹۲ ج۔۲ مطبوعہ دیوبند۔ پوری تفصیل کے لئے دیکھئے ہدایۃ المجتہد ص۲۲۵ ج ۱ ماخذ مذکورہ

[۲] ترمذی شریف ص۱۴۰ ج ۱ مطبع رحیمیہ دیوبند۔

ہے جیسا کہ زمانہ گذشتہ میں اُس دور کے علماء نے کیا۔

ان ذرائع میں سب سے زیادہ رائج اور ہر جگہ دستیاب ہونیوالا "ریڈیو" ہے اور اس کی یہی ہمہ گیری ایک طرح سے ابتلاء اور الجھن کا باعث بن گئی ہے اس لئے سب سے پہلے اسی کے بارے میں ایک دوٹوک فیصلہ کرنا ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں احقر کا ایک تفصیلی مضمون ماہنامہ "برہان" اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۰ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں زیر بحث مسئلہ کے ہر گوشہ کا علمی و تحقیقی جائزہ لے کر عملی راہیں بھی تجویز کی گئی ہیں اہل علم اس پر متفق ہو جائیں تو مسئلہ کے حل کی قابل عمل شکلیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔

ایک غلط فہمی تمام عالم کے مسلمانوں، بالخصوص عالم عرب کے بسنے والوں کا عام رجحان بلکہ ان کی دلی آرزو یہ ہوتی ہے کہ پوری دنیا میں ایک ہی دن عید منائی جائے اور ایک ہی روز رمضان المبارک کا آغاز ہو۔ اور اس "وحدت" کو اتحاد و اخوت اسلامی کا اہم ذریعہ بلکہ ناگزیر ضرورت خیال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ بنظر غائر دیکھا جائے تو (دلوں کو جوڑنے کے لئے) یہ "وحدت" نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں بلکہ اس کا حصول ناممکن ہے۔ اور محض اس "وحدت میں اتحاد و اتفاق کا راز" سمجھنا اسی سطحیت پسندی اور جذباتی اندازِ فکر کا مظاہرہ کرنا ہے جس کا مدتوں سے تجربہ ہو رہا ہے۔ "خیر القرون" میں آج سے کہیں زیادہ قلوب جڑے ہوئے اور مسلمان گویا یک جان چند قالب کا حقیقی مصداق تھے، مگر حضرت عبداللہ رضؓ ابن عباسؓ نے اہل شام کی رویت کی بنا پر مدینہ میں فیصلہ کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔[1] اس کے باوجود (دونوں علاقوں کے رہنے والوں کے) نہ دلوں میں فرق آیا اور نہ "حبر الامۃ" کے اس فیصلہ کو کسی نے تشتت و افتراق کا سبب سمجھا۔

---

[1] دیکھئے مسلم شریف ص ۳۴۷ ج ۱، ترمذی ص ۸۰ ج ۱، نیل الاوطار ص ۲۰۶ ج ۴

اسی طرح[1] فقہائے کرام رضی اللہ عنہم و رحمہم اللہ کو (ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے غم میں گھلنے والوں" سے کہیں زیادہ ان حضرات کو امت کے قلوب جوڑنے اور ان میں اتحاد پیدا کرنے کا خیال تھا، مگر بایں ہمہ) اختلاف مطالعہ کی حقیقت تسلیم کرنے اور "ایک جگہ کی رویت کا حکم دوسری جگہ لازم نہ ہونے" کا فیصلہ فرماتے ہوئے انہیں یہ خطرہ پیش نہیں آیا کہ اس سے "اتحاد" میں رخنہ پڑ جائے گا اور گویا اتفاق کا "اہم رشتہ" ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔

علاوہ ازیں یہ کہ (جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے) سارے عالم میں ایک ہی دن "عید منانا" ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ اس دنیا کے مشرق و مغرب، اور اس کے کناروں کے درمیان اتنا طویل فاصلہ ہے کہ ایک گوشہ میں مثلاً جس وقت رویت ہلال ہو رہی ہوتی ہے (غروب آفتاب کے بعد) تو دوسری جگہ اسی ساعت طلوع آفتاب بلکہ نیم روز کا سماں ہوتا ہے۔ اب بتائیے! کہ جس حصہ میں — آفتاب کے چھپ جانے کے بعد — "ہلال عید" نظر آیا اس کی بنا پر اگر ایسی جگہ عید منانے کا فیصلہ کیا گیا جہاں آفتاب ڈھل چکا ہے اور ظہر کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ یعنی نماز عید کا وقت ختم ہو چکا ہے — تو کس طرح اس فیصلہ کو اس دن روبہ عمل لایا جائے گا؟؟

یہاں ایک اور بات قابل توجہ ہے کہ عید محض ایک "تہوار" ہی نہیں ہے جس میں صرف شان و شوکت کا مظاہرہ کیا جائے اور رنگ رلیاں منائی جائیں، اور کچھ نہ کیا جائے اگر صرف یہی حیثیت ہوتی تو واقعی اس کے لئے ایک دن کو مخصوص کر لینا، مناسب بلکہ شاید ضروری ہوتا۔ مگر اسلام! کہ جس کی حقیقت میں انقیاد، اطاعت اور عبادت داخل ہے۔ اس کی

---

[1] زیلعی شرح کنز ص ۳۲۱ ج ۱، بدائع الصنائع ص ۸۳ ج ۲، مجمع الانہر ص ۲۳۹ ج ۱ تفصیل کے لئے دیکھئے احقر کا مضمون "رویت ہلال ص ۳۸۳ برہان دسمبر ۱۹۷۰ء

مقرر کردہ کوئی چیز ایسی ہو ہی نہیں سکتی جس میں شان عبدیت کا مظاہرہ نہ ہو۔ اس لئے عید محض "اسلامی تہوار" ہی نہیں بلکہ ایک عبادت بھی ہے اور عبادت کی شان یہ ہے کہ معبود جب حکم دے اس وقت کی جائے نہ کہ "جب عابد کا دل چاہے"۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ معبود کی طرف سے (اس کے رسولؐ کے ذریعہ) جو حکم دیا گیا وہ یہ ہے،

"لا تصوموا حتی تروا الھلال ولا تفطروا حتی تروہ فان غم علیکم فاکملوا العدۃ"[1] یعنی تم چاند دیکھے بغیر روزہ نہ رکھو اور نہ عید کرو، (۲۹ تاریخ کو) چاند نظر نہ آئے تو تیس دن پورے کرلو۔

غور فرمایئے! داعیٔ فطرت (علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ) نے مسئلہ کو کتنا آسان اور سہل بنا دیا کہ راہ میں نہ کوئی پیچ وخم رہا نہ گرد وغبار۔ اور ہم کو ہر غیر ضروری مشقت سے بچا دیا گیا۔

---

[1] بخاری صہ ۲۵۶ ج۔ ا مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی۔

کتب خانہ سعیدیہ

حیدرآباد کا ایک قدیم اور بین الاقوامی شہرت کا حامل کتب خانہ

(محمد افضل اقبال ایم۔ اے۔ عثمانیہ)

"کتب خانہ سعیدیہ، حیدرآباد" اس معزز اور محترم ہستی کی مقدس امانت ہے جن کا خاندان مسلسل اٹھارہ پشت سے مذہبی، علمی، ادبی اور سماجی خدمات میں بہت پیش پیش رہا ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد سعید خاں صاحب جن کے علمی ذوق کی یادگار یہ نایاب کتب خانہ ہے اس عربی النسل خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کے افراد خدمت خلق کا جذبہ لئے براہ راست عرب سے ہندوستان کے ساحلوں پر توطن اختیار کیا تھا اس خاندان کے کئی افراد قاضی، فقیہ اور محدث رہے ہیں۔ ان علمی و مذہبی خدمات کے علاوہ اپنے وقت میں ملک کی اہم خدمات کے قابل بھی سمجھا جاتا رہا ہے۔ سفارت، دیوانی قاضی القضاۃ کی اہم خدمات بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ مفتی محمد سعید خاں صاحب کے اجداد میں فقیہ عطا احمد، فقیہ مخدوم اسحاق، فقیہ مخدوم اسمٰعیل، فقیہ ابو محمد، قاضی احمد قاضی محمود کبیر، قاضی رضی الدین مرتضیٰ، قاضی حسین لطف اللہ، قاضی محمد عبداللہ شہید قاضی نظام الدین احمد صغیر، محمد غوث شرف الملک، مدار الامراء عبدالوہاب مختار الدولہ اور امام العلماء، قاضی بدر الدولہ محمد صبغۃ اللہ قابل ذکر ہیں۔ غرض اس خاندان کی امتیازی خصوصیات دین و دنیا کے مراتب ہیں جو عام حالتوں میں سب کو حاصل نہیں ہوتے۔

شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد سعید خاں صاحب ۱۲۴۷ھ میں شہر مدراس میں پیدا ہوئے۔

آپ قاضی بدرالدولہ کے بڑے فرزند اور مولوی محمد غوث شرف الملک کے پوتے تھے ۔ نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول کی خواہش پر ۱۲۸۶ھ میں مفتی محمد سعید خاں صاحب مدراس سے حیدر آباد آئے اور یہاں رکن اول مجلس مرافعہ نظامت عدالت ہنصرم چیف جج اور مفتی عدالت العالیہ کے معزز عہدوں پر فائز رہے ۔ مملکت حیدر آباد کی قومی اور ملی خدمات میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ جامعہ نظامیہ کے علاوہ دائرۃ المعارف کی آبیاری میں نواب عماد الملک مرحوم کے ساتھ تعاون کیا اور سالہا سال تک اس کی مجلس انتظامی اور علمی کمیٹی کے رکن رہے یہی نہیں بلکہ اپنی نادر مخطوطات سے استفادہ کا بھی موقع دیا ۱۳۱۲ھ میں حیدر آباد ہی میں آپ کا انتقال ہوا ۔ مسجد الماس چادر گھاٹ حیدر آباد میں مدفون ہوئے آپ کے انتقال پر تمام عدالتیں بند کی گئیں ۔ سرکاری جریدہ اعلامیہ میں اظہار افسوس کیا گیا اور اس حقیقت کا اظہار کیا کہ خدمت افتار کو آپ کی ذات سے عزت تھی ۔ غرض مفتی صاحب کا علوم ظاہر و باطن میں کمال ، مذہبی شغف اور تقدس اور ان کے نادر علمی ذخیرے نے اُن کے نام کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے ۔

کتب خانہ سعیدیہ مفتی صاحب کی زندگی کا نایاب سرمایہ ہے ۔ حضرت مفتی صاحب نے نہ صرف خاندانی ذخیرۂ کتب کی حفاظت کی بلکہ بہت سی نایاب اور نادر کتابیں خرید کر اپنے ذخیرہ کتب میں اضافہ کیا ۔ یہی نہیں انھوں نے مکہ اور مدینہ کے علمی کتب خانوں میں جو نایاب قلمی مخطوطات تھے ان کی نقلیں آج سے سو سال پیشتر کروائیں اس وقت اس کتب خانہ سعیدیہ میں کئی ہزار نایاب عربی ، فارسی ، اردو ، ترکی اور انگریزی مخطوطات و مطبوعات موجود ہیں ۔

ستمبر ۱۹۳۷ء میں نواب سر نظامت جنگ نے اس کتب خانہ کا اس کی موجودہ عمارت (جام باغ روڈ ۔ حیدر آباد) میں افتتاح فرمایا ۔ اور کتب خانہ سعیدیہ ایک قومی اثاثہ بن کر تمام علمی دنیا کے استفادہ کے لئے عام ہو گیا ۔ کتب خانہ کی موجودہ عمارت

حضرت مفتی صاحب کے بھانجے الحاج حافظ مولوی محمد عبدالعظیم صاحب مرحوم کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھے گی جنھوں نے اپنے ذاتی صرفہ سے ایسی عمارت کتب خانہ کے لئے خریدی وہ زندگی بھر کتب خانہ کے کاروبار اور انتظام میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے بلکہ کتب خانہ کے لئے وقف رہے۔ اپنا تن من دھن کتب خانہ سعیدیہ کے لئے لگا دیا۔ حافظ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے دوسرے بھائی مولوی برہان الدین صاحب مرحوم نے اس کام کو سنبھالا۔ ان کے بعد ڈاکٹر مولوی محمد غوث صاحب ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پی ایچ ڈی (عثمانیہ) نے معتمدی کے فرائض انجام دیئے آج کل الحاج مولوی عبدالغنی صاحب معتمدی کے اعزازی فرائض انجام دے رہے ہیں۔

کتب خانہ سعیدیہ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک طرف ہندوستانی علوم و فنون، ہندوستان کی تاریخ اور ہندوستان کے تمدن اور خود ہندوستان کے قدیم علماء جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شیخ علی متقی ہندی، علامہ بہاری، ملاجیون شیخ علی المہائمی، شیخ احمد سرہندی، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور مولانا عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محلی وغیرہ کے نایاب غیر مطبوعہ اور کم یاب مطبوعہ کارنامے موجود ہیں ان میں کی اکثر و بیشتر کتابیں خود ان مقدس ہستیوں کے مبارک ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف قدیم عرب مورخ ابن عساکر کی تاریخ دمشق، نامور مورخ ابن اثیر کی اسد الغابہ، قدیم مصری مورخ و محدث شہاب الدین ابن حجر العسقلانی کی انباء الغمر فی انباء العمر، محدث دیلمی کی مسند الفردوس، مشہور مصری محدث و مورخ علامہ سیوطی اور نامور فارسی شاعر مولانا جامی کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی کئی کتابیں اس کتب خانہ کی زینت ہیں۔ گلستان سعدی کا ایک دیدہ زیب مصور قلمی نسخہ جو دنیا کے بہترین نسخوں میں سے ایک ہے وہ بھی یہاں موجود ہے۔ مصنفین یا ان کے شاگردوں کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی، چند کتابیں خود بغداد، دمشق، بیروت، قاہرہ، کابل، ہرات اور

طہران میں نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ سلیمان ندوی مرحوم نے تحریر فرمایا ہے
"اس کتب خانہ میں تفسیر، حدیث، فقہ و اصول فقہ کی نادر قلمی کتابوں کا اتنا ذخیرہ
ہے جو میں نے مدینہ منورہ کے سوا اور کہیں نہیں دیکھا"۔

کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد STATE CENTRAL LIBRARY، امپریل
لائبریری کلکتہ (نیشنل لائبریری) میں اس کتب خانہ کی کتابوں سے نقل شدہ نسخے اور
میکروفلم کاپیاں موجود ہیں مجلس اشاعت العلوم، دائرۃ المعارف و احیاء المعارف النعمانیہ
کے مطبوعات کی اشاعت اسی کتب خانہ کے مخطوطات کی بنیادوں پر ہوئی ہے۔
عرب لیگ کے کلچرل مشن نے تقریباً دو درجن نادر کتابوں کے مائیکروفلم حاصل کئے جن میں
سے کئی کتابیں بیروت اور قاہرہ سے شائع ہو چکی ہیں۔ اقوام متحدہ کی علمی، ادبی، سائنسی اور
ثقافتی مجلس (UNESCO) کو بھی اس قسم کے بیس کتابوں کے مائیکروفلم لینے کی اجازت
دی گئی۔

کتب خانہ سعیدیہ اور مدراس کے خاندانی کتب خانہ محمدی میں بیجاپور کے
عادل شاہی اور مدراس کے والا جاہی دور کے فرامین اور خاندانی و حکومتی ریکارڈس
کے ہزاروں کاغذات موجود ہیں جن سے اس دور کے سیاسی، معاشی، علمی اور سماجی پہلو
اجاگر ہوتے ہیں۔ مغلیہ شہنشاہوں میں شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے کچھ فرامین، آصف
جاہ اوّل اور مابعد آصفی حکمرانوں کے فرامین اور نیز مرہٹہ پیشواؤں کے فارسی مکتوبات
بھی یہاں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پر ٹیپو سلطان، لارڈ کلائیو، وارن ہٹسنگ،
کارنوالس وغیرہ کے اصل دستخطی خطوط بھی محفوظ کئے گئے ہیں۔ شاہ جہاں کا ایک فرمان بڑا
قابل دید ہے جس کی لمبائی چھ فٹ ہے۔

اس نوعیت کے نادر اور بے مثال مکتوبات اور فرامین ہندوستان کے طول و
عرض میں شاید ہی کہیں موجود ہوں۔ جن سے تاریخ کا حقیقی اور سچا مواد حاصل

ہوتا ہے۔

کتب خانہ سعیدیہ کی کتابوں کا بڑا حصہ تفسیر حدیث فقہ اور تاریخ کے فنون پر مشتمل ہے۔ اسّی فیصدی کتابیں عربی میں ہیں۔ جب کتب خانہ سعیدیہ اس موجودہ عمارت میں منتقل ہوا تو اس کی ایک جدولی فہرست تیار کی گئی۔ مولوی ناصر الدین محمد فرزند مولانا قاضی عبید اللہ مرحوم نے فقہ کے فن کی فہرست مرتب کی۔ اور باقی تمام علوم و فنون کی فہرست ڈاکٹر مولوی محمد غوث صاحب نے لکھی تھی۔ اس کتب خانہ کا کام اسی فہرست سے انجام دیا جاتا رہا تاآں کہ حال میں حکومت ہند کے مجوزہ نمونہ پر حکومت ہند کی امداد سے انگریزی میں ایک (CATALOGUE —) شائع ہوا ہے۔ اس کی ترتیب بھی ڈاکٹر مولوی محمد غوث صاحب، ایم۔اے، ایل۔ ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ ڈی۔ نے انجام دی ہے۔ اس کیٹلاگ کی رسم اجرائی مرکزی وزیر حکومت ہند جناب فخر الدین علی احمد صاحب کے ہاتھوں جنوری ۷۰ء میں پائی۔

کتب خانہ سعیدیہ کی کتابوں کو چار حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے (۱) اکابر خاندان کی تصنیفات (۲) اکابر خاندان کی نقل کی ہوئی نایاب قلمی کتابیں (۳) قدیم علماء کی خود ان کے ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں اور (۴) قلمی اور مطبوعہ عام کتابیں۔ ہر ایک کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے۔

قاضی محمود کبیر المتوفی ۹۹۵ھ کے زمانے سے اکابر خاندان کی مولفہ کتابوں کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ قاضی صاحب کی تصنیف "شرح تعلیقات محمود بر معاملات گودا" اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے جو ایک سو دس صفحوں کی کتاب ہے۔ اس میں مختلف فقہی جوابات پر تعلیق لکھی ہے اور بعض کے غلط جوابات پر بڑی سخت تنقید کی ہے۔ اس کے علاوہ قاضی صاحب کے فتووں کا مجموعہ بھی اس کتب خانہ کی زینت ہے جو ۹۹۹ھ میں تیار ہوا۔ قاضی محمود کبیر کے فرزند قاضی رضی الدین مرتضیٰ کی فارسی تالیف "تحفۃ الحقیر" فن معانی و بیان کی ایک

مستند کتاب ہے جو عادل شاہی بادشاہ ابراہیم عادل شاہ کے نام پر معنون کی گئی ہے۔
اس تالیف کا ایک نسخہ خود قاضی صاحب مرحوم کے ہاتھوں ۹۹۰ھ کا لکھا ہوا اس کتب خانہ
میں موجود ہے۔ قاضی رضی الدین مرتضیٰ کے پوتے مولوی نظام الدین احمد کبیر کو علی عادل شاہ
ثانی (۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ) سلطان بیجاپور نے اپنا سفیر بنا کر شہنشاہ دہلی جہاں (۱۰۳۶ھ
تا ۱۰۶۹ھ) کے دربار میں بھیجا تھا۔ قاضی نظام الدین احمد کبیر کے پوتے قاضی نظام الدین
احمد صغیر (المتوفی ۱۱۸۹ھ) جو ارکاٹ میں چیف جج (قاضی القضاۃ) کی خدمت پر فائز تھے۔
فارسی میں توریت، زبور اور انجیل کا ترجمہ کیا تھا۔ ان کا یہ فارسی ترجمہ اور اس کے مسودات
کا بڑا حصہ بھی اسی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں بھی اس کا نسخہ موجود ہے
ان کے کئی تصانیف مشہور رہیں ایک عربی رسالہ " انباء الاذکیاء بتجیب الطیب والنسا الی
بسید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم " نہایت محققانہ ہے۔ ان کے پوتے مولوی محمد غوث
شرف الملک دیوان ریاست کرناٹک جو مولانا بحر العلوم فرنگی محلی کے ارشد تلامذہ میں
داخل ہیں۔ ان کی ایک کتاب " نثر المرجان فی رسم نظم القرآن " آٹھ ضخیم جلدوں میں اپنے
فن کی بے مثل کتاب اس کتب خانہ کی زینت ہے۔ اس کتاب کو مجلس اشاعت العلوم
حیدرآباد نے طبع کردایا ہے۔ مولوی غوث شرف الملک کے دو فرزند تھے۔ بڑے فرزند
مولوی عبدالوہاب مدار المہام ریاست کرناٹک تھے۔ آپ فن رجال کے آخری مستند
مولف سمجھے جاتے ہیں۔ عربی اور فارسی میں سولہ (۱۶) چھوٹی بڑی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔
پروفیسر یوسف کوکن صدر شعبہ اُردو فارسی وعربی مدراس یونیورسٹی تحریر فرماتے
ہیں۔ "مولوی عبدالوہاب مدار الامراء کو فن حدیث و اصول اور رواۃ سے بڑی گہری
دلچسپی تھی ان دونوں میں بڑی مہارت پیدا کی تھی جرح وتعدیل رواۃ کے فن میں وہ
امام سمجھے جاتے تھے۔"

نواب شرف الملک کے دوسرے فرزند امام العلماء قاضی الاسلام محمد صبغتہ اللہ

بدر الدولہ اپنے زمانے کے بلند پایہ اور قابل ترین مصنف تھے ۔ فقہ، تفسیر، حدیث، سیرۃ اور سوانح وغیرہ مختلف فنون پر آپ کی تین زبانوں عربی فارسی اور اردو میں (۸۰) تصانیف موجود ہیں ۔ ان میں سے چودہ کتابیں اردو میں ہیں ۔ مفتی صاحب کی بعض کتابیں کتب خانہ سعیدیہ کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں ۔ قاضی بدر الدولہ کی کئی کتابوں کی مانگ اب تک ہے ۔ ان کی کتابوں کے کئی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں اس نوبت پر اس کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ قاضی بدر الدولہ نہ صرف مفسر، محدث، فقیہ اور سیرۃ نگار تھے ۔ بلکہ طبیب اور ہئیت کے بھی ماہر تھے ۔

شیخ الاسلام الحاج مفتی محمد سعید خاں صاحب قاضی بدر الدولہ کے بڑے فرزند تھے ۔ آپ کی تصانیف میں آٹھ کتابیں جو عربی، فارسی و اردو میں ہیں مشہور ہیں ۔ ان کی تفصیل یہ ہے ۔ رسالہ اثبات علم غیب انبیاء (عربی) رسالہ شق القمر (فارسی) تخریج احادیث مجدد الف ثانی (عربی)، التبتنہ بالتنزیہ (عربی) رسالہ اثبات عمل مولود شریف (اردو) ترجمہ شروط الاستنداء (اردو) منہاج العدالت (فارسی) اور فیض الکریم (تفسیر اردو) قابل ذکر ہیں ۔ مفتی صاحب کی یہ سب کتابیں اور اکابر خاندان کی بہت ساری کتابیں ان کے اصلی نسخے اس کتب خانہ میں موجود ہیں جنہیں لکھے ہوئے ایک دو نہیں چار صدیاں گذر گئی ہیں ۔

غرض اکابر خاندان عربی، فارسی اور اردو میں تفسیر، حدیث، فقہ، سیر، عقائد، تاریخ اخلاق، فلسفہ اسلام، ہیئت، قرآن، تورات، اور انجیل وغیرہ پر کتابیں تالیف کیں جن پر وہ بے پناہ عبور رکھتے تھے ۔ ان کی مجموعی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے ۔ ان میں سے بہت سی کتابیں طبع ہو چکی ہیں مگر زیادہ حصہ ابھی غیر مطبوعہ ہے ۔ عربی اور فارسی میں ہی ابتداءً تالیف و تصنیف ہوتی تھی ۔ لیکن بعد میں اردو اور دیگر السنہ میں بھی لکھنا ضروری ہو گیا ۔ حالیہ دور میں پروفیسر ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے خاندانی روایات کا سلسلہ نہ صرف

عربی اردو بلکہ جرمن، فرنچ، ترکی، اطالوی، انگریزی، اور دیگر کئی زبانوں میں مقالے اور کتابیں لکھ کر اور آگے بڑھا دیا ہے۔ ان کے فرانسیسی ترجمہ قرآن کو یورپ میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ اب تک اس کے تین اڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل چکے ہیں۔

کتب خانہ سعیدیہ کے نائب صدر پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف الدین صاحب کے تحقیقی مقالوں کا اردو، فارسی، عربی ہی نہیں بلکہ ترکی، انگریزی، انڈونیشی اور پولش زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔

کتب خانہ سعیدیہ میں دوسری قسم ان کتابوں کی ہے جو بزرگان خاندان نے نقل کی ہیں۔ بیشتر نایاب کتب کی بابت قدیم سے علماء کا طریقہ یہ تھا کہ جن کتابوں پر ان کو دسترس حاصل ہو جاتی تو ان کی نقلیں کر لیتے۔ خاندان کے اکابر علماء نے بارہ پشتوں سے مسلسل ہزاروں صفحے اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں۔ جہاں کہیں وہ جاتے خصوصاً مکہ و مدینہ منورہ کتابوں کی نقل کرنے میں بلا ناغہ روزانہ مصروف رہا کرتے۔ اس طرح اہل خاندان نے جملہ علوم اسلامی کی مستند کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ نقل و کتابت کے ذریعہ اپنے پاس جمع کر لیا۔ چنانچہ نقل کی ہوئی کتابوں میں ہمیں تفسیر، تجوید، حدیث، سیرت، فقہ، کلام، ہیت، منطق، تاریخ وغیرہ مختلف فنون پر ہزاروں قلمی کتابیں ملتی ہیں۔ ان کی بڑی تعداد آج بھی غیر مطبوعہ ہے۔

اکابر خاندان خود تحریر کرنے کے علاوہ کاتبوں کو اجرت دے کر بکثرت کم یاب کتابوں کو ہر جگہ سے نقل کروایا کرتے تھے۔ مفتی محمد سعید خاں صاحب کے کاتب نہ صرف ہندوستان بلکہ مکہ و مدینہ منورہ میں بھی موجود تھے انھوں نے ثمرقند و بخارا سے بھی کتابیں نقل کروا کر منگوائی تھیں۔

کتب خانہ سعیدیہ کے کتابوں کی تیسری قسم خرید شدہ کتابوں کی ہے ان میں

مطبوعہ اور وہ قلمی کتابیں بھی شامل ہیں جنہیں قدیم علماء نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا۔ مفتی صاحب سے دادا نواب شرف الملک پھر ان کے لڑکوں اور پوتوں نے جہاں تک ان کی مالی حالت اجازت دے سکتی تھی۔ نایاب قلمی کتابیں خریدی ہیں۔ اگر وہ ناقص تھیں تو اس کا تکمیلہ خود تحریر کرکے مکمل کیا ہے۔ یہ کتابیں خاندان کا علمی خزانہ ہیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر تفسیر حدیث، فقہ، رجال اور تاریخ کی ہیں لیکن دوسرے علوم وفنون کا ذخیرہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ چند کتابیں چھٹی صدی ہجری اور متعدد ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کی لکھی ہوئی ہیں۔ بعض تو ایسی قدیم بھی ہیں جن پر سنہ لکھا ہوا نہیں ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی، سیوطی، علامہ عینی، مجد الدین فیروز آبادی، مولانا عبدالعلی بحر العلوم مولانا عبدالحق دہلوی اور دیگر اکابر علماء کی لکھی ہوئی یا ان کے پاس پڑھی ہوئی اور درس دی ہوئی کتابیں اس کتب خانہ کی آج بھی زینت ہیں۔ بعض کتابوں پر علماء کی تحریریں اور ان کے آٹوگراف بھی موجود ہیں۔

کتب خانہ سعیدیہ میں متعدد کتابیں اصل مصنفوں کی لکھی ہوئی صرف اسی کتب خانہ میں ہی نہیں بلکہ خاندان کے دوسرے کتب خانوں میں بھی موجود ہیں۔ یاقوت، حضرت شہاب الدین سہروردی، امام نووی، امام ذہبی، علامہ شعرانی وغیرہ کی لکھی ہوئی کتابیں بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ نایاب مطبوعہ کتابیں ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

جس طرح شمالی ہند میں رام پور کا شاہی کتب خانہ اور مشرقی ہند بہار میں خدابخش کا کتب خانہ اہمیت رکھتا ہے۔ اسی طرح جنوبی ہند میں کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد ہے موجودہ کارکنان کتب خانہ سعیدیہ کوشاں ہیں کہ اس کو ایک بڑے اورنٹیل ریسرچ سنٹر میں تبدیل کردیں تاکہ تمام دنیا سے ریسرچ اسکالر اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے یہاں آئیں۔

چند نایاب مخطوطات :- کتب خانہ سعیدیہ کے نایاب مخطوطات جو تفسیر، حدیث، فقہ، رجال، منطق، عقائد وغیرہ پر مشتمل ہیں ناظرین کی دل چسپی کی خاطر یہاں صرف چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱- علامہ ابوالقاسم علی ابن عاکر (المتوفی ۵۷۱ھ، ۱۱۷۶ء) کی مشہور معروف ضخیم تصنیف "تاریخ دمشق" کے آٹھ جز ۱۴۲ تا ۱۵۰ اس کتب خانہ میں موجود ہیں۔ عربی نثر کی اس کتاب کو ابن عاکر نے اپنے درس کے لئے کئی بار استعمال کیا۔ اس پر انھوں نے اپنے مختلف شاگردوں کے نام لکھے ہیں جنہیں اس کا درس دیا گیا۔ ابن عاکر کے فرزند قاسم نے بھی اس نسخے کو جامع مسجد دمشق میں اپنے شاگردوں کو درس دینے کے لئے استعمال کیا۔ اس نسخہ پر قاسم کی دستخط بھی موجود ہے۔

۲- ابوبکر بن علی الخطب البغدادی (المتوفی ۴۶۳ھ، ۱۰۹۲ء) کی مشہور کتاب الاسماء المبھمہ فی الانباء المکھمہ" کی نقل بھی اس کتب خانہ میں موجود ہے۔ فن حدیث کی یہ قلمی عربی کتاب ۵۸۶ھ میں نقل کی گئی اس کے چند صفحے قاضی بدر الدولہ نے نقل کر کے شائع کئے ہیں۔

۳- ابوعیسیٰ محمدؐ ابن عیسی الترمذی کی شمائل ترمذی کی ایک نقل ۹۸۲ھ کی اس کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ جس پر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی دستخط ہے۔ انھوں نے دس بار اپنے شاگردوں کو تعلیم دینے کے لئے یہ نسخہ استعمال کیا۔ پہلی بار ۱۰۰۲ھ میں اپنے لڑکے کو درس دینے کے لئے اور آخری بار ۱۰۴۷ھ میں اسے استعمال کیا۔ اس نایاب نسخہ میں حاشیہ پر شرح بھی لکھی ہوئی ہے۔

۴- علامہ شاطابی (المتوفی ۵۹۰ھ) کی "حمد نا العمانی" بھی یہاں موجود ہے یہ نایاب نسخہ حسن خط میں لاجواب ہے اس نسخہ کا کاغذ دبیز ہے۔ اسے نقل کرنے کی تاریخ کتاب پر درج نہیں ہے۔ لیکن جو سند اس کتاب کے ساتھ منسلک ہے اس سے پتہ

چلتا ہے کہ اسے ۸۶۳ھ سے پہلے نقل کیا گیا کیوں کہ شہاب الدین احمد بھلبو کی نے اس نسخہ کا علامہ سخاوی کے پاس پہلی بار ۸۶۳ھ میں درس لیا پھر بعد میں ایک بار اور ختم کیا۔ علامہ سخاوی نے اس کتاب پر ایک مختصر نوٹ بھی لکھا ہے۔ اور اپنے شاگردوں کو اس موضوع پر درس دینے کی اجازت دی ہے۔ علامہ نے دو بار اس نسخہ کو اپنے شاگردوں کو درس دینے کے لئے استعمال کیا۔

۵۔ ابو محمد غالب بن عطیہ کی مشہور تفسیر القرآن کی ایک جلد یہاں موجود ہے اس میں قرآن مجید کی تفسیر ابتداء سورہ فاتحہ سے آل عمران تک ہے۔ جسے ۶۲۵ھ میں حلب میں عبداللہ الشجاعی نے نقل کیا۔

۶۔ علامہ ابن حجر عسقلانی (المتوفی ۸۵۲ھ) کی لکھی ہوئی "تعدید القوس فی تخریج احادیث مسند الفردوس" کا مشہور نایاب نسخہ بھی یہاں موجود ہے۔ مصنف کا دستخط شدہ یہ نسخہ ۸۳۹ھ میں مکمل ہوا۔

۷۔ قاضی عزیز الدین کی "شرح المواقف" کا نسخہ بھی اس کتب خانہ میں موجود ہے "المواقف علم کلام" پر معیاری اور بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ شرح المواقف ۸۰۷ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کتب خانہ میں جو نسخہ موجود ہے اسے ۸۵۶ھ میں بخارا میں نقل کیا گیا۔ یہ بڑا نایاب اور قابل دید نسخہ ہے۔

۸۔ مولانا بحر العلوم فرنگی محلی لکھنوی کی مشہور کتاب "شرح مسلم الثبوت" کی دو جلدیں بھی یہاں موجود ہیں۔ مولانا بحر العلوم کے داماد مولوی علاء الدین نے مولانا کے پاس ان نسخوں کا درس لیا۔ مولانا نے اس کتاب پر کئی نوٹ تحریر کئے ہیں۔ اور مولوی علاء الدین نے شرح لکھی ہے۔ اس کتاب پر مولانا کے نواسے مولوی جمال الدین کی مہر ہے اور فارسی میں ان کا لکھا ہوا ایک نوٹ بھی ہے کہ "یہ کتاب مجھے اپنے والد حضرت ملک العلماء مولانا علاء الدین سے حاصل ہوئی"۔ پھر مفتی محمد سعید خاں صاحب نے خریدا

اور اپنے خریدنے کا تذکرہ بھی اس کتاب پر تحریر کیا ہے۔

۹۔ گلستان سعدی۔ شیرازی کا بہترین، نایاب، قدیم، بیش بہا اور مصور مجلد نسخہ اس کتب خانہ کی زینت ہے۔ اس میں طلائی و زرین کام کیا گیا ہے۔ یہ فنِ خطاطی اور گل کاری کا قیمتی اور انتہائی خوبصورت نمونہ ہے۔ اسے ۹۸۶ھ میں ابن حسین شریف الحسینی المشہدی نے نقل کیا۔ یہ نسخہ جہاں ایرانی مصوری کا بہترین نمونہ ہے وہیں خطاطی کا بے نظیر شاہکار بھی ہے۔ یہ نسخہ نستعلیق خط میں ہے جو اپنی خوبصورتی اور نفاست میں تمام خطوں پر سبقت رکھتا ہے۔ اس کتاب میں ۱۴۰ ورق ۲۸۰ صفحے ہیں۔ بیچ بیچ اور تصویروں کے سامنے کئی سادے صفحے بھی ہیں۔ ۶ خوشنما تصاویر ہیں۔ جن کا تعلق گلستان کی مختلف ہدایات سے ہے یہ تصاویر جہاں آرٹسٹ عبداللہ شیرازی کی مہارت کو ظاہر کرتی ہیں وہیں یہ فنِ مصوری کے انتہائی شاندار نمونے ہیں۔ فل سائز کے یہ تصاویر بڑے نفیس، نہایت اعلیٰ ڈیزائن اور عمدہ رنگوں میں ہیں۔ تصاویر کے لئے جو کاغذ استعمال کیا گیا ہے وہ دبیز سمرقندی اور بھورا چمکدار قسم کا ہے۔ اس گلستاں کی کئی تصاویر شائع ہو چکی ہیں۔ اس گلستاں کے نسخے پر پروفیسر ڈاکٹر نظام الدین کے انگریزی مضمون "ANIQUE. ILLUSTRATED MANUSCRIPT OF SADIS' GULISTAN" کے ساتھ بھی کئی تصاویر شائع ہوئی ہیں۔

اس گلستاں کے ہر ورق کا پہلا حرف مطلا ہے۔ اور ہر حاشیہ پر مختلف قسم کے رنگوں کے گل بوٹے اور نقش و نگار ہیں جن پر طلاکاری کی گئی ہے۔ صفحوں کے کنارے اور حاشیے بڑی مناسبت رکھتے ہیں۔ گلستاں کا یہ قدیم نسخہ کہا جاتا ہے ۹۸۶ھ ۱۵۷۸ء میں ایران کے صفوی خاندان کے شہزادہ ابراہیم مرزا کے لئے تیار کیا گیا تھا جو علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کا بڑا قدردان تھا۔

اس گلستاں کی تیاری اور پینٹنگ میں آٹھ سال کا عرصہ لگا یعنی ۹۷۸ھ ۱۵۷۰ء تا

۹۸۶ھ، ۱۵۷۸ء کے دوران یہ کتاب اس کی جلد بینڈنگ اور اس کی تصویریں تیار کی گئیں یہ گلستاں سولہویں صدی عیسوی کے شیرازہ اسکول کا شاہ کار ہے اس نسخہ کے تعلق سے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے کتب خانہ کی کتاب الرائے میں تحریر فرمایا ہے:

"پرانی قلمی کتابوں کا نہایت ہی گراں قدر مجموعہ یہاں ہے، حدیث، تفسیر اور رجال میں خصوصیت سے بڑے بے بہا نوادر یہاں محفوظ ہیں۔ خطاطی اور جلد سازی کے بھی بہت اچھے نمونے ہیں۔ گلستاں کا ایک نسخہ خط، جلد، آرائش، ہر اعتبار سے بے مثل کہا جا سکتا ہے۔"

اس موقع پر اس کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ کئی سال پیشتر گلستاں کے اس نسخے کو ایک صاحب نے سرقہ کر کے بمبئی کے ایک سرمایہ دار مسٹر کاؤس جی جہانگیر کے ہاتھ پانچ ہزار پانچ سو میں فروخت کر دیا تھا۔ آخر کئی سال بعد کتب خانہ کو اس کی ملکیت گلستاں واپس ہوئی۔

اس گلستاں کے نسخے پر راقم الحروف کا ایک تفصیلی مضمون روزنامہ ملاپ کے ادبی ایڈیشن مورخہ ۴ دسمبر ۱۹۶۶ء اور ۱۱ دسمبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔

۱۰۔ بدرالدین ہلالی کی مشہور فارسی مثنوی "صفات العاشقین" اس کتب خانہ میں موجود ہے (۴۶) صفحات کی اس کتاب کا سائز "۶×"۱۰ ہے۔ اس کتاب میں نقش و نگار گلکاری اور بہت سا زرین کام کیا گیا ہے۔ سوائے پہلے صفحے کے ہر صفحہ پر دس سطریں ہیں۔ یہ نسخہ بھی خوب صورت نستعلیق خط میں ہے۔ اس نسخہ میں تین بڑی نفیس تصویریں بھی ہیں جن میں ایک سلطان محمود غزنوی کی فوٹو (شبیہہ) بھی شامل ہے جس میں وہ اپنے غلام ایاز کے آگے اپنا سر جھکائے ہوئے ہیں۔ اس منظر کا تعلق مثنوی کے ایک شعر سے ہے۔

صفات العاشقین ۹۸۶ھ میں لکھی گئی۔ لیکن کس نے نقل کیا اس کا پتہ نہیں چلتا آخری صفحہ پر لکھا ہے اکبر اعظم کے عہد حکومت کے ۲۵ ویں سال میں یعنی ۹۸۰ھ (۱۹۴۵ء) میں

روپیہ کے معاوضہ سے یہ نسخہ مرزا فرخ بیگ کے ذریعہ خرید اگیا۔

غرض یہ تھا کتب خانہ سعیدیہ کے چند نایاب مخطوطات کا مختصر سا تعارف۔ ورنہ یہاں ہزاروں نایاب، بہترین، بیش بہا، قدیم ترین مخطوطات موجود ہیں جن کا مختصر سا تذکرہ کرنے کے لئے بھی ایک تفصیلی کتاب درکار ہے۔

اس کتب خانہ سعیدیہ سے اکثر مشہور و معروف علماء و مشاہیر نے استفادہ اور معائنہ کیا ہے۔ جن میں قابل ذکر نواب عماد الملک، نواب محسن الملک، نواب صدر یار جنگ نواب اعظم یار جنگ، مولوی خدا بخش خاں، شمس العلماء سید علی بلگرامی، شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر تارا چند مشہور مورخ سر جادو ناتھ سرکار، پروفیسر ہمایوں کبیر۔ پروفیسر آصف فیضی سابق سفیر ہند، نواب علی یاور جنگ گورنر مہاراشٹر وغیرہ کے علاوہ مصر، ترکی، ایران، اسرائیل، انگلستان، فرانس، ہالینڈ اور جرمن کے مستشرقین نے بھی اس کتب خانہ سے استفادہ کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اس کتب خانہ کا تفصیلی معائنہ کیا اور معائنہ کے اختتام پر فرمایا "میں بہت خوش ہوا۔"

مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند نے تحریر فرمایا ہے:

"میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی علوم کی قلمی کتابوں کے اعتبار سے یہ کتب خانہ ہندوستان کے بہترین ذخیروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ جس خاندان نے اس کو ایک عالم کے لئے کارآمد بنانے کا ذمہ لے رکھا ہے وہ قومی شکریہ کا مستحق ہے۔"

غرض دکن و ہندوستان کے علماء ہی نہیں بلکہ عرب لیگ کا وفد، ترکی و ایران کے پروفیسر، بلاد یورپ و امریکہ کے مستشرقین شوق و تجسس علم میں یہاں خود آتے ہیں۔ یا مستند کتابوں کی نقولیں بذریعہ فوٹو اسٹاٹ کاپی طلب کرتے ہیں۔ ان علماء و طالبان علم کو اپنے اپنے تحقیق علمی میں کافی مستند مطلوبہ مواد اس کتب خانہ سے حاصل

ہو جاتا ہے۔ جو شیخ الاسلام الحاج مفتی محمدؒ سعید خاں صاحب مرحوم کا گران قدر علمی ذخیرہ ہے اور زبانِ حال سے ان کی علمیت کا شاہد ہے۔!!

نوٹ:۔ اس مضمون کی تیاری میں حسب ذیل کتابوں اور مقالوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔ کتب خانہ سعیدیہ (انگریزی) مولوی برہان الدین حسین

۲۔ مفتی محمد سعید خاں صاحب کے خاندان کی علمی خدمت گزاری۔

ڈاکٹر مولوی محمد غوث صاحب۔

۳۔ مشرقی و مغربی کتب خانوں میں اسلامی شعبے

پروفیسر ڈاکٹر محمدؐ حمید اللہ صاحب

۴۔ خانوادہ قاضی بدر الدولہ — پروفیسر محمد یوسف کوکن صاحب عمری

۵۔ تاریخ النوائط — نواب عزیز جنگ ولا مرحوم

۶۔ کیٹلاگ (جلد اول) کتب خانہ سعیدیہ (انگریزی)

ڈاکٹر مولوی محمد غوث صاحب

A UNIQUE ILLUSTRATED MANUSCRIPT OF SADIS GULISTAN

پروفیسر ڈاکٹر محمدؐ نظام الدین

۸۔ گلستان سعیدی کا ایک قدیم اور نایاب نسخہ۔

(انتیسویں قسط)[29]

ہندو تہذیب اور مسلمان

از ڈاکٹر محمد عمر صاحب اُستاذِ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

حضرت امیر خسرو نے ہندی میں ایسے گیت لکھے تھے جو جھولا جھولنے کے موقع پر عورتیں گایا کرتی تھیں۔ اور ہمارے زمانے میں بھی دیہاتوں میں ساون کے مہینے میں گاتے جاتے ہیں[1]۔ انندرام مخلص نے جھولے کی ساخت کی وضاحت اِن سطور میں کی ہے۔

"از رسمی کہ اطفال یا بعض زناں صاحب جمال بیشتر در ایام برشگال با شاخ درختے یا بسرِ چوب مستحکمے کہ بشکل دوازدہ تصب نمایند، آویزند وگاہ دو کس وگاہ یک کس برآں نشستند و یک کس ریسمان را بدست جنبشی دہد و شکل حرکتش مثل اجیلان ست و باقسام تکلف می شود و ریسمانش را از ابریشم و چوبہا را رنگین و نقاشی سازند ہندی زناں جھولہ نامند و از ہمیں عالم بنوعی دگراز (؟) خوب می سازند و آں را اکثر در مجمع عرسہا و میلہا در بادار بر پا کنند"[2]

میلے ٹھیلوں اور عرسوں کے میلے کے موقعوں پر جھولے ڈالے جاتے تھے اور بچے جوان جھولا جھول کر تفریح کرتے تھے۔

دہلی کے قرب و جوار میں سیر و تفریح کے کئی مقامات تھے۔ دہلی دراصل باغوں کا شہر تھا

---

[1] امیر خسرو کا یہ گیت عام طور پر گایا جاتا ہے۔
جو پیا آون کہہ گئے، اجہوں نہ آئے سوامی ہو، اے ہو جو پیا آون کہہ گئے
آون آون کہہ گئے، آئے نہ بارہ ماس۔ اے ہو جو پیا آون کہہ گئے۔
حیاتِ خسرو۔ مؤلفہ محمد سعید احمد مارہروی (مطبع اکبری، آگرہ ۱۹۰۹ء/۱۳۲۷ھ) ص ۷۴ نیز آبِ حیات ص ۸۳-۸۴

[2] مراۃ الاصطلاح۔ ص ۱۸۸ الف۔

کیوں کہ یہاں ہزاروں کی تعداد میں باغات تھے۔ علاوہ ازیں جمنا کے کنارے اور نصیر الدین چراغ دہلی کے جھرنے بھی تھے۔ جہاں لوگ سیر کے لئے جایا کرتے تھے۔ انشاء اللہ خاں انشار نے قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ کے قریب کی املیوں یا کسی آبِ رواں کے کنارے کے درختوں پر پڑے جھولوں کا بڑا دلکش منظر پیش کیا ہے۔ ان موقعوں پر پری زادوں کا مجمع لطف کو دو بالا کر دیتا تھا۔ ایک جگہ انشار نے لکھا ہے۔

"کسی آبِ رواں کے کنارے درخت کی ڈال میں جھولا جو پڑا ہوا ہے تو وہاں بھی دو چار پری زاد کھڑے ہیں۔"[۱]

میر حسن دہلوی اور دیگر شعرار نے ساون میں جھولے کی تعریف میں شعر کہے ہیں۔

عجب ساون میں گڑیوں کا مزا ہے ہنڈولا جس طرف دیکھو گڑا ہے[۲]

مصحفی کا شعر ملاحظہ ہو۔ جس میں اُس نے دورِ فلک کی گردش کو جھولے کی گردش سے تشبیہہ دی ہے۔

دورِ فلک میں بس ہے ہنڈولے کی چال ڈھال کس دن زمانہ باز رہا انقلاب سے[۳]

بیل گاڑیوں کی دوڑ کے مقابلے چوں کہ ہندوستان ایک زرعی ملک رہا ہے اس وجہ سے اس ملک میں بیل کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ابو الفضل کا بیان ہے

"ہند میں کھیتی باڑی کا کام بھی اسی جانور کی اعانت و جفا کشی پر چلتا ہے۔ اور مایحتاج زندگی کی فراہمی اسی کی محنت کا ثمرہ ہے۔ یہ جانور بار برداری اور ہل چلانے میں بے حد قوی طاقت ور ہے۔"[۵]

---

[۱] دریائے لطافت (ا۔ ت) ص ۱۰۰

[۲] مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص ۱۶۱

[۳] دیوان ہفتم (ق۔ پٹنہ) ص ۱۷۵ اب

Heber = Navrafrvie of Jomey 1, P. 78.

[۵] برائے تفصیل۔ آئین اکبری (ا۔ ت) ج ۱۔ ح ۱/ ص ۲۸۰

ویسے تو گائے بیل ہندوستان کے ہر حصے میں پائے جاتے تھے لیکن گجرات کے بیل بہترین خیال کئے جاتے تھے۔ گجراتی بیلوں کی ایک جوڑ کی قیمت سو مہر تک ہوتی تھی۔ یہ بیل بڑے تیز رفتار ہوتے تھے اور چوبیس گھنٹے میں اسّی کوس کی مسافت طے کی جا سکتی تھی۔ وہ اپنی تیز رفتاری میں گھوڑوں پر بھی سبقت لے جاتے تھے۔[1]

بار برداری کے لئے تو عوام و خواص دونوں ہی بیل گاڑیوں کا استعمال کرتے تھے لیکن بادشاہوں، امراء اور اہلِ ثروت لوگوں کے ہاں بیلوں کی ایسی بھی جوڑیاں ہوتی تھیں جن کو رتھوں اور تانگوں میں جوت کر دوڑ کے مقابلے کئے جاتے تھے۔[الف] موجودہ زمانے میں بھی ہندوستان کے دیہاتوں میں یہ رواج پایا جاتا ہے۔ میلے ٹھیلوں کے موقعوں پر لوگ بیل گاڑیوں پر دور دراز کا سفر طے کرتے ہیں اور راستے میں دوڑ کے مقابلے ہوتے جاتے ہیں۔

عہد مغلیہ میں رتھ[2] اور بہل[3] کی سواری عام تھی۔ شاہان، امراء اور عوام ان سواریوں میں سیر و تفریح کے لئے جایا کرتے تھے۔

اٹھارہویں صدی کے عیش پرست بادشاہ، امراء اور رؤسا رتھوں اور بہلیوں کی ہی سواری پسند کرتے تھے۔ جہاندار شاہ اور محمد شاہ کو رتھ کی سواری سے بڑی دل چسپی تھی۔

دیگر شعبوں کی طرح گاؤ خانہ کا بھی ایک الگ شعبہ تھا۔[4] نادر شاہ کے حملے کے بعد اس شعبے کی زبوں حالی کا ذکر معاصر تواریخ میں ملتا ہے۔

---

[1] آئینِ اکبری ج ا ح ا ص ۲۸۰-۲۸۶، آنند رام مخلص نے گجراتی بیلوں کی ایک جوڑ ۴۰۰ روپے کی خریدی تھی سفرنامہ مخلص ص ۹، خلاصۃ التواریخ۔ ص ۱۷۔

[2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ ہفت تماشا (ا۔ت) ۱۹-۲۰، گذشتہ لکھنؤ۔ ص ۴۰۱

[3] بہل دو قسم کی ہوتی تھیں۔ چھتری دار، جس کے اوپر چار لکڑیاں یا اس سے زیادہ باندھ کر چھتر کو ان پر آراستہ کرتے ہیں اس قسم کی بہل کو گھر بہل کہتے تھے۔ اس کے علاوہ سادہ بہل ہوتی تھی۔ آئینِ اکبری (ا۔ت) ج ۱، ح ۱، ص ۲۸۴، گذشتہ لکھنؤ۔ ص ۴۰۱-۴۰۳

[4] آئینِ اکبری (ا۔ت) ج ۱، ح ۱، ص ۲۸۰-۲۸۱

[الف] ویدک عہد میں رتھوں کی دوڑ اکثر ہوتی تھی۔ اور اس میں بڑا لطف آتا تھا۔ ہندوستان کا قدیم تمدن (از بینی پرشاد) مترجم۔ مولوی اصغر حسین (الہ آباد۔ ۱۹۵۰) ص ۶۴

دریاؤں میں چراغاں بعض تہواروں یا دوسرے کسی خاص موقع پر ندیوں اور دریاؤں میں چراغ جلا کر چھوڑے جاتے تھے اور وہ منظر باعث سیر و تفریح ہوتا تھا۔ گنگا ندی میں چراغاں کا ذکر انند رام مخلص اس طرح کرتا ہے

"دریں اثنا چراغے چند از کاغذ سرخ بر روی آب از پیش خیمہ گذشت۔ ظاہراً شخصی از کاغذ گلگوں بقاعدہ کہ نزدیک جوانان بازیچہ دوست نہند مقرر است چراغ ترتیب دادہ و فتیلہ در آں افروختہ یکی بعد دیگری بدریا می گذاشت و ایں بازیچہ را نوعی از صواب می پنداشت[1]"

اپنی سیاحت کے زمانے میں ہوبج جب مرشد آباد پہنچا تو وہ مسلمانوں کے کسی تہوار کا دن تھا۔ اس کا بیان ہے کہ ندی میں بے شمار چراغوں کو تیرتے دیکھ کر اس کا دل بہت خوش ہوا تھا۔[2]

جہاندار شاہ بن بہادر شاہ اول کو چراغاں سے بڑی دل چسپی تھی۔ اس کے دورِ حکومت میں بڑے پیمانے پر چراغاں ہوتے اور دہلی شہر کی تمام عمارتوں اور قلعے میں چراغ جلائے جاتے تھے۔ بعض مرتبہ یہاں تک نوبت پہنچ جاتی تھی کہ تیل نایاب ہو جاتا اور گھی کے چراغ جلائے جاتے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ تیل و گھی ملنا مشکل ہو گیا۔[3]

---

[1] سفرنامہ انند رام مخلص۔ ص ۸۳

[2] TRAVELS IN INDIA : P.P. 35-36 نیز سیر المتاخرین (انگریزی ترجمہ) ۱۱۱/ ص ۱۴۲-۱۴۴

[3] لیٹر مغلس ج ۱/ ص ۱۹۲۔ محمد شاہ کے حکم سے دریائے جمنا کے کنارے پر چراغاں ہوا تھا۔ در سنہ ۱۱۵۶ھ محمد شاہ بادشاہ نجم الدولہ بہادر و فیروز جنگ بخشی الممالک بہادر و قمر الدین خان اعتماد الدولہ وزیر الممالک بہادر وزیر خان عمدۃ الملک بہادر و دیگر امرایانِ عظام را حکم فرمود کہ زیر جھروکہ قلعہ روشنی نمایند۔ چناں چہ امرایان بموجب فرمودہ بادشاہ زیر قلعہ بطرف دریای روشنی کنانند و مقرر شد کہ تا سہ روز روشنی شود۔ ص ۱۰۰ ب، ۱۱۱ ب چہار گلزار شجاعی ص ۱۰۰ ب، ۱۰۱ الف، ۱۴۱ ب، رقعات مرزا قتیل۔ ۲۸

دیگر ہندوستانی کھیل انشاء اللہ خاں انشاء نے کچھ ایسے کھیلوں کا ذکر کیا ہے جو شہر دہلی کے لئے مخصوص تھے[1]۔ اِن کھیلوں کے ناموں سے یہ بات واضح ہے کہ ان کا نکاس ہندوستان ہی کی سرزمین تھی۔ مثلاً چنڈول گدا کر بول، کانٹھ کتول بانسلی بھنبیری میرا نانو، کالی بیلی ڈلو ڈلو (سیدھے خط کو کہتے ہیں جو قلم یا انگلی وغیرہ سے دیوار پر کھینچیں)، گھور کھنڈے چو ہے لنڈے، مونگ چنا ڈگڈوتی ڈو؛ (جو آدمی بچوں سے کھیلتے ہیں) شیر بکری یا باگ بکری، ایمرن، کبڈی، وزیر بادشاہ، آنکھ مچولی کڑوا تیل بلی پا دے دہی کھلیل[2]۔ چھائیں مائیں گو گھمائیں راجہ کے گھر بیٹا ہوا؛ دوڑے آئیو کوئی ایسا بھی دانا ہو چڑیا کے بند چھڑا دے؛ مونگ چنا ڈگڈوتی ڈو؛ میری آڑو کیوں آڑے؛ لوڑھی ٹیسورا تے؛ یہ سب کھیلوں کے نام ہیں مگر ان کی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔ ان میں سے لوڑھی (لوری) کا عام رواج تھا اور دہلی سے کابل تک مروج تھا۔ اس کی تفصیل یوں ہے۔ دیوالی کے تہوار سے کچھ دنوں پہلے بچے بعض جوانوں کو ساتھ لے کر محلہ محلہ پھرتے تھے اور ہر گھر سے کچھ نقد یا ایندھن وصول کرتے تھے۔ اور مقررہ رات کو اس ایندھن کا ڈھیر بنا کر جلا دیتے تھے۔ جو کچھ نقد وصول ہوتا تھا اس کی مٹھائی خرید کر آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ حالانکہ یہ رسم ہندوؤں کی تھی لیکن مسلمان بچے بھی اس کھیل میں شامل ہوتے تھے۔

ٹیسو راتے کا مطلب یہ تھا کہ دسہرہ کے دنوں کے قریب لڑکے مٹی کی ایک مورت بناتے تھے جو تین لکڑیوں پر ٹکی ہوتی تھی۔ اُس میں چراغ رکھنے کی جگہ بھی ہوتی تھی۔ اُس کو وہ گھر گھر لئے پھرتے

---

[1] دریائے لطافت (ا-ت) ص ۲۱-۲۲

[2] عام طور پر بچے رات کے وقت آنکھ مچولی کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ دریائے لطافت (ا-ت) ص ۲۲

حسرت لکھنوی نے آنکھ مچولی کی یوں وضاحت کی ہے

اگر شوق تجھ آنکھ مچولی سے ہے — اب مجھ کو بھی کھیلنا تجھ اچپل سے ہے

کر بند یہ میری آنکھ اور تو چھپ جا — میں ڈھونڈوں تجھے یہ کھیل ادل سے ہے

دیوان حسرت۔ ص ۱۶۹ الف

تھے۔ اور پانچ چھ دن میں جو نقدی وصول ہوتی تھی اس کی مٹھائی لے کر آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔ لڑکیاں ٹیسو رائے کے بدلے جھنجھری یا جھنجھنیا بناتی تھی۔ یہ کھیل پورب کے تمام شہروں اور قصبوں میں مروج تھا۔[1]

دوسرے کھیل مثلاً کبڈی، باگ بکری، وزیر بادشاہ، جوان آدمی بھی کھیلتے تھے۔ اور جگہ جگہ ان کا رواج تھا۔ باقی کھیل بچوں سے مخصوص تھے۔

تی سرسیتا پھول پان بیجیا، یہ کلمہ گلی ڈنڈا کھیلنے کے موقع پر کہا جاتا تھا۔ کھیل میں ایک خاص موقع پر جب کھیلنے والے کا بانس ٹوٹ جاتا تھا تو ڈنڈا اُس کے ہاتھ میں مارا جاتا تھا جسے چمیٹی کہتے تھے۔[2] پنٹر بھی ایک کھیل کا نام تھا۔[3]

گڑیا کا کھیل قدیم زمانے سے لڑکیوں میں گڑیا اور گڈے کے کھیل کا رواج چلا آ رہا ہے اور لڑکیاں بڑی شان و شوکت سے گڑیا گڈے کا بیاہ بھی رچاتی تھیں۔ میر حسن دہلوی نے اس کھیل کا ذکر کیا ہے۔

اک محلے میں تھیں کتنی لڑکیاں — کھیل میں باہم تھیں وہ سب ہمجولیاں
گڑیاں کھیلا کرتی تھیں آپس میں وہ — تھیں بہم اس بات پر ہم قسمیں وہ[4]

بنگال کے ادب میں ڈھو پھیری نام کے ایک کھیل کا ذکر ملتا ہے۔ یہ دیہاتی ہاکی کا کھیل تھا۔ ہمارے زمانے میں بھی دیہاتی بچے لکڑی کی ہاکی بنا کر کھیلتے ہیں۔ لکڑی کا ایک ایسا ٹکڑا کاٹا جاتا ہے جس کا ایک سر نصف دائرہ کے مانند ہوتا ہے۔ گیند کپڑے کی بنائی جاتی ہے۔ اور اس لکڑی سے موجودہ ہاکی کے کھیل کی طرح کھیلتے تھے۔[5]

ایک دوسرا کھیل گیرو کہلاتا تھا۔ یہ کھیل کئی لڑکے بیک وقت کھیلتے تھے اور مخالف پارٹی پر گیند مارتے تھے جو گیند کو اپنی گرفت میں لیتا تھا۔[6] (باقی)

---

[1] دریائے لطافت (اردو ترجمہ) ص ۱۳۱-۱۳۲ [2] ہفت تماشا ص ۷۷-۷۸ [3] ایضاً ص ۱۳۱ [4] ایضاً (فارسی) ص ۷۷ [5] مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی (لکھنؤ ۱۹۴۵ء) ص ۱۶۷-۱۶۹

[5] A few aspects of the social history of Bengal. (J.D.L. 1922) P. 215. [6] ایضاً ص ۲۱۶

ادبیات

غزل

از جناب فضا ابن فیض صاحب

شیوۂ جہل کو بہتر جانا
ہم نے اب علم کا محور جانا

وقت کے شعلوں سے ہنستے گذرے
ہم کو دنیا میں پیمبر جانا

یہ بھی تنہائی کی اک منزل ہے
ہم نے اس شہر میں رہ کر جانا

یہ تعارف بھی بہت ہے اس نے
راستے کا مجھے پتھر جانا

تجھ کو اے زہرِ تغافل نظری
دل نے تریاق سے بڑھ کر جانا

موج سے دور بھی ڈوبے کچھ لوگ
کس نے ساحل کو فروتر جانا

آج اے کیفیتِ خشک لبی
میرا ساغر بھی ذرا بھر جانا

یوں بہار آئی کہ ہم نے یارو!
پھول کو زخم کا پیکر جانا

کاش انسان نے سیکھا ہوتا
عقل کی سطح سے اوپر جانا

مجھ کو ٹھکرا کے گذرنے والو!
تم نے ہیرے کو بھی پتھر جانا

سب کو آتا نہیں صاحب نظرو!
حرف سادہ کو غزل کر جانا

یہ بھی چبھ جاتے ہیں کانٹوں کی طرح
بھیڑ سے پھولوں کی بچ کر جانا

ہر سخن جس کی ہے انمول فضا
سب نے اس شخص کو کمتر جانا

تبصرے

مقدمۃ لامع الدراری علی جامع البخاری

از شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی ۔ تقطیع کلاں ۔ ضخامت ۴۰۸ صفحات ۔ ٹائپ جلی اور روشن، قیمت درج نہیں ۔ پتہ :۔ تجارتی مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

امام بخاری کی الجامع الصحیح کو اللہ تعالیٰ نے جو غیر معمولی مقبولیت اور پذیرائی عطا فرمائی ہے وہ اس کے اصح کتاب بعد کتاب اللہ ہونے کی وجہ سے امر طبعی و یقینی ہے ۔ چنانچہ الصحیح کی شرح کے علاوہ اس کے رواۃ ۔ اسانید و طرق ۔ تراجم ابواب ۔ اس کی متکلم فیہا روایات ۔ اور خود امام عالی مقام کے حالات و سوانح اور علمی و اخلاقی اوصاف و کمالات ۔ یہ اور ان کے علاوہ بحث و تحقیق اور تشریح و توضیح کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر سلف اور خلف کے کسی عہد میں کتابوں پر کتابیں اور رسالوں پر رسالے نہ لکھے گئے ہوں چنانچہ حضرت شیخ الحدیث نے بھی سالہائے دراز کی محنت و مشغولیت کے بعد صحیح بخاری کی ایک جامع شرح کئی جلدوں میں شستہ و رفتہ عربی زبان میں تحریر فرمائی ۔ زیر تبصرہ کتاب اس شرح کا نہایت وسیع ۔ محققانہ اور جامع مقدمہ ہے ۔ جناب موصوف کی تالیفات و تصنیفات کی ایک نمایاں خصوصیت استیعاب اور استقصاء ہے ۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی جس کے ماخذ کی فہرست ایک سو اکیس کتابوں پر مشتمل ہے ، آپ نے بعض ایسے کم عمر مصنفوں کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے جن کے لئے آپ سے بلند سرمایۂ فخر و مباہات ہو سکتا ہے ۔ اس خصوصیت کے باعث امام بخاری کی ذات اور ان کی صحیح سے متعلق بحث و تحقیق کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر اس کتاب میں نہایت سیر حاصل اور جامع گفتگو نہ کی گئی ہو ۔ اس سلسلہ میں تراجم ابواب بخاری کے لئے جن ستر

اصولوں کو بیان کیا گیا ہے وہ نہایت عجیب و غریب اور علم حدیث کے طلباء اور اساتذہ کے لئے سرخ اونٹوں سے زیادہ قیمتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی کتاب میں جو تشنگی محسوس ہوتی اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔

(۱) پنجاب کے مولوی عبدالعزیز کی کتاب نبراس الساری بھی بہت اہم کتاب ہے۔ اس کو بھی ماخذ میں شامل ہونا چاہئے تھا۔

(۲) عہد حاضر کے مشہور فاضل ناصر الدین البانی نے اپنی بعض کتابوں اور مقالات میں بعض احادیث بخاری پر نہایت محققانہ کلام کیا ہے وہ بھی غالباً پیش نظر نہیں رہا۔

(۳) منکرین حدیث مثلاً عبداللہ العادی اور تمنا وغیرہ نے بخاری کی جن روایات پر کلام کیا ہے بہتر ہوتا اگر فصل ثانی کے گیارہویں فائدہ کے ماتحت ان پر بھی گفتگو ہو جاتی۔ ان کے علاوہ اگر حدیث کی اہمیت۔ حجیت اور اس کی تدوین اور جمع و ترتیب کی تاریخ پر بھی ایک مستقل باب ہوتا تو افادیت میں اضافہ ہو جاتا۔ اس مقدمہ کا پیش لفظ مولانا ابوالحسن علی الندوی نے لکھا ہے جو بجائے خود پڑھنے کے لائق ہے۔

تفسیر ماجدی جلد دوم | از مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی، تقطیع کلاں، ضخامت ۴۷۰ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، قیمت -/15 - پتہ :- صدق بک ایجنسی - کچہری روڈ - لکھنؤ۔

یہ تفسیر ماجدی کی طبع جدید کی دوسری جلد ہے جو سورۃ النساء سے سورۃ التوبہ تک کی تفسیر پر مشتمل ہے طبع جدید کی پہلی جلد پر تبصرہ پہلے شائع ہو چکا ہے۔ جو انداز اُس کا تھا وہی اس کا ہے۔ یوں تو عام تفسیروں میں جو کچھ ہوتا ہے یعنی الفاظ کی تحقیق، ان کے معانی، آیت کا ترجمہ۔ اس کا مطلب، اس سے جو احکام مستنبط ہوتے ہیں ان کا بیان وجہ استنباط کے ساتھ، آیت کا سبب نزول، پھر اگر اس میں کوئی حکیمانہ یا بلیغ نکتہ ہے تو وہ بھی ـــ وہ سب اس میں موجود ہے اور اس احتیاط کے ساتھ کہ اگر کہیں یہ لکھا ہے کہ

"یہاں کان" ماضی کے معنی میں نہیں بلکہ استقرار و دوام کے معنی میں ہے، تو اس کا بھی باقاعدہ حوالہ موجود ہے مزید برآں اس کی خصوصیت یہ ہے کہ چونکہ فاضل مفسر عہد حاضر کے ذہن و مزاج اور اس کے مسائل وافکار سے واقف ہیں اس لئے جہاں کہیں اس کا موقع ہوتا ہے اشہب قلم خوب جولانی دکھاتا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں جگہ جگہ توراۃ و انجیل اور ان کے احکام کا تذکرہ ہے۔ اور چونکہ مولانا نے ان کتب مقدسہ کا مطالعہ بڑے غور و خوض اور وسعت کے ساتھ کیا ہے اس بنا پر جا بجا، ان کتابوں کے حوالے اور ان کی عبارتیں ملتی ہیں پھر زبان اور انداز بیان کی سلاست اور شگفتگی ان سب پر مستزاد۔ ان وجوہ سے جو حضرات تفسیروں میں فقیہانہ اقوال اور ان کے دلائل و براہین کی بھرمار یا دوراز کار کلامی مباحث کے عادی ہیں ان کے لئے ممکن ہے یہ تفسیر کچھ زیادہ دلچسپی کا باعث نہ ہو، لیکن عصر جدید کے تعلیم یافتہ اور نوجوان مسلمان جن کے لئے افکار نو پریشانی خاطر اور پراگندگی ذہن کا باعث بنے ہوتے ہیں ان کے لئے اس میں بہت کچھ سامان تسکین و راحت ملے گا۔

الطریق الی المدینۃ از مولانا سید ابوالحسن علی الندوی، تقطیع خورد، ضخامت ۸۰ صفحات، ٹائپ عمدہ، قیمت -/۴ پتہ:۔ مکتبۂ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

یہ مولانا کے چند مضامین کا مجموعہ ہے جو اب دوبارہ مزید اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے چونکہ اول تو نفس مضمون اور پھر مولانا کا فصیح و بلیغ اور ولولہ انگیز طرز بیان ان دونوں کا مجموعی اثر یہ ہوتا ہے کہ محبت و عشق کی چنگاریاں جو ہر مسلمان کے نہاں خانۂ قلب و دماغ میں دبی ہوئی ہیں اچانک بھڑک اٹھتی اور روح میں گرمی پیدا کر دیتی ہیں اسی بنا پر کتاب کا نام الطریق المدینۃ رکھا گیا ہے۔ کتاب کی خوبی کا اندازہ اس کے مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے۔

ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کی اصلاح (انگریزی)، از پروفیسر آصف علی اے فیضی، تقطیع خورد ضخامت ۴۰ صفحات، ٹائپ جلی اور روشن۔ قیمت ۲/-۔ پتہ ٹیچکنا پبلیکیشن نمبر ۲۲ توشہر بہروچہ روڈ بمبئی - 7

پروفیسر فیضی ہمارے ملک کے مشہور فاضل اور ماہرِ قانونِ اسلامیات ہیں۔ آپ کی بعض آراء سے کسی کو خواہ کیسا ہی اختلاف ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ موصوف کی تحریریں بہت پُر از معلومات اور فکر انگیز ہوتی ہیں اس مختصر رسالہ میں آپ نے پہلے اسلامی قانون کے مأخذ اور اسکی تدوین کی تاریخ بیان کر کے ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کی تاریخی سرگذشت بیان کی ہے۔ اور پھر اس پر بحث کی ہے کہ مسلم پرسنل لا ایکٹ نمبر ۲۶ بابت ۱۹۳۷ء کیا ہے؟ اس میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ اور از روئے شریعت وہ ممکن ہے یا نہیں؟ اس کے بعد انہوں نے تجویز کی ہے کہ مذکورہ بالا ایکٹ کی اصلاح یا تبدیلی ایک طولِ عمل ہے اس بنا پر فوری طور پر مندرجۂ ذیل دو چیزوں کو قانونی شکل دے دینی چاہیئے۔

(۱) ایک یہ کہ نکاح کے وقت شوہر سے ایک تفویض نامہ (موصوف نے اس کے لئے کابین نامہ کا لفظ استعمال کیا ہے جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں) لکھوا لیا جائے جس میں اس بات کا اقرار ہو کہ شوہر نے اگر امور مندرجہ میں سے کسی امر کی خلاف ورزی کی تو بیوی کو اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا حق ہوگا۔

(۲) دوسرے یہ کہ جہاں تفویض نامہ ہو اور میاں بیوی میں اختلافات پیدا ہوں تو اسکا فیصلہ کرنیکے لئے ایک عدالت اصلاح فیما ذات البین ہو، جو ان معاملات کا تصفیہ کرے: ہماری رائے میں اب مسلمانوں میں تفویض نامہ لکھوانے کا رواج یوں ہی عام ہوتا جارہا ہے۔ اسلئے اس کے لئے باقاعدہ ایکٹ بنوانیکی کیا ضرورت ہے رہی عدالت! تو اگر اس سلسلہ میں ایک قضا یا امارت شرعیہ ایکٹ بنوایا جائے تو زیادہ مفید ہوگا۔ بہرحال رسالہ لائق مطالعہ اور قابلِ غور و فکر ہے

بھول جائیے گرمی
یاد رکھیے
شربت
روح افزا

Registerd No. D. 688

JUNE

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان سے شائع کیا